فلسفے کی مختصر تاریخ

اکبر لغاری

اکبر لغاری

فلسفے کی مختصر تاریخ

سندھی سے ترجمہ

شاھد حنائی

اکبر لغاری

سندھی سے ترجمہ

شاہد حنائی

مثال پبلشرز

رحیم سینٹر، پریس مارکیٹ، امین پور بازار، فیصل آباد

اشاعت اوّل : 2008ء
دوم : 2013

کتاب : فلسفے کی مختصر تاریخ

مصنف : اکبر لغاری

C-304، بیچ بلیسنگ، نزد بلاول ہاؤس،
بلاک نمبر 2، کلفٹن، کراچی
فون: 021-5376350

ترجمہ : شاہد حنائی

ناشر : محمد عابد

تزئین : عبدالحفیظ

قیمت : 350 روپے

مطبع : B.P.H پرنٹر، لاہور

Falsafe Ki Mukhtsir Tareekh

by

Akbar Laghari

Edition - 2012

اهتمام

مثال پبلشرز رحیم سینٹر پریس مارکیٹ امین پور بازار فیصل آباد
Ph:2615359 -2643841 Mob:0300-6668284
E-mail:misaalpb@gmail.com

شوروم

مثال کتاب گھر، صابریہ پلازہ، گلی نمبر 8، منشی محلہ، امین پور بازار، فیصل آباد

اپنی یہ دوسری کاوش بھی اپنے استادِ محترم

جناب **حیدر علی لغاری**

کے نام کرتا ہوں

ترتیب

- حرف چند (اکبر لغاری) 9
- دیباچہ (حیدر علی لغاری) 11

مغربی فلسفہ۔۔۔مغربی فلسفہ کی ابتداء 18

سقراط 20

افلاطون 26

ارسطو 38

یونان کا سیاسی زوال 51

عقلی دور 60

باروخ اسپائینوزا 64

تجربیت (جان لاک) 72

بشپ جارج برکلے 84

ڈیوڈ ھیوم 87

جین جیکس روسو 95

فرانسیسی روشن خیالی اور والٹیر 107

والٹیر 109

ایمانیوئل کانٹ 118

رومانیت 128

ہیگل 131

کارل مارکس — 143
ارادیت — 152
فریڈرک نٹشے — 160
وجودیت — 167
ژاں پال سارتر — 172
کولن ولسن (نو۔وجودیت) — 176
منطقی اثباتیت (ویانا سرکل) — 178
برٹرنڈ رسل ___ ایک ہمہ جہت فلسفی — 185
مشرقی فلسفہ — 187
ہندوستانی فلسفہ — 196
2۔مہاویرا اور جین مت — 207
3۔مادہ پرستی — 212
4۔گوتم بدھ — 215
مسلمان فیلسوف — 222
الرازی — 229
الفارابی — 231
ابن سینا — 233
اخوان الصفا — 236
مغربی مسلمان فیلسوف — 237
ابن طفیل — 239
ابن رُشد — 241
تصوف — 245

حرفِ چند

فلسفہ بے چین کرتا ہے، بے قرار کرتا ہے، متحیّر کرتا ہے، متحرک کرتا ہے، محرک بنتا ہے، مضطرب کرتا ہے، لیکن مسرت بھی تو بے انتہا بخشتا ہے۔ کائنات کے راز افشا کرنے کے ساتھ ساتھ خودی سے بھی تو پردے اُٹھاتا ہے۔ جمالیات، سیاسیات، اخلاقیات، علمیات، عمرانیات اور جدلیات سے ہمیں فلسفے کے علاوہ اور کون روشناس کراتا ہے؟ لیکن فلسفہ ہے کیا؟ یہ وہ سوال ہے جو ہر پڑھا لکھا انسان پوچھتا ضرور ہے، لیکن اسے خاطر خواہ جواب نہ ملنے کی وجہ سے وہ سمجھتا ہے کہ شاید فلسفہ نہایت مشکل اور خشک مضمون ہے۔ حالاں کہ ایسا نہیں ہے۔ فلسفہ دراصل ایک انتہائی دلچسپ اور سچی خوشی سے ہمکنار کرنے والا مضمون ہے۔ جوں جوں قاری فلسفیوں، نظریوں اور فلسفیانہ تحریکوں کے بارے میں آگاہی حاصل کرتا جاتا ہے، توں توں اس کے اندر کی سرحدیں بھی وسیع ہوتی جاتی ہیں اور وہ کئی قدغن (Taboo) توڑتا جاتا ہے۔ لیکن سب سے بڑا مسئلہ یہ ہے کہ علم کے اس سمندر کو کھنگالنا کہاں سے شروع کیا جائے؟ صحیح راہنمائی نہ ملنے کی وجہ سے قاری، علم کے اس وسیع سمندر کو دیکھ کر دہشت زدہ ہو جاتا ہے اور اس سے بالکل ہی دست بردار ہو جاتا ہے۔

کوئی بھی فلاسفر خلا میں پیدا نہیں ہوتا اور نہ ہی نظریے ہوا میں جنم لیتے ہیں۔ یہ حالات کی پیداوار ہوتے ہیں اور پھر خود حالات کا رُخ موڑنے کا سبب بھی بنتے ہیں۔ اس لیے یہ ضروری ہے کہ ان کو سمجھنے کے لیے ان کے زمان و مکان کے ساتھ ساتھ ان کے سیاق و سباق کو بھی ذہن میں رکھا

جائے۔ لہٰذا میری نظر میں فلسفے کو سمجھنے کے لیے فلسفے کی تاریخ پڑھنا انتہائی ناگزیر ہے۔ یہ کتاب فلسفے کی مختصر تاریخ ہے جسے مَیں نے انتہائی کوششوں سے آسان اور عام فہم کیا ہے۔ اسے پڑھنے کے بعد کوئی بھی یہ شکایت نہیں کرے گا کہ فلسفہ مشکل مضمون ہے۔ ہاں! البتہ یہ شکایت ضرور ہوگی کہ نہایت اختصار سے کام لیا گیا ہے۔

اظہارِ تشکر: جناب حیدر علی لغاری کی راہنمائی اور شفقت پہلے سے بھی زیادہ رہی، جن کے شکریے کے لیے میرا قلم بے حد کمزور ہے، اگر شہناز شورو کی طرف سے ہمت افزائی اور مدد نصیب نہ ہوتی تو میرے لیے یہ کتاب تحریر کرنا ناممکن تھا۔ اس کے علاوہ مواد کی فراہمی کے سلسلے میں جنابِ نبی بخش قاضی، جامی چانڈیو، فیروز میمن اور انعام شیخ نے بھی فراخ دلی سے مدد کی۔ مَیں تمام ساتھیوں کا دل کی گہرائیوں سے مشکور ہوں۔

اکبر لغاری

دیباچہ

عقل و تشکیک — عقل و انکار
عقل و احتجاج — عقل و بغاوت
عقل اور اقرار و اعتبار

عقل کے یہ منفی و مثبت رشتے سدا فلاسفروں کو سرگرداں رکھتے چلے آئے ہیں، اضافی حقیقت سے مطلق حقیقت کی شناخت، جزوی سے کلی صداقت کے عرفان تک رسائی حاصل کرنے کا جذبہ فلسفے کی پوری تاریخ میں ان وارداتوں سے روشناس ہوتا رہا ہے۔

جب انسان سچائی اور دل کشی کی تلاش میں نکلا تو اسے زمان و مکان کی تجریدیت سے سابقہ پڑا۔ اس نے اپنے اس انوکھے و پیچیدہ سفر میں شے سے لاشے، موجود سے لاموجود، کثیف سے لطیف، ہونے اور ہو جانے Becoming/Being کی پُراسرار تبدیلیوں کی جدولیات ڈھونڈ نکالنے کے دعوے کیے اور مرحلہ وار ان جدولیات کی جدلیات میں اضافے کا لامتناہی سلسلہ اس کے اردگرد پھیلتا گیا۔ تبدیلی و تحرک کی مظہریات کی کثرت نے اس کو کسی پوشیدہ مخفی محرک کی طرف متوجہ کیا۔ اس طرح وہ کثرت میں وحدت کی تلاش کے موضوع کے عقلی و وجدانی پہلوؤں کے تضادات اور ان کی باریکیوں پر اپنے عرفان کی صلاحیتیں آزماتا رہا، جس کے نتیجے میں مذاہب، مسالک، نظریات، فکری رویوں اور مکاتیب کے دعووں اور جوابی دعووں کے کافی سارے ذخائر اس کا ورثہ بن گئے۔ اس ساری فکری جنگ میں قلمی جہاد، اس میں موجود حقیقت شناسی کے جنوں کے تابع رہا۔

شناخت، شناسائی اور معرفت، انسان کی نفیس تر اور اعلیٰ تر ازلی خواہش رہی ہے۔ علم و فن کے تا حال تمام شعبے اور اس نسبت سے سارے تجربات اس خواہش کے تسلسل کی پیداوار ہیں۔

جب انسان نے اپنے اس خوب صورت و معنی خیز ہیجان کا ہدف اپنے پُر اسرار وجود کی ماہیت کو بنایا تو اس کے سامنے اور بھی کئی بھید منکشف ہونے کی آس میں قطار در قطار صف بندی کر کے آن کھڑے ہوئے۔ یوں اس نے اپنا معائنہ و ملاحظہ شروع کیا اور نفس اور آفاق/ذات و کائنات کے دو بڑے موضوع اس کے فکر و وجدان کے تختۂ مشق بنے رہے۔ اس جستجو میں اس نے اپنی بھی کئی ناپختگیاں، ناکامیاں اور کمزوریاں کھوج نکالیں۔ ساتھ ہی ساتھ کئی قوتیں اور طاقتیں آپس میں متحرک محسوس و معلوم کیں، جن کو کارکردگی کے لیے بہتر اور خوب تر محاذ فراہم کرنے میں اپنا فرض ادا کیا۔ اس طرح فلسفہ نظریاتی سیڑھیوں سے اُتر کر عملی میدان میں خود کو آزمانے کے لائق ہوا۔

انسان کی انہی قوتوں اور قابلیتوں کی بدولت کئی Myth و مفروضے حقائق بن گئے اور کئی حقیقتیں مفروضوں میں تبدیل ہو گئیں۔ ہم سب کو یہ پتا ہے کہ توہمات و تعصبات کے تانے بانے میں اُلجھے اپنے وجود کو نجات دلانے کی انسانی کوششیں بارآور ہوتی رہی ہیں۔

مگر

انسان جدید دَور تک آتے آتے اور اس کی تازہ ترین علمی، سائنسی اور فنی تخلیقات سے فیض یاب ہوتے ہوئے بھی اپنے قدیم اور متروک فرسودہ ورثے اور روایات سے گویا بغل گیر ہوا بیٹھا ہے۔ وہ بعض اوقات خود کو تبصرے و تنقید کا کارمختار سمجھتے ہوئے یہ بھلا بیٹھتا ہے کہ دنیا کہیں کل یا آج سے یا ابھی شروع نہیں ہوئی ہے۔ زمانوں اور صدیوں کا عظیم ماضی اس کی تازہ ترین ہیئتوں اور معنوں کے پس منظر میں کئی چکر کاٹ کر ذرّوں کو آفتاب اور آفتاب کو ذرّوں میں تبدیل کر چکا ہے۔ یہ Transformation اور Transition اور اس کے بے شمار فیوض کسی لمحے کے معجزوں کا نتیجہ نہیں ہیں۔ انہوں نے Reformation اور Renaissance کے کئی المناک معرکے سَر کیے ہیں۔ بشر کو اپنی انتہا پسندیوں، تعصبات اور واہمات کے ناسور کو اور بھی چیک کرنا ہے۔ اس کی سیرت و بصیرت میں توازن کے لیے یہ ضروری ہے کہ وہ کشادہ دائروں میں گردش کرے اور بروقت چھلانگ لگا کر دائروں سے نکل کر سیدھا چلنا شروع کرے۔ روایتوں، ثقافتوں، تہذیبی و تمدنی وراثتوں میں جمود نہیں بلکہ رواں دھاروں کا قائل ہو۔

کوئی بھی سچائی آخری، انتہائی اور کُلی نہیں ہے۔ یہ جہان اور اس میں انسان کا کردار اپنے

اپنے دَور کی جزوی سچائیاں ہیں۔ مجموعی طور پر ان سب کا انسان کے ارتقا، تعمیر و ترقی میں تاریخی حصہ ہے۔

مارکس کا ذکر اس طرح کرنا کہ گویا دنیا شروع ہی مارکس سے ہوئی ہے اور ختم بھی اسی پر ہو گی۔ بدھ کا ذکر اس انداز میں کرنا کہ جیسے بدھ دنیا جہاں کی آخری اور واحد سچائی ہے، اس طرح کی انتہاؤں سے پرہیز ضروری ہے۔

فلسفہ، دانائی سے اُلفت اور اُلفت کی رغبت دلانے والے جوہر کے ذریعے حقیقت کی ماہیت و اصلیت کی تلاش کا کُل وقتی تفکر اور تصورات (Values and concepts) کے تانے بانے کو تلاش اور تفتیش کے ساتھ ساتھ تنقیدی اہلیت کے ذریعے چھیڑ اور نمٹا سکے۔۔۔ یہ صلاحیت ومہارت بڑی مختصر لگتی ہے کیوں کہ یوں محسوس ہوتا ہے کہ بعض نام نہاد خواہ نیک نہاد ماہر جب لذتوں کا سرچشمہ ڈھونڈتے ہوئے اذیتوں کے بگولوں میں اُلجھ جاتے ہیں۔ محبتوں کا ماخذ تلاش کرتے کرتے نفرتوں کے دریا بہانے لگتے ہیں۔ ایمان اور یقین کی جنگ لڑتے ہوئے تشکیک وگمان کے جنگل میں راہیں گم کر بیٹھتے ہیں اور امن و عافیت کے جہاں کی تعمیر کی اوٹ میں تباہیوں و غارت گریوں کے نئے پرانے ریکارڈ توڑتے رہتے ہیں کہ خود دانائی کی معتبری (Validity) مشکوک ہو جاتی ہے، پھر دانا انسان کے دیکھتے دیکھتے جنوں و سرمستی کا کیف میدان میں کود پڑتا ہے اور آرٹسٹ جو اس سرمستی کی کیفیت کے طاقت ور و بااثر نمائندے ہیں۔ ہمارے سامنے آکر یہ دعوے کرتے ہیں۔

تو عجب العجائب کے اس پیچیدہ سنسار میں انسان تحیر و تعجب کا ایک دوسرا باب کھولے بیٹھا ہے۔ وہ ضدین کے میلاپ Antitheses اور Unity of Oposites کے مظاہر کو اس طرح Synthesize کرتا ہے جیسے یہ ایک دوسرے کا متبادل ہوں۔ کثرت اس طرح وحدت کی طرف لوٹنے لگتی ہے اور Univese کی Versity یوں Unity میں ضم ہونے کا خوب صورت اہتمام کرتی ہے۔ آرٹ، فلسفہ اور سائنس طویل مسافرت کرتے ہوئے ایک دوسرے سے اُلجھتے ہوئے آخر کار پھر بھی یہ خوشبو بانٹتے ہیں کہ سچ کی تلاش میں جس بھی خادم مواد کی خامی کے اسباب ڈھونڈتے ہیں اور اس خام مال کی پختگی Maturity کے فطری اور وضعی پیمانے کھوجنے اور جانچتے ہیں تو وحدت کے خفیف ترین، نفیس ترین جُز کے بھی اجزا نئے سرے سے Re-Arrange اور Re-Organize کرنے کے کرب سے گزرنا ہے اور یہ کرب خواہ فلاسفر کا ہو، آرٹسٹ کا ہو یا سائنس دان کا ہو، یہ کرب ہی تشکیلِ نو اور اس کے سرور کا پیش خیمہ ہے۔ اکبر لغاری نے اس کرب و سرور کے عارفانہ رشتے کی

وارداتوں کی تاریخ کی انتہائیں ہمیں سلیس سندھی میں سمجھانے کی کوشش کی ہے۔مصنف جو کہ اپنی ریاستی/سرکاری اور بے انتہا ازواجی و سماجی ذمہ داریوں کے ساتھ ساتھ فکر و نظر کی کارکردگی کو انتہائی تابناکی و مستقل مزاجی سے نبھا رہا ہے، اس کا پیشِ نظر خوب صورت تحفہ ہمارے لیے اس کی اسی Commitment کا ثمر ہے۔اس حقیقت کے باوجود کہ خالص فکری و علمی کاوشیں ہمارے ہاں، مناسب پذیرائی اور قدر شناسی کی سزاوار نہیں ہیں۔اس ضمن میں ابھی تک ہمارا ذوق صحت و بلوغت کی قابلِ قدر شرح سے کافی فاصلے پر ہے۔اس تکلیف دہ صورتِ حال میں ہم اپنے ایسے ساتھیوں کے خلوص، حوصلے، تحقیق و تخلیق کے اہلیت کا بھرپور استعمال کرتے ہیں۔

ہر انسانی ادارے علمی و عملی شعبے کی مانند فلسفے میں بھی تشکیلِ نو اور تجدید کے مراحل آتے رہے ہیں۔ارتقاء اسی پرانے پن سے نئے پن کی طرف سفر کا نام ہے۔

جان ڈیوی نے گزشتہ صدی کے اولین وسط میں فلسفے کی تشکیلِ نو پر کئی چونکا دینے والے معاملات کی طرف متوجہ کیا Values یعنی انسانی قدر جیسے اہم ترین منصب کے لیے اس نے یہ پیشین گوئی کی تھی کہ یہ بھی اب فلسفے کی اجارہ داری نہیں رہے گی۔سائنسی فکر Values کو اپنی گرفت میں لا رہی ہے۔سائنس اور فلسفے کی اس باہمی رشتہ داری میں مابعد الطبیعات Metaphysics کا شعبہ اب غالباً اپنا کام ختم کر کے وقت کو آخری سلام کر رہا ہے۔جس کا حوالہ اکبر لغاری نے بھی اپنی کتاب منطقی اثباتیت کے باب میں دیا ہے۔بہر حال فلسفے اور فلاسفر کو احیاءِ علوم اور نشاۃِ ثانیہ کے دوران اجارہ داری کے گھمنڈ سے رہا ہونے کی سعادت نصیب ہوئی اور ادراک و عرفان کی اس جنس کے ماہرین نے جب اپنے دامن سے حقیقت کے خاص و عام طالب کو نوازنے کی روایت ڈالی تو فکر کے اس مسلک سے مطلوبہ فیض کو مشرق حتیٰ کہ مغرب میں مناسب پذیرائی اور وسعت حاصل ہوئی۔ اس مکمل صورتِ حال کو کتاب کے مصنف نے مختصر مگر مؤثر انداز میں ترتیب وار بیان کیا ہے۔انسان کو اس قطعی مختصر زندگی میں برتنے اور حاصل کرنے کے لیے کیا کیا میسر ہوتا ہے۔فکر و ادراک کے پیمانے، معیار اور ان کے سرور انسان کی ذات کی کتنی اقلیت کا حصہ بن سکتے ہیں؟ لوگوں کی بڑی اکثریت چھوٹے موٹے روزگار کے لیے ماری ماری پھرتی ہے اور اس کے لیے بھی کئی ذلتیں اور اذیتیں سہنے کے بعد کھا پی کر بچے پیدا کر کے مر جاتی ہے۔اسے جوانی جیسی بظاہر بڑی نعمت و برکت کی اس قدر مختصر گھڑی ملی وہ بھی اِدھر اُدھر کے پہرے داروں اور چوکیداروں کے نرغے میں ہے۔سماج کے

اندھے کانے ٹھیکے دار اپنی محرومیوں کا انتقام اور حساب بھی اس سادہ لوح وکمزور فرد سے چکانے کے لیے آستینیں چڑھائے کھڑے ہیں۔اس کی معصوم فطری خواہشوں کی تسکین پر خود ساختہ قانونی، مذہبی اور خاندانی پابندیوں کے پھندے بنا بنا کر ڈھنڈورہ پیٹ کر اس سراسر بے رحم کاروبار کو سان پر چڑھائے پھرتے ہیں اور اس کی ادھوری خوشی کے چار لخلے مجروح کر کے اس کے لیے ادھورا سرور بھی لینے نہیں دیتے بقول برٹرینڈ رسل کے:

They condemn the innocent desires and condone the crualities.

ایسا ہے ڈریکولائی ڈرامہ اس سنسار کے معتبر ومقدس لٹ برداروں کا۔۔۔

سانس مٹھی میں، انسان سدا کے لیے خوف، خدشے، اندیشے اور کھٹکے کی نذر رہوا پڑا ہے!
ایسی صورتِ حال میں فکر، فلسفے، عرفان وادراک کے اعجاز واعزاز کا کون اور کیا حساب کرے؟

افسوس یہ ہے کہ یہ خدائی چوب دار جو پہلے بھی فکر، فلسفے اور مثبت عقل کے دشمن تھے۔۔۔ وہ آج بھی سرگرم ہیں۔انسان کی معصوم، بے ضرر حسرتوں کے قاتل!۔۔۔ورنہ۔۔۔جدید تقاضوں اور تمناؤں کی روسے فلسفہ علم وفکر کی وہ جنس ہے جو ہمیں انسانی قدروں / آدمیت کے مرتبے کی شناخت، ان کے ارتقاء اور نصب العین کا شعور دیتی ہے۔یہ علم ہمیں انسانی تجربوں کے ان نمونوں سے متعارف کراتا ہے جو خطرے مول لینے کی جرأت، حسرت کی لذت اور اس کے نتیجے سے ملنے والی عافیت وحریت کے احساس سے سرشار کرتے ہیں۔

فلسفہ ایک طرز کی مخصوص تنقید ہے جو زندگی کی عمومی قدروں، ان کے باہمی تکرار وٹکراؤ کی صورت میں ان میں سے بہتر اور خوب تر قدروں کا انتخاب کرتی ہے۔

فلاسفی تعصبات وتوہمات کے خلاف ایک مسلسل جنگ ہے، اُن اداروں اور تنظیموں کے خلاف بھی ہر وقت جہاد کی حالت میں ہے جو جبر، بربریت، لوٹ مار اور آمریت کی طرف دار ہیں۔

فلاسفی ہر اس دعوے اور دعویدار کے لیے للکار Challange ہے جو انسانی آزادیوں اور حقوق کو براہِ راست یا بالواسطہ طور پر پائمال کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔

فلاسفی محاسبے، موازنے، خود احتسابی اور خود تنقیدی کا ایک موثر طرزِ عمل بھی ہے، جس کی معرفت تصحیح واصلاح کے میکنزم کی جوڑی بنتی ہے۔

فلسفہ ایک جمود مخالف قوت بھی ہے جو فکری اجتہاد، تحقیق اور تجسس کے ذوق کا سبب بنتی

ہے جو کہ سائنسی فکر کی حوصلہ افزائی و آبیاری کا سبب بنتی ہے۔

فلسفہ ہمیں ترجیحات کی صحت مند درجہ بندی اور بہتر انتخاب کا شعور بھی بخشتا ہے۔

فلسفہ اگر ہمارے پورے نظامِ فکر، قول و عمل کی یکجہتی کو متحد و مستحکم کرنے کا کردار ادا نہ کرے، اعلیٰ تر انسانی صناعیوں اور خوب صورتیوں کے لیے اتساہ انسان میں وسعتِ نظر، رواداری، عدل و میزان کے لیے آمادگی پیدا نہ کرے تو یہ محض بے سود استدلال کے سلسلے اور لفظی حساب کا ناکارہ انبار ہے۔ اس کی کارکردگی مشکوک بلکہ مہلک ہے۔ فکر کا کوئی بھی مسلک و نقطۂ نظر محض ذہنی عیاشی اور جذبات کی سطحی تسکین تک محدود رہ جائے تو وہ مردود و تباہ کُن ہے۔ اس طرز کی تفریح اور تسکین کے پھندے سے نجات لازم ہے۔ فکر وہ ہے جو حسین نظر و حسین عمل کے میثاق کا سبب بنے اور انسانی ارتقاء کی فضیلتوں اور لطافتوں کی ضمانت فراہم کرے تاکہ امن و عافیت کی وسیع فضا میں زندگی اطمینان سے شعور و عرفان کے مقام اور مرادیں پاتی رہے۔ قنوطیت سے ایجابیت و اثباتیت کی طرف آمد و رفت کی کرب انگیز پگڈنڈیاں انسان کے حوصلے آزماتی رہی ہیں۔ انکار کی کیفیت کو ناکارہ یا فضول سمجھنا انتہائی ناسمجھی، کم نظری یا کج فہمی کا ثبوت ہے۔ انکار کا ہیجان اس لیے قیمتی ہے کہ وہ در پردہ اقرار کے لیے پَر تولتا ہے۔ نااُمیدی اور اُمید کتنے ہی پہلوؤں سے دونوں لازم و ملزوم ہیں۔ فلسفی کو دونوں حالتوں/صورتوں کا استقبال اس لیے کرنا پڑتا ہے کہ وہ بشر کی فطری کمتری، برتری، پستی سمیت بلندیوں کی ترجمانی کرنے کا ذمہ دار ہے۔ تضادات کی کسی بھی نوعیت کے عکس کا فلسفے کے آئینے میں ظہور ہونا ہے۔ ان کی خوب و خام، حسن و قبح، بُرے بھلے کی تفاصیل فلسفے نے طے کرنا ہیں۔ تاکہ مجموعی طور پر ناداں انسان تمیز و تحلیل کے تناظر کا تعارف حاصل کر کے اپنی امکانی دانائی کے پیچ و خم سے روشناس ہو کر نیا جنم پائے، اپنے آپ سے نئے سرے سے دوستی کر لے اور اپنا قبلہ درست کرتا جائے۔

اکبر لغاری صاحب نے بھی داناؤں کی دانائی کو (ترجیحی طور پر) ترتیب دیا ہے۔ اس میں قریباً انسان کے مجموعی طور پر یہ نمایاں مسائل اور ان کے سلجھاؤ کے داؤ پیچ شامل ہیں۔

اس نے سقراط سے جان ڈیوی تک کے قدیم، متوسط اور جدید دانش ور جمع کیے ہیں۔ پہلے باب میں مغرب کے معتبر دانش ور یک جا کیے ہیں۔ البتہ ان میں افلاطون، ارسطو اور کارل مارکس کے علاوہ باقیوں کے لیے نہایت اختصار سے کام لیا گیا ہے۔ خاص طور پر Neo-Platonism نوفلاطونیت کے حوالے سے فلاطینوس Platinos کے لیے جو مواد دیا ہے وہ تشنہ محسوس ہوتا ہے۔

فلاطینوس برصغیر، ایران اور مشرقِ وسطیٰ کے ادب، شاعری اور تصوف میں جس قدر موثر و طاقت نمائندہ ہے، اسے اتنا ہی حصہ دینا چاہیے تھا۔۔۔ جان ڈیوی جدید فلسفے میں معتبر نقاد اور بڑا نام ہے۔ فلسفے کی تشکیلِ نو (Reconstruction in Philosophy) پر اس کا کام قیمتی سرمایہ ہے۔ وہ مناسب توجہ اور قلم کی بہت زیادہ مقدس روشنائی کا مستحق ہے۔

کتاب کا دوسرا حصہ مشرقی فلسفے کے بابت ہے جس میں لائق مصنف نے چین کے کنفیوشس، ہندوستان کے جین و بدھ دھرم کے فکری و اعتقادی نظام کی بہتر تشریح کی ہے اور اسی حصے میں ہی مسلمان فلاسافروں کا الگ باب قائم کر کے ان میں مغربی مفکرین مثلاً فارابی ابنِ رشد، ابنِ ماجہ اور ابنِ طفیل وغیرہ کو مختصر طور پر بیان کیا گیا ہے۔ اس کے بعد آخری باب میں تصوف کے بابت نو، افلاطونی، ویدانتی اور اسلامی تصوف کے مکاتیبِ فکر کی تراکیب کو بڑی خوش اسلوبی سے جمع کیا ہے۔ اسلامی تصوف کا ذکر کرتے ہوئے اس کے نظری و عملی پہلوؤں کا تجزیہ محققانہ اسلوب سے کیا ہے۔ قابل مصنف کی اس تصنیف کو دیکھنے اور قرأت کرنے سے اس کے علمی ذوق، تجسس اور مشقت کا اندازہ ہوتا ہے، جن امدادی کتب و دستاویزوں کے حاشیوں میں برمحل حوالے دیئے ہیں۔ ان سے اس کے بھرپور مطالعے و موازنے کی صلاحیت کا بھی اندازہ ہوتا ہے۔

اس مواد کی خاص خوبی یہ ہے کہ فلسفے کی مختصر تاریخ کے ساتھ ساتھ فلسفے کے مختلف ماہرین و اساتذہ کی سوانح اور معروف فلسفیانہ تحریکوں مثلاً رومانیت (Romanticism) وجودیت (Existentialism) منطقی اثباتیت (Logical Positivism) دیانا سرکل Pragmatism اور Voluntarism کی مختصر تشریح بھی مصنف کی ناقدانہ نگاہ کے ساتھ کتاب میں محسوس کی جا سکتی ہے، جو قارئین کو اپنی الگ رائے قائم کرنے میں مدد دے گی۔

فلسفے سے دلچسپی رکھنے والے شائقین تو اس پیش کش کو سراہیں گے ہی مگر فلسفے کے طلباء حتیٰ کہ اساتذہ کے لیے بھی یہ کتاب ایک خوب صورت، باترتیب و معنی خیز مواد کے طور پر کارآمد ثابت ہو گی۔ اس میں ایک طرز کے Reference اور Cyclopedia کی اضافی خوبی بھی موجود ہے۔

حیدر علی لغاری
8۔اختر کاٹیجز نزد بھٹائی ٹاؤن
حیدرآباد، سندھ

باب اوّل

مغربی فلسفہ

مغربی فلسفہ کی ابتداء

دنیا جو آج دکھائی دیتی ہے یہ 2600 سو سال قبل ایسی نہ تھی۔ سائنس اور عقل کا دُور دُور تک کوئی نام ونشان نہیں تھا۔ چار اطراف دیو مالائیں تھیں، اوائلی مذہب تھے، دیوتاؤں کی پوجا تھی اور پجاریوں کے عیش تھے۔ دنیا کی تخلیق کا باعث دیوتا تھے، جن کو خوش کرنے کے لیے قربانیاں تھیں۔ بجلی کی گھن گرج کا مطلب دیوتاؤں کا قہر تھا۔ دیوتا خوش تھے تو فصلیں بھی اچھی تھیں۔ شعوری لحاظ سے انسانیت کا تاریک دَور تھا۔

اس تاریک دَور میں، یونان کی سرزمین پر دھیرے دھیرے فلسفے کی کرنیں نمودار ہو رہی تھیں۔ آیونا کا باشندہ طالیس (Thales) (624 تا 550 قبل مسیح) یونان آیا اور عقلی بنیاد پر پہلا سوال پوچھا:

''یہ دنیا کس شے سے بنی ہے؟'' خود ہی جواب دیا ''پانی سے'' اہمیت جواب کی نہیں بلکہ سوال کی ہے۔ تلاش کرنے سے کبھی نہ کبھی صحیح جواب مل ہی جاتا ہے مگر درست سوال کی غیر موجودگی میں درست جواب کا ملنا ممکن ہی نہیں ہے۔ طالیس درست سوال پوچھ کر، ساکت پانی میں پہلا پتھر پھینک چکا تھا۔ اسی دوران طالیس نے سائنس کی بھی ابتدا کی اور سورج گرہن کی درست پیشین گوئی کی اس کے علاوہ اہرامِ مصر کی صحیح پیمائش بتا کر جیومیٹری کی بھی بنیاد رکھی۔

اس کے بعد فیثاغورث (Pythagoras) آیا جس نے ریاضی اور جیومیٹری کے علاوہ فلسفے کو بڑھاوا دیا۔ اس نے تناسخ ارواح کا نظریہ پیش کیا اور ہندو فلسفے کی مانند انسان کی نجات یہ بتائی کہ اس کی روح کو نجات ملے۔

اناکسی میندرس نے پوچھا ''صرف پانی سے زندگی کیسے جنم لے سکتی ہے؟'' خود ہی جواب دیا ''زندگی گیلی مٹی سے جنم لیتی ہے۔'' یعنی زندگی کے ماٰخذ دو عنصر ہیں۔ایک پانی دوسرا مٹی، زندگی جنم لینے کے بعد ارتقائی منازل طے کرتی ہے اور یوں مختلف حیوانات، پرندے، مچھلیاں، کیڑے مکوڑے وغیرہ جنم لیتے ہیں۔اسے ہم ڈاروِن کا پیش رو کہہ سکتے ہیں۔

ہیراکلٹس (Heraclatus) (475 تا 335 قبل مسیح) نے پوچھا ''محض پانی اور مٹی کس طرح زندگی کو جنم دے سکتے ہیں؟'' خود ہی جواب دیا۔''آگ کی مدد سے'' یعنی حیات کے تین عناصر ہیں، پانی، مٹی اور آگ۔اس کے علاوہ ہیراکلٹس نے کہا کہ یہ دنیا کسی دریا کی طرح مسلسل بہہ رہی ہے اور مسلسل تغیر میں ہے۔

زینوالیاطی (Zeno of Elia) نے کہا کہ یہ وجود کی کثرت کچھ بھی نہیں ہے، دراصل یہ ایک ہی وحدت کے مختلف روپ ہیں۔بعدازاں اس کے نظریے نے وحدت الوجود کا روپ اختیار کیا۔

پارمینائیڈس (Parmenides) نے کہا کہ ہمارے حواس فریب دیتے ہیں۔اشیاء ویسی نہیں ہیں جیسی ہمیں دکھائی دیتی ہیں۔لہٰذا ہمیں حواس اور حسی تجربات پر یقین نہیں رکھنا چاہیے۔

ایمپی ڈوکلس (Empedocles) نے کہا کہ ''زندگی ہوا آگ، پانی اور مٹی سے جنم لیتی ہے۔'' مزید یہ کہ مادہ ازلی اور ابدی ہے اس کا کوئی آغاز ہے نہ انجام۔

اناکساغورث نے پوچھا ''اگر زندگی مادہ ہے تو اس میں حرکت کیوں کر پیدا ہوتی ہے۔'' ایک آفاقی ذہن ساری نقل و حرکت کا باعث ہے۔

ڈیموکریٹس نے دریافت کیا ''مادہ کس چیز سے بنا ہے؟'' اس نے خود ہی جواب دیا ''انتہائی چھوٹے چھوٹے ذرّات (Atoms) سے جو ناقابلِ تقسیم ہیں۔'' مزید کہا کہ دیوتا اور مذہب وغیرہ سب کچھ جھوٹ ہے۔انسان کو صرف خوشی حاصل کرنے کے لیے جینا چاہیے۔

درج بالا تمام فلسفیوں نے جو جوابات دو صدیوں میں دیئے ہیں۔وہ آج مڈل سکول کا طالب علم بھی جانتا ہے لیکن اہمیت ان جوابات کی نہیں ہے بلکہ اہمیت ان چند سوالات کی ہے جو اس دور میں پوچھے گئے۔صحیح سوال ہی دراصل فلسفے کی اصل روح ہیں۔یہ صحیح سوالات اُٹھانے کے بعد فلسفے کی صورت آہستہ آہستہ آشکار ہو رہی تھی اور اب ضرورت ایسے دانش ور کی تھی جو اپنی زندگی میں ایک یا دو نہیں بلکہ بے شمار سوالات اُٹھائے۔روحِ عصر کو ایک نیک دل بوڑھے نے لبیک کہا اور سوالات کا لامتناہی سلسلہ شروع کیا۔جی ہاں وہ نیک دل بوڑھا سقراط (Socrates) ہی تھا۔

سقراط

(470ق۔م تا399ق۔م)

دنیا کے عظیم دانش وروں میں شمار ہونے والا سقراط (Socrates) 470 قبل مسیح میں یونان کے شہر ایتھنز میں ایک متوسط طبقے کے گھرانے میں پیدا ہوا۔ وہ عام یونانیوں کی مانند قد آور اور صحت مند تھا اور بے پناہ قوتِ برداشت کا مالک بھی تھا۔ سخت سردی ہو یا شدید گرمی، سقراط ہمیشہ ننگے پاؤں رہتا۔ وہ انتہائی سادہ اور معمولی لباس پہنتا تھا۔

سقراط بچپن سے ہی ''سوچ بچار'' کا عادی تھا۔ کبھی کبھار تو اسے سوچ بچار کے ایسے دورے پڑتے کہ وہ پہروں بیٹھا کسی بات کو سوچتا رہتا۔ وہ جب کسی مسئلے پر غور وفکر کر رہا ہوتا تو اس کی محویت کا یہ عالم ہوتا کہ اسے آس پاس کی کسی بھی بات کا ہوش نہ ہوتا۔

سچائی کی خاطر جان قربان کرنے والے تاریخ کے اس اولین دانا کی زندگی کے چند برس فوجی کی حیثیت سے جنگ لڑتے ہوئے گزرتے۔ اس کی بقیہ زندگی کے سارے ماہ وسال ''دانائی'' کی خدمت کرتے گزرے۔ اس کا طریقہ کار یہ تھا کہ وہ ہر روز شہر کے کسی چوک پر جا بیٹھتا تھا۔ تھوڑی ہی دیر میں اس کے اردگرد ایتھنز کے نوجوانوں کے جھتے یوں اُمڈ آتے گویا شمع کے گرد پروانے۔ سقراط سارا دن ان سے کسی نہ کسی مسئلے پر گفتگو کرتا رہتا اور ان سے سوال پوچھتا رہتا۔ ان نوجوانوں میں افلاطون (Plato) ارسطوفینز (Aristophanes) زینوفان (Xcnophane) اور

اگیتھون (Agathone) سرفہرست تھے۔

عام طور پر اس کی گفتگو کے موضوعات جمہوریت، سیاست، ریاست، سچائی، خوب صورتی، عدل اور عقل وغیرہ ہوتے۔ ان تمام موضوعات پر سقراط سے پہلے کئی فلسفیوں نے اپنے اپنے نظریات قائم کر رکھے تھے اور وہ سقراط کے زمانے میں ''امراء'' کے بچوں کو معاوضے کے عوض فلسفہ پڑھاتے تھے۔ سقراط نے ان کے سارے نظریات کو رد کیا اور اپنے طریقہ کار ''مکالمہ'' (Dialogue) کے ذریعے نئے اوصاف دینے کی کوشش کی۔ آہستہ آہستہ سقراط دانش ور کی حیثیت سے مشہور ہونے لگا۔

ایک روایت کے مطابق سقراط کے ایک دوست نے اس کی فہم و فراست دیکھتے ہوئے اس دور کے ''عقل کے دیوتا'' سے دریافت کیا کہ کیا اس وقت پوری دنیا میں کوئی ایسا انسان ہے جو سقراط سے زیادہ عقل مند ہو؟ اس پر دیوتا نے نفی میں جواب دیتے ہوئے سقراط کو ہی بڑا دانش ور قرار دیا۔

یہ خبر سُن کر سقراط پریشان ہو گیا۔ کیوں کہ اس نے خود کو کبھی بھی سیانا تصور نہیں کیا تھا۔ اس وقت یونان میں کئی ''سوفسطائی [1] فلسفی'' (Sophists) تھے، جو نہایت عقل مند سمجھے جاتے تھے۔ سقراط باری باری ہر سوفسطائی فلسفی کے پاس گیا اور ان سے چند موضوعات پر سوالات پوچھے۔ انہوں نے جو بھی جواب دیئے ان جوابوں پر مزید کئی سوال پوچھے۔ آخر کار صورتِ حال یہاں تک آن پہنچی کہ ان سوفسطائی فلسفیوں کی عقل جواب دے گئی اور وہ اشتعال میں آ کر سقراط کو بُرا بھلا کہنے لگے (ہر جھوٹے دانش ور کے پاس دلائل ختم ہو جاتے ہیں اور وہ جلد ہی غصے میں آ جاتے ہیں)

سوفسطائی فلسفیوں کے رویے اور سطحی سوچ دیکھ کر سقراط اس نتیجے پر پہنچا کہ یہ نام نہاد فلسفی، دانش سے بالکل کورے اور جاہل ہیں۔ سقراط نے جب ان فلسفیوں سے اپنا موازنہ کیا تو وہ اس نتیجے پر پہنچا کہ ''یہ نام نہاد فلسفی نرے جاہل ہیں لیکن اپنی جہالت سے ناواقف ہیں۔ مَیں بھی جاہل ہوں لیکن مجھے علم ہے کہ مَیں کچھ بھی نہیں جانتا۔ لہٰذا عقل کا دیوتا سچ کہتا ہے کہ مَیں ان سب سے زیادہ عقل مند ہوں۔'' اس کے بعد سقراط نے اپنی زندگی کا مقصد یہ طے کر لیا کہ سچائی اور دانش کی تلاش جاری رہے گی اور اس سلسلے میں ہر اس فرد سے مدد لی جائے گی جو اسے صرف سننے کے لیے بھی تیار ہو جائے۔'' [2]

(1)۔ سوفسطائی (Sophists) وہ نام نہاد فلسفی تھے جو دانش فروخت کرتے تھے اور ان کی دانائی محض اتنی ہوتی تھی کہ مخالف کو بحث میں کیسے ہرایا جائے۔ بحث جیتنے کے لیے وہ ایسے خود ساختہ دلائل دیتے تھے خود انھیں بھی یقین نہ ہوتا تھا۔

(2)-Apology, Page:20.

سچائی تک پہنچنے کے لیے سقراط نے جو طریقہ کار ایجاد کیا اسے مکالمہ (Dialogue) یا گفتگو کہتے ہیں۔ سقراط کسی بھی آدمی سے کسی موضوع پر گفتگو شروع کر دیتا تھا اور اس گفتگو سے نتائج اخذ کرنے کی کوشش کرتا تھا۔ مثلاً یہ اپنی لاعلمی ظاہر کرتے ہوئے کسی شخص سے پوچھتا، آخر ''ہمت'' کیا ہے، وہ شخص جب ہمت کی کوئی تعریف بیان کرتا تو سقراط اس تعریف پر گہرے اطمینان کا اظہار کرتے ہوئے ''ہمت'' کے بابت مزید سوال پوچھتا۔ وہ شخص زیادہ سے زیادہ بولتا رہتا اور سقراط زیادہ سے زیادہ سنتا رہتا اور سوال و جواب کا سلسلہ جاری رہتا۔ آخر کار وہ شخص اپنی ہی بیان کردہ تعریف سے منکر جاتا اور کوئی نئی تعریف بیان کرتا سقراط پھر اسی طرح سے سوالات پوچھنا شروع کر دیتا اور آخر کار کسی نہ کسی تعریف پر دونوں متفق ہو جاتے مگر اکثر ایسا نہ ہوتا اور بحث کسی نتیجے کے بغیر ختم ہو جاتی۔ (۱)

سقراط نے اپنی گفتگو کا مرکز اخلاقی نکات کو بنایا۔ اس نے کوشش کی کہ تقویٰ، انصاف، ہمت اور بزدلی وغیرہ کی کوئی تعریف وضع کی جائے۔ اپنے مقصد یعنی سچائی، دانائی اور اخلاقی اقدار کی ماہیت کو سمجھنے کے لیے غور و فکر کے علاوہ وہ خاص نشستیں بھی جاری رکھتا تھا جو کہ اکثر اس کے شاگردوں کے گھروں یا شہر کے کسی چوک پر منعقد ہوتیں۔ سقراط جہاں کہیں بیٹھا ہوا ملتا اس کے اردگرد نوجوان اور بحث مباحثے کے شائق افراد بیٹھے دکھائی دیتے۔ وہ کوئی بھی موضوع چھیڑ کر بولنے والے پر سوالات کی بوچھاڑ کر دیتے۔

سقراط کے اس طریقہ کار کو اس کے شاگرد بھی پسند کرنے لگے، جب وہ کسی فلسفی کے پاس جا کر سوال جواب کرتے تو اُس فلسفی کی فہم و فراست کا پول کھل جاتا جس کے نتیجے میں یہ دانش ور صاحبان خود سے بہت کم عمر نوجوانوں کا سامنا کرتے ہوئے اپنی توہین محسوس کرتے۔

سچائی اور دانائی کا متلاشی سقراط، اعلیٰ اخلاقی اقدار کی ترجمانی کو اپنا نصب العین سمجھتا تھا لیکن اعلیٰ اخلاقی اقدار کو سمجھنے اور پھر ان پر عمل کرنے تک وہ ''علم'' یا فہم پر زیادہ اصرار کرتا۔

''علم اور نیکی دونوں لازم و ملزوم ہیں، جسے نیکی اور بدی کی تمیز نہیں ہوگی وہ نیکی نہ کر سکے گا۔'' (۲)

سقراط کے عہد میں یونان میں شہری ریاستیں تھیں اور ان میں جمہوری نظام حکومت رائج تھا لیکن ہر دور کی طرح یونان میں بھی حکمرانوں اور سیاست دانوں کی اکثریت بدعنوان اور جاہل

(1)-A History of Philosophy by: Frederick copleston, S.J. Volume: 1, Page: 106.
(2)-Copleston S.J. Vol: 1, Page: 108.

تھی۔ سقراط ہمیشہ اس بات پر زور دیتا کہ مقتدر قوتوں کو ریاست کا مکمل طور پر علم ہونا چاہیے۔

''اگر مجھے اپنا جوتا مرمت کرانا ہو تو کس سے کراؤں گا'' سقراط اپنے کسی شاگرد سے پوچھتا ''جفت ساز سے'' جواب ملتا ''اچھا اگر کپڑا سلوانا مقصود ہو تو بھی جفت ساز کے پاس جاؤں گا؟'' ''نہیں سقراط! اس کے لیے درزی کے پاس جانا پڑے گا۔'' اسی طرح وہ معمار، بڑھئی اور لوہار کے متعلق پوچھتا جاتا اور آخر کار کہتا ''اگر جوتا بنانے کے لیے موچی، کپڑا سینے کے لیے درزی، کلہاڑی بنانے کے لیے لوہار کا کام سیکھنا ضروری ہے تو پھر ریاست کی کشتی چلانے کے لیے بھی بڑے ماہر کاری گروں کی ضرورت ہے۔''

سقراط سچائی، دانائی اور نیکی کی تلاش اور پرچار کرتا رہا اور اس کے چاروں اطراف نوجوان شاگردوں کی تعداد بڑھتی گئی۔ سچ کے متلاشی فلسفی کی مقبولیت اور اس کا فلسفہ حکمران طبقے کو پسند نہ آیا۔ سچ کو دبانے اور اپنی بدعنوانیوں پر پردہ ڈالنے کے لیے حاکمینِ وقت سازشیں تیار کرنے لگے۔ انہوں نے دیکھا کہ سچ کی زبان بند کرنے کے لیے کوئی بھی لالچ سودمند نہ ہوگی۔ وہ جانتے تھے کہ سقراط نے ساری زندگی کوئی جائیداد نہیں بنائی بلکہ وہ تو پیٹ بھر کر کھانا بھی نہیں کھاتا تھا۔ ساری زندگی اپنی بیوی کے طعنے سہنے والے، اس ننگے پاؤں، بھوک اور پیاس سے بے پروا پیادے کو آخر کیوں کر لالچ کے ذریعے چپ کرایا جا سکتا تھا؟

آخر کار سقراط یا دوسرے لفظوں میں سچائی کو ہمیشہ ہمیشہ کی نیند سُلانے کے لیے انہوں نے منصوبہ تیار کر لیا۔

مقدمہ اور زہر کا پیالہ

ایتھنز شہر کی عدالت کا منظر ہے، جہاں تقریباً 500 شہری جیوری کی شکل میں موجود ہیں، بے شمار تماشائی بھی موجود ہیں اور عدالت کے کٹہرے میں کھڑا ہے، دانش کا آفتاب سقراط۔

سقراط پر الزامات ہیں:

(۱)۔ وہ یونان کے معروف خداؤں کا منکر ہے اور نئے نئے دیوتا متعارف کراتا رہتا ہے۔

(۲)۔ وہ اپنی تقاریر اور محافل کے ذریعے نوجوانوں کے اخلاق بگاڑ رہا ہے۔

الزام عائد کرنے والے کا نام میلیٹس (Meletus) ہے مگر پس پردہ ایک انائٹس نامی سیاست دان ہے۔ الزام لگانے والا اپنی زوردار تقریر میں جج صاحبان سے مطالبہ کرتا ہے کہ سقراط کو

سزائے موت سنائی جائے۔ عدالت میں افلاطون کے علاوہ بھی سقراط کے کئی چاہنے والے شاگرد موجود ہیں۔ کئی کم عمر نوجوان اور کئی بوڑھے بھی دکھائی دے رہے ہیں۔ سب یہ جاننا چاہتے ہیں کہ سقراط اپنا دفاع کس طرح کرتا ہے۔

جب سقراط کو اپنی صفائی پیش کرنے کے لیے کہا گیا تو وہ اپنے مکالماتی (Dialectic) طریقے کے ذریعے میلیٹس اور انائیٹس کو بالکل جھوٹا ثابت کر دیتا ہے مثلاً سقراط کہتا ہے:

''تم کس طرح کہتے ہو کہ مَیں یونانی خداؤں کو نہیں مانتا؟ تم پہلے تو کہتے ہو کہ سقراط خداؤں کو نہیں مانتا اور پھر کہتے ہو کہ وہ نئے دیوتا متعارف کراتا رہتا ہے۔ یہ تو ایسے ہی ہوا کہ کوئی خچر کے وجود پر تو یقین رکھتا ہو مگر گھوڑے کے وجود سے انکار کرے۔۔۔؟''

سقراط آہستہ آہستہ دلائل بھی دیتا جاتا ہے اور سوال بھی کرتا جاتا ہے۔ اس طرح آخر کار معاملہ بالکل واضح ہو جاتا ہے اور الزامات غلط ثابت ہوتے دکھائی دیتے ہیں، مگر سقراط جانتا ہے کہ یہ مقدمہ معمولی نوعیت کا نہیں ہے بلکہ اس کا مقصد اسے منظر سے ہٹانا ہے لیکن وہ بالکل بھی نہیں گھبراتا اور پُر جوش انداز میں کہتا ہے ''اے ایتھنز کے باسیو! یہ کس قدر عجیب بات ہوگی کہ مَیں جسے تمہارے منتخب کردہ جرنیلوں نے دورانِ جنگ ایک خطرناک جگہ پر کھڑا کر دیا، جہاں کسی بھی گھڑی موت پہنچ سکتی تھی لیکن مَیں موت کے خوف سے اپنی جگہ سے ذرا نہ ہٹا اور اپنے جرنیلوں کے حکم کی تعمیل کی۔ اب جب مَیں یہ محسوس کرتا ہوں کہ مجھے خدا کا حکم ہوتا ہے کہ مَیں خود شناسی اور انسان شناسی کا مقصد پورا کرتا رہوں تو کیا مَیں موت کے خوف سے خدا کا حکم ٹال سکتا ہوں؟ اب اگر تم مجھے کہو کہ سقراط! ہم تمہیں اس شرط پر آزاد کر دیں گے کہ تم ''سچائی'' کی تلاش چھوڑ دو، تو مَیں کہوں گا، ایتھنز کے باسیو! میرے دل میں تم لوگوں کے لیے عزت اور پیار ہے، مگر میں تمہاری بجائے خدا کا حکم مانوں گا اور جب تک میری جان میں جان ہے، تب تک میں فلسفہ پڑھاتا رہوں گا اور کہتا رہوں گا: اے دوستو! اے عظیم ایتھنز کے باسیو! تم لوگ دولت، مرتبے اور شان و شوکت کو بہت زیادہ اہمیت دیتے ہو، مگر سچائی اور دانائی کو بہت کم۔ مَیں تم سب کو یہ بتانا چاہتا ہوں کہ بے شک انائیٹس کا کہنا مانو، مجھے آزاد کرو، یا نہیں مگر یاد رکھنا مَیں سچائی کے راستے سے کبھی بھی نہیں ہٹوں گا۔ چاہے اس کے لیے مجھے بار بار مرنا کیوں نہ پڑے۔''

500 میں سے تقریباً 280 ججوں نے سقراط کو موت کی سزا سنائی اور 220 ججوں نے اس سزا کی مخالفت کی۔ اس دَور کے دستور کے مطابق، سقراط کو اختیار دیا گیا کہ وہ سزائے موت کی بجائے

اپنے لیے کوئی دوسری سزا تجویز کرے، اگر یہ سزا مناسب ہوئی تو اسے یہی دی جائے گی۔

قریباً تمام ججوں اور شہریوں کا قیاس یہ تھا کہ سقراط جلاوطنی کی سزا تجویز کرے گا، جو اسے مل جائے گی لیکن سقراط کی تجویز کردہ سزا اس قدر معمولی تھی کہ تمام جج ناراض ہو گئے اور اگلی مرتبہ سقراط کو سزائے موت دینے والے ججوں کی تعداد 360 ہو گئی۔ سقراط نے اپنے لیے صرف 30 مناس (سکہ رائج الوقت) کا جرمانہ تجویز کیا۔ یہ بھی محض افلاطون کے بے حد اصرار پر ورگرنہ سقراط کا ارادہ کسی بھی قسم کی رعایت لینے کا ہرگز نہیں تھا۔

ججوں کی اکثریت نے (ایک عقل دشمن سیاست دان کے اشارے پر) سچ کے داعی، دانش سے محبت کرنے والے 70 سالہ بوڑھے کو ایک ماہ کے بعد زہر کا پیالہ پینے کی سزا سنائی۔

سزائے موت سُن کر سقراط کے چہرے پر ایک فاتحانہ مسکراہٹ پھیل گئی لیکن افلاطون اور دوسرے شاگرد انتہائی رنجیدہ ہو گئے اور اپنے استاد اور روحانی باپ کو بچانے کی تدبیریں کرنے لگے۔ اس کے شاگردوں نے رشوت دے کر جیلر کو اپنے ساتھ ملا لیا اور سب شاگردوں نے یہ منصوبہ تیار کیا کہ سقراط کو جیل سے فرار کرایا جائے لیکن سقراط نے اس فرار کو بالکل ''غیر اخلاقی'' قدم قرار دیا اور مرنے کو ترجیح دی۔

جیل میں موت کا انتظار کرتے ہوئے بھی سقراط نے سچائی کے ساتھ پوری طرح دوستی نبھائی۔ اس کے شاگرد ہر روز ملنے کے لیے آتے۔ وہ ان کے ساتھ سارا دن بحث مباحثہ کرتا اور کسی نہ کسی نتیجے پر پہنچنے کی کوششیں کرتا۔

آخر کار وہ دن بھی آ گیا جب سقراط کو یونان کا خطرناک زہر ''ہیم لاک'' پینا تھا۔ اس نے صبح سے کئی دفعہ جیلر سے دریافت کیا کہ زہر تیار ہوا یا نہیں، جب زہر ایک پیالے میں بھر کر لایا گیا تو اس نے پیالہ اپنے دونوں ہاتھوں میں تھام لیا اور غٹا غٹ پی گیا، جب زہر اپنا اثر دکھانے لگا تو سقراط نے اپنے شاگرد سے کہا ''کرٹو (Crito) مجھ پر اسکیولیس کے ایک مرغ کا قرض باقی ہے، یہ اسے لوٹا دینا'' یہ کہہ کر سقراط نے آنکھیں بند کر لیں اور سدا سدا کے لیے اَمر ہو گیا۔

ول ڈیورانٹ (Will Durrant) سقراط کو فلسفے کا پہلا شہید قرار دیتے ہوئے لکھتا ہے:
''یونان غریب ہو گیا اور ایتھنز کی روح کو اتنا گہرا زخم لگا جو کبھی بھی بھر نہ سکے گا۔''

افلاطون

یہ عظیم مفکر سن 428 قبل مسیح میں ایتھنز کے ایک تعلیم یافتہ اور بارسوخ گھرانے میں پیدا ہوا۔اس کی ابتدائی تعلیم ایتھنز میں ہی مکمل ہوئی۔اس کے خاندان کے سقراط سے گہرے تعلقات تھے، جس کی وجہ سے افلاطون کو بچپن سے ہی سقراط جیسے عظیم دانش ور کی صحبت نصیب ہوئی۔

سقراط اپنے طریقۂ کار کے ذریعے پرانے عقائد اور فرسودہ خیالات کی جو قطع برید کیا کرتا تھا، افلاطون کو وہ بے حد پسند تھی۔سقراط سے محبت اور دانائی سے عشق، گویا افلاطون کی زندگی کے عظیم مقصد بن گئے۔وہ اکثر کہا کرتا تھا:

''شکر ہے کہ میں کسی وحشی قوم کی بجائے یونانی قوم میں پیدا ہوا۔غلام کی بجائے آزاد پیدا ہوا۔عورت کی بجائے مرد پیدا ہوا اور سب سے اہم بات یہ ہے کہ میں سقراط کے عہد میں پیدا ہوا۔''

افلاطون کا تعلق ایک سیاسی گھرانے سے تھا۔اسی وجہ سے وہ کچھ عرصہ سیاست کی طرف راغب بھی رہا لیکن جلد ہی عملی سیاست سے بیزار ہو گیا اور اس نتیجے پر پہنچا کہ ''ایک باضمیر انسان کے لیے عملی سیاست میں کوئی جگہ نہیں ہے۔''

نازونعم میں پرورش پانے والے اس نفیس نوجوان کی زندگی میں جب وہ 28 برس کی عمر کو پہنچا تو وہ سانحہ ہوا جس نے افلاطون کی زندگی پر بہت گہرے اثرات مرتب کیے۔یہ سانحہ یونان کے لیے بھی شدید دھچکا تھا۔اس کے رہبر، اس کے محبوب استاد کو زہر کا پیالا پینا پڑا تھا۔افلاطون نے اپنے

استاد کو بچانے کے لیے ہر ممکن کوشش کی لیکن کامیاب نہ ہو سکا۔

سقراط کے مقدمے اور اس کے فیصلے نے افلاطون کے دل میں عوامی حکومت کے لیے شدید نفرت پیدا کر ڈالی اور عوامی حکومت افلاطون کے روپ میں سقراط کو دوبارہ جنم لیتے ہوئے دیکھنے لگی۔ نتیجے کے طور پر حکومت افلاطون پر بھی نامہربان ہو گئی۔ ایتھنز کی دھرتی افلاطون کے لیے اجنبی بن گئی اور جلاوطنی افلاطون کا مقدر بن کر رہ گئی۔

افلاطون نے پہلے سسلی اور پھر اٹلی کا سفر کیا۔ اٹلی میں اس نے پیتھاگورس کے پیروکاروں کے ساتھ وقت گزارا اور ان سے جمہوریت اور امراء کی حکومت (Aristocracy) سے متعلق خوب بحث مباحثے کیے۔ اس کے بعد وہ مصر، قیروان[1] اور دیگر کئی ملکوں میں تقریباً در بدر بھٹکتا پھرا۔ اس کی بے چین روح کو سکون کی تلاش تھی۔ سقراط کے سانحے کی تپش اور سچائی حاصل کرنے کی جستجو نے اسے بہت کچھ سکھا ڈالا۔ وہ مختلف مذاہب، مختلف مکاتیب اور مختلف خیالات کے عالموں، فلسفیوں اور سائنس دانوں سے ملتا رہا۔ وہ ہر اس فرد اور ادارے تک پہنچا جہاں سے اسے علم اور عقل کی خوشبو آئی۔

40 سال کی پختہ عمر میں وہ مختلف ملکوں سے دانش کے پھول اپنے دامن میں سمیٹ کر ایک مرتبہ پھر اپنی جنم بھومی ایتھنز میں آ داخل ہوا۔

12 سال کے بعد واپس آنے والے افلاطون میں نمایاں تبدیلیاں آ چکی تھیں۔ شاعر، فن کار، مفکر، سیاست دان اور استاد وغیرہ کی تمام صفات ایک انسان میں جمع ہو چکی تھیں۔ ایک عالم اگر شاعر بھی ہو تو یوں لگتا ہے جیسے دریا میں سیلاب کی کیفیت پیدا ہو چکی ہو اور یہ دریا پیاسی دھرتی کو سیراب کرنے کے لیے بے تاب ہوا جاتا ہو۔ افلاطون نے جو کچھ سیکھا تھا۔ اس امانت کو دوسروں تک پہنچانے کے لیے اس نے باقاعدہ ایک ادارہ کھولا، جس کا نام ''اکیڈمی'' رکھا گیا۔

افلاطون کی یہ اکیڈمی مستقبل میں ایک قدیم یونی ورسٹی کی شکل میں تبدیل ہو گئی۔ جہاں ریاضی اور قانون سے لے کر سائنس تک پڑھائی جاتی تھی۔ افلاطون نے اپنی باقی ماندہ زندگی اکیڈمی میں تدریس کرتے ہوئے اور علم و دانش پر بحث و مباحثے کرتے ہوئے گزاری۔ یہ اکیڈمی تقریباً 900 سال تک قائم رہی۔

---

(۱)۔ افلاطون نے سائراکیوس میں عملی سیاست میں بھی حصہ لیا مگر درباری سیاست اور سازش کا شکار ہو گیا اور اسے غلام بنا کر فروخت کیا گیا۔ قیروان میں اس کے ایک قدردان نے اس کو خرید کر آزادی دلائی۔

اکیڈمی میں افلاطون نے درس و تدریس کے علاوہ مختلف موضوعات پر مکالمے (Dialogue) کی صورت میں متعدد کتابیں تصنیف کر کے اپنے استاد کی یاد کو تازہ رکھا۔ ان مکالمات میں ''ریاست'' (The Republic) خاص طور پر قابلِ ذکر ہے۔ ریاست کے علاوہ افلاطون نے مندرجہ ذیل کتابیں تحریر کیں۔

1-Apology	2-Crito	3-Enthy Phrom	4-Laches
5-Lon	6-Protagoras	7-Chasmides	8-Lysid
9-Gorgias	10-Meno	11-Euthy Demus	12-Hippios-1
13-Hippios-2	14-Cratylus	15-Menexenis	16-Symposium
17-Phaedo	18-Phaedrus	19-Theactetus	20-Parmenides
21-Politicus	22-Philebus	23-Timaeus	24-Critias
25-Laws & Epinomis			

افلاطون کا فلسفہ بے شمار موضوعات پر محیط ہونے کی وجہ سے ہر ایک کا مکمل احاطہ اس کتاب میں ممکن نہیں ہے۔ لہٰذا چند اہم موضوعات اختصار کے ساتھ پیشِ خدمت ہیں۔

سیاسیات

افلاطون کا سب سے اہم کارنامہ اس کا مکالمہ ''ریاست'' (The Republic) ہے، جس میں اس نے ایک ایسی ریاست (Utopia) کا تصور دیا ہے، جس کا حکمران یا بادشاہ فلسفی (Philospher king) ہو یا پھر فلسفی کو حکمران بنایا جائے۔ اپنے استاد کی طرح اس نے کہا: ''ہم جوتا بنوانے کے لیے تو کسی موچی کے پاس جاتے ہیں کیوں کہ اسے اس کام کی تربیت ملی ہوتی ہے لیکن امورِ مملکت چلانے کے لیے ہم کسی تربیت یافتہ انسان کی تلاش کیوں نہیں کرتے؟''

افلاطون کے بقول، انسان ازل سے لالچی اور آرام پسند ہے، اس کی فطرت میں ہی قناعت پسندی نہیں ہے۔ وہ ہر وقت ایک جستجو اور تلاش میں رہتا ہے اور زیادہ سے زیادہ پر قابض ہونے کی کوشش کرتا ہے۔ وہ دوسرے انسانوں سے اس لیے بھی حسد کرتا ہے کہ ان کے پاس اس سے زیادہ کچھ ہے۔ وہ لالچ، حسد اور ہوس کے جنون میں دوسروں کے حقوق پر ڈاکے ڈالتا ہے۔ ان کی املاک، جائیداد اور علاقے پر قبضہ کرنے کے لیے جنگ چھیڑتا ہے یا دھن کمانے کے لیے تجارت وغیرہ کرتا ہے، جس کے نتیجے میں ایک دولت مند اور تاجر طبقہ پیدا ہوتا ہے جو کہ ہمہ وقت خود سے کم

اور غریب طبقے کو مسلسل لوٹتا رہتا ہے۔ یہ طبقہ جب حد سے زیادہ امیر ہو جاتا ہے تو پھر اقتدار پر قابض ہو جاتا ہے اور Oligarchy یعنی چند دولت مند خاندانوں کی حکومت جنم لے لیتی ہے، جس کا اوّلین مقصد محض دولت کمانا ہوتا ہے، جب تمام نظامِ حکومت ناکام ہو جاتے ہیں تو انقلاب آتا ہے اور اس کے بعد جمہوریت آتی ہے اور ہر فرد خود کو آزاد اور اقتدار میں حصہ دار تصور کرتا ہے۔

جمہوریت کا بنیادی اصول ہے کہ ہر شخص کو اقتدار تک پہنچنے اور امورِ مملکت سنبھالنے کا مساوی حق حاصل ہے یا اپنے نمائندے کو حکمران بنانے کا پورا پورا حق ہے۔ یہ اصول پہلی نظر میں تو نہایت خوب صورت اور دل کش دکھائی دیتا ہے لیکن اس کا خطرناک رُخ یہ ہے کہ عوام اس قدر تعلیم یافتہ اور باشعور نہیں ہوتے ہیں کہ کسی صحیح فرد کو حکمرانی کے لیے منتخب کر سکیں۔ عوام سے اس کی رائے یا ووٹ حاصل کرنا کوئی دشوار مسئلہ نہیں ہے۔ اگر عوام کی تعریف یا خوشامد بڑھ چڑھ کر کی جائے یا کوئی اچھا مقرر ہو تو عوام باآسانی بے وقوف بن جاتے ہیں اور اپنا ووٹ بہ خوشی دے دیتے ہیں۔

اس طریقے سے اقتدار حاصل کر لینے والے لوگ حکومت کرنے کے اہل نہیں ہوتے۔ ان کی حکومتیں ان کے اشارے کی غلام ہوتی ہیں، جنھیں عوام کی منشاء کی ذرا پروا نہیں ہوتی۔

افلاطون نے اپنی کتاب ریاست میں سیاست پر بحث کرتے ہوئے انسانی رویوں کا تجزیہ کیا ہے، اس کے مطابق، انسان کا رویہ تین محرکات کے اِردگرد گردش کرتا رہتا ہے۔ خواہش، جذبات اور آگاہی / علم۔

ا۔ خواہش

خواہش، جبلت، رغبت، تمنا وغیرہ کم یا زیادہ ہر انسان میں موجود ہیں لیکن کچھ لوگ مکمل طور پر ان کے غلام ہیں۔ وہ ہر وقت زیادہ سے زیادہ کے لالچ میں رہتے ہیں اور آسائشوں کے حصول کی خاطر اپنی اور دوسروں کی زندگی اجیرن کر ڈالتے ہیں۔ صنعت کار طبقہ ایسے ہی لوگوں کی وجہ سے وجود پذیر ہوتا ہے۔

۲۔ جذبات

جذبات، ہمت اور بہادری وغیرہ ملک کی فوجی قوت کو جنم دیتے ہیں۔ ان کی نظر میں ملکیت سے زیادہ اہمیت اور کشش طاقت میں ہوتی ہے۔

۳۔ علم

سوچ، علم، ذہانت اور منطق وغیرہ چند داناؤں کو جنم دیتے ہیں، جن کی نگاہ میں ملکیت اور

طاقت سے زیادہ اہمیت، علم اور دانش کی ہوتی ہے۔ یہ سچائی کو دولت پر ترجیح دینے والے لوگ تعداد میں بہت کم اور اکثر وبیش تر معاشرے کے نظر انداز کیے گئے افراد ہوتے ہیں۔

افلاطون کی یوٹوپیا ''مکمل ریاست'' میں درج بالا تینوں طبقوں کی ضرورت ہے۔ صنعت کار اور کارخانے دار صرف مال تیار کریں گے اور کبھی بھی اقتدار پر قابض نہیں ہو سکیں گے۔ فوجی طبقہ صرف ریاست کا دفاع کرے گا اور اقتدارانہ معاملات سے مکمل طور پر الگ رہے گا۔

حکمرانی صرف تیسرے طبقے کے لوگ یعنی دانش ور اور باشعور افراد کریں گے جو کہ عالم، سائنس دان اور فلسفی ہوں گے۔ کیوں کہ جب بھی تاجر طبقہ اقتدار پر قابض ہوگا تو تباہی ضرور آئے گی اور یہی صورتِ حال فوج کے اقتدار میں آنے سے بھی ہوتی ہے۔

حکمرانی نہ تو دولت کمانے کا ذریعہ ہے اور نہ ہی طاقت کی نمائش کا۔ حکمرانی سائنس ہے اور آرٹ بھی، لہٰذا صرف سائنس اور آرٹ کے لوگ ہی بہترین حکمران ثابت ہو سکتے ہیں۔

یہ سائنس اور آرٹ کے بہترین لوگ جو کہ فلسفی بھی ہوں۔ ان کا پیدا ہونا کوئی معمولی بات نہیں ہے بلکہ بہترین حکمران پیدا کرنے کے لیے ایک طویل تربیت درکار ہوتی ہے۔ افلاطون نے ''ریاست'' میں فلسفی حکمران پیدا کرنے کے لیے تفصیلی تربیت کا بھی ذکر کیا ہے، جس کا اختصار درج ذیل ہے:

(i)۔ زندگی کے ابتدائی 10 سال زیادہ سے زیادہ جسمانی تعلیم و تربیت پر صرف کرنا چاہئیں۔ ہر سکول میں کھیلوں کے سامان اور میدان ہونا نہایت ضروری ہے۔ مستقبل کے حکمرانوں کو مکمل طور پر صحت مند ہونا چاہیے۔

(ii)۔ 10 سے 16 سال کی عمر تک موسیقی کی تعلیم دینا چاہیے۔ موسیقی انسان میں نہ صرف ترتیب اور سکون پیدا کرتی ہے بلکہ یہ کردار اور محسوسات کو بھی صاف ستھرا بناتی ہے۔ موسیقی کے ذریعے انسان کے شعور میں مدفن صلاحیتیں اُٹھتی ہیں لیکن حد سے زیادہ موسیقی پر بھی زور نہیں دینا چاہیے، وگرنہ یہ انسان کو حد سے زیادہ نرم و گداز بنا ڈالے گی جو کہ نقصان دہ ہے۔

(iii)۔ 16 سے 20 سال کی عمر تک ریاضی، تاریخ سائنس اور دیگر مضامین پڑھائے جائیں لیکن مضامین طالبِ علم کے مزاج کے مطابق ہونے چاہئیں۔ طالبِ علم کو کوئی بھی ایسا مضمون پڑھنے پر مجبور نہ کیا جائے، جس سے اسے دلچسپی نہ ہو۔ کیوں کہ زبردستی کی تعلیم کا انسان کے ذہن پر کوئی بھی مثبت اثر نہیں ہوتا ہے۔

(iv)۔20 سال کی عمر میں ایک خاص اور سخت امتحان ہونا چاہیے۔اس امتحان میں صرف قلیل تعداد میں ایسے طالب علم پاس کرنا چاہئیں جو کہ ذہین، محنتی اور تعلیم سے لگاؤ رکھتے ہوں، جو اس امتحان میں فیل ہو جائیں، انھیں تجارت، زراعت، صنعت اور کلرکی وغیرہ کے شعبوں میں بھیجنا چاہیے تا کہ وہ ملک کی معیشت کے لیے خدمات سر انجام دے سکیں۔

(v)۔یہ مشکل امتحان پاس کرنے والے مزید 10 سال کے لیے جسمانی، ذہنی اور اخلاقی تربیت حاصل کریں گے۔

(vi)۔30 سال کی عمر میں ایک اور سخت امتحان ہو گا جو پہلے کے مقابلے میں کافی دشوار ہو گا۔اس امتحان میں فیل ہونے والوں کو انتظامی و فوجی عہدے دیئے جائیں۔

(vii)۔یہ امتحان پاس کر لینے والے چند خوش نصیب اور ذہین شاگردوں کو آئندہ 5 سال کے لیے فلسفہ پڑھایا جائے اور اس فلسفے کو زندگی سے ہم آہنگ کرنے کی تربیت دی جائے۔

(viii)۔35 سال کی عمر میں ہمارا شاگرد، ایک جوان اور بالغ نظر فلسفی بن چکا ہو گا، اب وہ زندگی اور اس سے متعلق نظریات پوری طرح سمجھ چکا ہو گا، لیکن اس کے لیے اب بھی ایک مشکل امتحان انتظار کر رہا ہے۔اب تک وہ صرف نصابی تعلیم حاصل کر رہا تھا۔اب اسے اس تعلیم کو آزمانے کا موقعہ دینا چاہیے۔

کسی سفارش کے بغیر اسے زندگی کے مختلف شعبوں میں اپنا آپ منوانا چاہیے۔یہاں اس کا مقابلہ چالاک تاجروں اور مکار لوگوں سے ہو گا۔اسے اپنی حاصل کردہ تعلیمات کو آزمانا ہے۔کردار کی پختگی، ذہانت اور محنت کا ثبوت دینا ہو گا۔اپنی محنت سے اپنا رزق حاصل کرنا ہو گا۔یہاں زندگی کی تلخ اور بے رحم حقیقتوں کے سوا اس کا کوئی استاد نہ ہو گا۔یہ سلسلہ 15 سال تک چلے گا۔ان 15 سالوں میں کئی لوگ فیل ہوں گے۔یہ اپنی تعلیمات کو زندگی کے حقائق سے ہم آہنگ نہ کر سکیں گے اور یوں حکمران بننے سے محروم رہ جائیں گے۔

(ix)۔جو لوگ اس آخری امتحان سے بھی گزر جائیں گے۔وہ یقیناً 50 سال کے سنجیدہ ذہین، محنتی، زندگی کے کڑوے کسیلے حقائق سے آشنا، دانش ور فلسفی ہوں گے جو کہ حکمران بننے کے لیے موزوں اور تیار ہوں گے۔

افلاطون کے نزدیک جمہوریت کا مطلب ووٹ حاصل کرنا نہیں ہے بلکہ جمہوریت کا مطلب حکمران کی کرسی تک پہنچنے کے لیے ہر ایک کو یکساں مواقع ملنا ہے۔اس کے طے کردہ دشوار اور

طویل طریقہ کار میں ہر ایک کو یہ موقعہ ملتا ہے اور ہر ایک اپنی صلاحیتوں کے مطابق اپنی منزل تک پہنچتا ہے۔ اس طریقہ کار میں حکمران کا بیٹا حکمران نہیں ہوتا، بلکہ اسے بھی ان سارے امتحانات سے گزرنا پڑتا ہے۔ اگر وہ ناکام رہتا ہے اور کسی غریب کا بچہ کامیاب ہو جاتا ہے تو اسے حکمرانی کا موقعہ ملے گا۔

یہ فلسفی حکمران، پارلیمنٹ، عدلیہ اور انتظامیہ تینوں کے امور سرانجام دیں گے اور اس بات کو یقینی بنائیں گے کہ ہر شہری کو آزادی کے ساتھ زندگی گزارنے کا حق ملے۔

اخلاقیات اور نیکی

''اخلاقیات فلسفے کی وہ شاخ ہے، جو کہ ہمیں یہ سمجھنے میں مدد دیتی ہے کہ زندگی میں کیا غلط اور کیا صحیح ہے؟ اور ان سوالات کے جوابات کسی رسم ورواج یا ایمان کی بجائے عقل اور دلائل کے ذریعے حاصل کرنے کے لیے اصرار کرتی ہے۔''(1)

اخلاقی اقدار ہر دَور میں بدلتی رہی ہیں، کسی زمانے کی اخلاقی قدریں، تاریخ کے کسی دوسرے دَور میں اس کے بالکل متضاد رہی ہیں۔ ایک دَور کی نیکی کو دوسرے دَور میں بدی یا کمزوری سمجھا گیا ہے یا سرے سے خارج ہی سمجھا گیا۔ بلکہ کبھی کبھی تو یوں بھی ہوا ہے کہ دنیا کے ایک خطے میں کسی عمل کو نیکی کہا گیا تو اسی عمل کو تاریخ کے اسی دَور میں دنیا کے کسی دوسرے حصے میں بدی سمجھا گیا اور اس کی مزاحمت کی گئی۔

اپنے استاد کی مانند افلاطون نے بھی نیکی اور بدی پر تفصیلی بحث کی ہے۔ ''اس کی اخلاقیات (Eudaemonistic) ہے، جن کا مقصد یہ ہے کہ اعلیٰ انسانی نیکی کی منزل پر پہنچ کر ہی انسان کو سچی خوشی میسر ہو سکتی ہے۔''(2)

افلاطون کی نگاہ میں انسان کی زندگی کا مقصد اعلیٰ اخلاقی اقدار کا حصول ہے، کیوں کہ نیکی انسان کو خوشی عطا کرتی ہے۔ افلاطون کے زمانے میں بھی بے شمار سوفسطائی موجود تھے، جن کا نظریہ تھا کہ نیکی نامی کسی شے یا قدر کا کوئی وجود نہیں ہے۔ صرف ذاتی مفاد اور خودغرضی ہی نیکی ہے۔ لہٰذا سوفسطائی کہا کرتے تھے کہ جس عمل سے عمل کرنے والے کو فائدہ پہنچے وہی نیک عمل ہے۔ بھلائی صرف دوستوں کے ساتھ کی جائے۔ دشمنوں کے ساتھ نیکی کرنا بے وقوفی ہے، نیکی کے متعلق ان کا اندازِ فکر شخصی (Subjective) تھا۔

---

(1)-Ethics: World Book Multimedia Encyclopedia.

(2)-Copleston S.J. Valume:1, Page:216.

افلاطون نے سوفسطائیوں کے نیکی سے متعلق سارے نظریات کو رد کر دیا اور نیکی کی معروضی سچائی (Objective Reality) کا تصور دیا۔ یعنی نیکی بذاتِ خود ایک سچائی ہے۔ نیک عمل، نیک ہے پھر خواہ یہ کسی کی غرض اور مفاد کی تکمیل کرے یا نہیں مثلاً سچ بولنا ایک اعلیٰ اخلاقی قدر ہے لہٰذا سچ بولنا چاہیے۔ خواہ یہ سچ بولنے والے کے مفاد میں ہو یا کہ نہیں۔ سوفسطائی کہتے تھے کہ نیکی کسی دوسرے مقصد یا مفاد یا خوشی کے حصول کی خاطر کرنی چاہیے۔ افلاطون نے اسے رد کرتے ہوئے کہا کہ نیکی خود ایک مقصد اور منزل ہے لیکن نیکی ہے کیا؟ افلاطون اس کا جواب دیتا ہے۔

نیکی اس درست عمل کا نام ہے جس کی بنیاد یا محرک نیکی کا وہ شعور ہو، جس کی بنیاد عقل (Reason) پر ہے۔[1]

باالفاظ دیگر اصل نیکی، نیکی کی وہ تفہیم ہے جس کی بنیاد عقل پر ہو۔ سوچے سمجھے بغیر نیکی کرنا یا نیکی کی ماہیت کو سمجھے بنا، نیکی کرنا بھی نیکی ہی ہے، لیکن افلاطون اسے ''تقلیدی نیکی'' کہتا ہے، جس کی حیثیت ثانوی اور معمولی ہے۔ اس بات کو ذیل کی مثال کے ذریعے واضح کیا جاسکتا ہے:

الف روزانہ ایک پہاڑ پر دو روٹیاں رکھ آتا ہے۔ اس پہاڑ کے نزدیک ایک بوڑھی عورت رہتی ہے، جو یہ روٹی لے جا کر کھا لیتی ہے۔ ایسا کرنے سے مقصود اس بے چاری عورت کا پیٹ بھرنا ہے۔ الف کو یہ عمل کرتا دیکھ کر 'ب' بھی اس پہاڑ پر ہر روز دو روٹیاں رکھنا شروع کر دیتا ہے۔ یہ روٹیاں بھی اسی عورت کے کام آتی ہیں، مگر 'ب' کو اس کا علم نہیں ہے اور نہ ہی اسے اس کی پروا ہے کہ وہ روٹیاں کہاں جاتی ہیں۔ وہ ایسا صرف الف کی تقلید میں کرتا ہے۔ ایسا کرنے سے 'ب' بھی نیکی کرتا ہے لیکن اسے اس کا ادراک نہیں ہے۔ لہٰذا اس نیکی کی حیثیت ثانوی ہے۔[2]

افلاطون کی نظر میں حقیقی نیکی کے چار اجزاء ہیں:

۱۔ عقل	Wisdom
۲۔ ہمت	Courage
۳۔ اعتدال	Moderation Temprance
۴۔ انصاف	Justice

جس انسان میں عقل، ہمت، معتدل مزاجی اور ان تینوں کا امتزاج ہوگا۔ وہی صحیح طور پر

---

(1)-Copleston S.J Volume:1, Page:219.

(2)-The life of greece by: Will Durramt, Page:517.

نیکی کر سکتا ہے اور نیکی سے صحیح معنوں میں تسکین اور سچی خوشی حاصل کر سکتا ہے۔

نیکی اور اس کی تفہیم انسان کو حقیقی اور سچی خوشی سے روشناس کراتی ہیں۔ کیوں کہ نیکی کا لازمی نتیجہ خوشی ہی ہے۔ خوشی نہ صرف نیکی کرنے والے کو نصیب ہوتی ہے بلکہ جس کے ساتھ نیکی کی جائے اسے بھی خوشی ملتی ہے اور معاشرے میں بھی ایک صحت مند فضا اور توازن پروان چڑھتا ہے۔

آگاہی یا علم

''آگاہی کا مطالعہ (Epistemology) فلسفے کی وہ شاخ ہے جس کے تحت آگاہی یا علم کی ماہیت، ممکنات، ان کا دائرہ، ان کی صداقت اور ان کے ماخذ وغیرہ پر بحث کی جاتی ہے۔''(1)

افلاطون سے قبل فلسفیوں کے ہاں علم کے بابت کافی بحث ہو چکی تھی۔ پروٹاگورس نے علم کے متعلق یہ نظریہ دیا تھا کہ ''علم صرف حواس کے ذریعے ہی حاصل کیا جا سکتا ہے۔'' دیگر الفاظ میں ہم جو کچھ سنتے، دیکھتے، چکھتے، سونگھتے یا چھوتے ہیں اس عمل کو علم کہتے ہیں۔ حواسِ خمسہ جو کچھ محسوس (Sense-Perception) کرتے ہیں۔ یہی قطعی علم ہے۔

افلاطون نے پروٹاگورس کے اس نظریے کو رد کیا اور دلائل سے ثابت کرنے کی کوشش کی کہ دماغ حواسِ خمسہ سے بھی برتر شے ہے۔

سوفسطائیوں نے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی تھی کہ حقیقت کا بذاتِ خود کوئی وجود نہیں ہے، مگر یہ ایک داخلی کیفیت ہے۔ دوسرے لفظوں میں ہر انسان جو کچھ محسوس کرتا ہے اس کے لیے یہ حقیقت ہے یعنی حقیقت (Subjective) ہے اور اس کا کوئی بھی معروضی وجود (Objective Reality) نہیں ہے۔ ہر انسان کے پاس اپنا اپنا سچ ہے۔

افلاطون نے اس نظریے کو رد کرتے ہوئے کہا کہ یہ کس طرح ممکن ہے کہ ہر انسان کے پاس اپنی اپنی سچائی ہو۔ ایک شے اگر گول ہے تو وہ ہر کسی کے لیے گول ہی ہونی چاہیے، لیکن اگر وہ کسی کو چوکور دکھائی دیتی ہے تو تب بھی اس شے کی گولائی پر کوئی اثر نہیں پڑے گا۔ انسانی حواس انسان کو اکثر دھوکہ دیتے ہیں اس لیے ان کی دی گئی آگاہی کو مکمل حقیقت نہیں کہا جا سکتا مثلاً کسی شے کو نزدیک سے دیکھا جائے گا تو وہ بڑی دکھائی دے گی اور اگر دُور سے دیکھا جائے گا تو وہ چھوٹی دکھائی دے گی، اب اگر حواس پر یقین کیا جائے تو ایک ہی شے چھوٹی بھی ہے اور بڑی بھی، مگر یہ سراسر غلط ہے۔

---

(1)-The Oxford companion to Philosopy by:Ted Honderich Page:242.

حواس کے ذریعے حاصل کیا گیا علم، انسان کی رائے (Opinion) تو بن سکتی ہے مگر علم نہیں۔

یہاں افلاطون ''رائے'' کو ''علم'' سے بہت کم تر جانتا ہے، جو سچ بھی ثابت ہو سکتی ہے لیکن اکثر یہ ناقص ثابت ہوتی ہے، لہٰذا درست آگاہی اور سچا علم حواس کی بجائے دماغ کے ذریعے حاصل ہوتا ہے۔ حواس تو صرف خام معلومات (Data) پہنچانے کا ذریعہ ہیں اور اصل کام تو دماغ کا ہے جو اشیاء کے بابت ''عقلی استدلال'' کے ذریعے آگاہی حاصل کرتا ہے۔

افلاطون رائے (Opinion) اور عقیدہ (Belief) دونوں کو رد کرتا ہے۔ کیوں کہ دونوں اشیاء کے متعلق داخلی (Subjective) رویہ رکھتے ہیں جب کہ حقیقت خارجی اور معروضی (Objective) ہے۔

فلسفہ خیالات (Theory of Iedeas)

افلاطون یہ ثابت کرتا ہے کہ حقیقت معروضی ہے جس کا ذاتی رائے یا عقیدے سے کوئی بھی تعلق نہیں ہے۔ صحیح خیال وہ ہے جو کہ اس معروضی سچائی سے مطابقت رکھتا ہو جو کہ اپنا الگ وجود رکھتی ہے۔

میرے ذہن میں یہ خیال آتا ہے کہ میرے سامنے کنواں ہے۔ اگر وہاں واقعی کنواں ہے تو میرا ''خیال'' درست ہے وگرنہ غلط۔ افلاطون اس سے یہ مطلب اخذ کرتا ہے کہ دماغ کے اندر کنویں کا خیال یا تصور اصل کنویں کی نقل ہے۔ یوں ذہن کے اندر پیدا ہونے والا ہر خیال کسی نہ کسی معروضی حقیقت کی نقل ہے۔

برٹرینڈ رسل کے بقول ''افلاطون کا فلسفہ خیالات بہت زیادہ اہمیت کا حامل ہے، جو کہ منطقی ہونے کے ساتھ ساتھ مابعد طبیعاتی بھی ہے۔۔۔''[1]

رسل؛ افلاطون کے فلسفے کی تشریح کرتے ہوئے کہتا ہے کہ خیالات یا تصورات ہی اشیاء کو معنی بخشتے ہیں، جب ہم کسی بلی کا ذکر کرتے ہیں تو ہمارے ذہن میں اس کا خاکہ اُبھرتا ہے، جس کی چار ٹانگیں، ایک دُم اور ایک منہ ہوتا ہے۔ اب اگر کسی بلی کی ایک ٹانگ کٹی ہوئی ہے تو بھی بلی کے تصور پر کچھ فرق نہیں پڑے گا اور تصور میں بلی کی چار ہی ٹانگیں ہوں گی۔ ایسا اس لیے بھی ہے کہ موجودہ عالم سے بالا ایک ''عالم خیالات'' بھی ہے۔ جہاں ہر شے کا ایک ''مثالی تصور'' (Ideal Image) ہے جو کہ ہر لحاظ سے مکمل ہے۔ یہ مثالی تصورات ازل سے ہیں اور ابد تک رہیں گے۔ بلی کا تصور بھی

(1)-History of Western Philosphy By:B. Russel, Page:136.

عالمِ خیالات (World of Ideas) میں ایک مثالی شبیہہ میں موجود ہے، جس کا مشاہدہ ہماری روح کر چکی ہے۔

افلاطون کہتا ہے کہ انسان کی روح جسم میں سرایت کرنے سے پہلے عالمِ خیالات کا مشاہدہ کر چکی ہے، جہاں ہر چیز اپنی مکمل خوب صورتی اور مثالی شبیہہ (Perfection) میں ہے۔

جسم میں داخل ہونے کے بعد روح سے عالمِ خیالات کی باتیں فراموش ہو جاتی ہیں، لیکن اس کے تحت الشعور میں ان کا غیر تحریری (Faint) تصور موجود رہتا ہے، جب انسان اِس دنیا میں کوئی شے دیکھتا ہے تو اسے اس چیز کی مثال (Idea) یاد آتی ہے، اگر وہ کوئی گھوڑا دیکھتا ہے تو اسے ''مثالی گھوڑا'' یاد آتا ہے، پھر لاشعوری طور پر اس گھوڑے کا مثالی گھوڑے سے موازنہ کرتا ہے، اگر اِس دنیا کا گھوڑا اُس گھوڑے جیسا ہے تو بلاشبہ یہ گھوڑا انتہائی خوب صورت ہے۔

اس طرح افلاطون، اس دنیا میں ہر شے کو عالمِ خیالات میں موجود اشیاء کی نقل کہتا ہے اور ان اشیاء کے درست علم کو صرف اسی کے صحیح تصور کے علم سے وابستہ کرتا ہے، عالمِ خیالات میں موجود تصورات (Concepts) مادی (Material) نہیں بلکہ تجریدی (Abstracts) ہیں۔ لہٰذا ان کو سمجھنے کے لیے حواسِ خمسہ کی بجائے صرف عقلی استدلال (Reason) پر ہی انحصار کیا جا سکتا ہے۔

افلاطون پہلے تو خود بھی شاعر اور فن کار تھا، مگر بعد ازاں اس نے فنونِ لطیفہ کو فضول چیز قرار دے دیا سوائے تھوڑی بہت موسیقی کے۔ اس کے خیال کے مطابق، جس طرح یہ دنیا اصل دنیا کی نقل ہے اور مصوری دوبارہ اس دنیا کی نقل ہے، یعنی مصوری نقل کی بھی نقل ہے اسی لیے ناقص اور فضول ہے۔

افلاطون کا کہنا ہے کہ دائمی اور ہمیشہ قائم رہنے والی صرف اشیاء کے تصورات ہیں، جو عالمِ خیالات میں موجود ہیں۔ باقی ہر شے محض نقل ہے، فانی ہے، نگاہ کا فریب ہے، جس طرح درخت کا سایہ ہمیں نظر تو ضرور آتا ہے مگر اس کا اپنا کوئی وجود نہیں ہے، وہ صرف سایہ ہے، نقالی ہے اور فانی ہے۔

افلاطون کی وفات

افلاطون نے اپنے جیون کے 40 سال اکیڈمی[1] کے لیے وقف کیے، جہاں وہ ہر وقت اپنے شاگردوں اور مہمانوں کے ساتھ بحث مباحثے کرتا رہتا تھا۔ اس کے شاگردوں سمیت کئی لوگوں

(1)۔ اکیڈمی: افلاطون نے اپنے اسکول کا نام ''اکیڈمی'' یونان کے ایک افسانوی ہیرو اکادی موس (Acade Mus) کے نام پر رکھا۔ جوسٹن گارڈر

نے اس کے فلسفے پر تنقید کی لیکن افلاطون نے کبھی بُرا نہ منایا۔ وہ کہا کرتا تھا کہ کوئی بات نہیں اگر میرا فلسفہ خاص طور پر ''ریاست'' کے متعلق کلی طور پر قابلِ عمل نہیں ہے تو بھی یہ بہتر ہے کیوں کہ انسان ہی وہ جانور ہے جو خواب دیکھتا ہے لہٰذا میرا کام ایک مکمل اور مثالی ریاست کا خواب دکھانا ہے۔

80 سالہ بوڑھا فلسفی ہمہ وقت اپنے شاگردوں میں گھرا رہتا تھا۔ نوجوانوں میں بیٹھتا تو اپنے رویے سے بوڑھا ہرگز محسوس نہ ہوتا۔ وہ نوجوانوں کے ساتھ نواجون بن بیٹھتا تھا۔

ایک دن افلاطون کے ایک شاگرد کی شادی تھی۔ افلاطون کو بھی دعوت دی گئی اور اسے درمیان میں بٹھایا گیا لیکن افلاطون نے فرمائش کی کہ مجھے کسی کونے میں کرسی ڈال دو، تم لوگ بے شک خوشیاں مناؤ۔ میں تمہیں دیکھ دیکھ کر لطف اندوز ہوتا رہوں گا۔

اسے ایک کونے میں کُرسی پر بٹھا کر سارے دوست کھیل تماشے میں مصروف ہو گئے اور وقفے وقفے سے آ کر اس کی خیریت دریافت کرتے رہے۔

فجر کے قریب شادی کے ہنگاموں سے فارغ ہو کر سارے شاگرد افلاطون کے پاس آئے تو دیکھا کہ اس کے چہرے پر گہری اور پُرسکون مسکراہٹ ہے اور وہ ابدی نیند سو رہا ہے۔ شاگردوں نے افلاطون کو جگانے کی بہتیری کوشش کی مگر ان کا استاد تو اپنے استاد سقراط کی طرف جا چکا تھا۔

اگلے روز ایتھنز کے سارے باسی افلاطون کو اس کی آخری آرام گاہ تک الوداع کہنے آئے اور یہ اعتراف کرنے لگے کہ روشنی کبھی فنا نہیں ہوتی، جب تک دُنیا رہے گی، افلاطون کا نام باقی رہے گا۔

ارسطو

ارسطو کی پیدائش سن 384 قبل مسیح میں مقدونیہ کے ایک شاہی طبیب کے ہاں ہوئی۔ والد کے انتقال کے بعد ارسطو کی پرورش کی ذمہ داری اس کے ایک قریبی عزیز نے اپنے سَر لے لی۔ ارسطو کو 17 سال کی عمر میں تعلیم حاصل کرنے کے لیے ایتھنز بھیج دیا گیا۔

ایتھنز پہنچ کر ارسطو نے افلاطون کی اکیڈمی میں داخلہ لیا۔ یہاں اس نے اپنی زندگی کے انتہائی اہم 20 سال تحصیل علم میں گزارے۔

ارسطو کے روپ میں افلاطون کو نہایت مشکل شاگرد ملا، ارسطو اپنے استاد سے بہت بحث کیا کرتا تھا اور اکثر افلاطون سے اختلاف کیا کرتا مگر یہ اختلاف ذاتی نہیں بلکہ نظریاتی ہوتا تھا۔ ذاتی طور پر وہ افلاطون کی بہت عزت کرتا تھا اور جب تک افلاطون زندہ رہا ارسطو اکیڈمی سے ہی وابستہ رہا۔

اکیڈمی میں ارسطو ایک محنتی اور بے باک شاگرد کی حیثیت سے مشہور ہوا وہ رات گئے تک دیے کی روشنی میں مطالعہ اور خوب غور وفکر کرنے کے بعد صبح آ کر اپنے استاد سے مباحثہ کیا کرتا اور واضح الفاظ میں اختلاف رائے کا اظہار کرتا۔

اکیڈمی کو خیر باد کہنے کے بعد ارسطو نے درس وتدریس کا سلسلہ شروع کیا اور اثار نیوس کے حکمران کی بھتیجی سے شادی کی۔

سن 343 قبل مسیح میں ارسطو کی آبائی ریاست مقدونیہ کے بادشاہ فلپ نے اسے دعوت دی کہ آ کر اس کے بیٹے سکندر کو تعلیم دے۔

مستقبل کے سکندرِ اعظم نے 13 سال کی عمر میں ارسطو کا شاگرد ہونے کا اعزاز حاصل کیا۔
مؤرخین کے مطابق سکندر کے ذہن پر ارسطو کی گہری چھاپ تھی۔ سن 336 قبلِ مسیح میں سکندر کی تخت نشینی کے بعد ارسطو مقدونیہ سے رخصت ہوا۔ وہ کچھ عرصہ اسیگرا میں رہنے کے بعد واپس ایتھنز پہنچا اور درس وتدریس اور تحقیق کا کام شروع کیا۔ اس نے اپنے مکتب میں باقاعدہ تجربہ گاہ اور کتب خانہ قائم کرنے کے علاوہ لیکچر ہال تیار کروائے۔

ایک روایت یہ بھی ہے کہ سکندرِ اعظم نے ارسطو کو سائنسی وطبی تحقیق کے لیے 1000 غلام دیئے تھے، جو دنیا کے کونے کونے میں جا کر ہر جانور اور ہر پودے کے نمونے حاصل کر کے لائے۔
علاوہ ازیں سکندرِ اعظم نے ارسطو کو ایک خطیر رقم پیش کی تھی، جس سے ارسطو نے دنیا کے ہر خطے سے قلمی نسخے منگوا کر مطالعہ کیا۔

سن 323 قبلِ مسیح میں سکندر اعظم کی وفات ہوئی۔ دنیا فتح کرنے کے جنوں میں سکندر نے مرنے سے پہلے یونان کی چھوٹی ریاستیں فتح کیں۔ یہی وجہ تھی کہ ان ریاستوں خصوصاً ایتھنز کے مکین سکندرِ اعظم سے نالاں تھے۔ سکندر کی وفات کے بعد ایتھنز کے باشندوں نے مقدونیہ کے سیاسی اقتدار کے خلاف بغاوت کر ڈالی اور سکندر کے حامیوں کو شکست دی۔
ایتھنز کے مکینوں کو سکندرِ اعظم اس کی فوج اور باقیات سے چڑ تھی، سو وہ سکندر کے استاد کو کیسے برداشت کر سکتے تھے؟
ارسطو نے ہَوا کا رُخ سمجھ لیا اور ایتھنز سے کوچ کرتے وقت کہا "مَیں ایتھنز والوں کو دوبارہ موقع نہیں دوں گا کہ وہ سقراط کی طرح مجھے بھی ختم کرنے کا گناہ کریں۔"
ایتھنز کو چھوڑنے کے بعد ارسطو نے چالسس شہر میں رہائش اختیار کی، جہاں اس کی والدہ کی زمینیں وغیرہ تھیں۔

سن 322 قبل مسیح میں اس عظیم فلسفی اور طبیبِ اعظم پر جان لیوا بیماری کا حملہ ہوا، جس نے اس کی زندگی کا چراغ گُل کر دیا۔
ارسطو نے اپنی زندگی میں مندرجہ ذیل کتابیں لکھیں:

1-Evdemous, or on the Soul.

2-Protrepticus.

3-Physics.

4-Meta-Physics.

5-On Philosophy.
6-Endemian Ethics.
7-Politics.
8-De Caelo.
9-De Genes pianet corruptione.
10-Organon.
11-The Categories.
12-De interpsetrtion.
13-Prior and Poster anolysis.
14-Work on natrual Philosopy, Natural Science & Psychology etc.
15-The Meteriology.
16-The Histories of animals (Ten Books)
17-Magne Morelia.
18-Nicomacheam Ethics (Ten Books)
19-Work on aesthetics, History & literature:The Rhetorics, the Poetics etc.
20-Collection of 158 constititions.
21-Dozen of Books on medicine, Biology, Zoology, Botany, Phiworoply, dream life, death, etc, etc.

اگر ارسطو کی جملہ کتابوں، کارناموں اور تحقیق پر محض چند تعارفی جملے لکھے جائیں تو بھی کئی کتابوں کا مواد بن جائے گا۔ یہاں ارسطو کے صرف چند انتہائی اہم اور مشہور کاموں کا مختصر احوال دیا جاتا ہے۔

1)۔ مابعد الطبیعات (Meta-Physics)

مابعد طبیعات اس فلسفیانہ مکالمے کو کہہ سکتے ہیں جس کا مقصد حقیقتِ مطلق کی ماہیت معلوم کرنا ہو۔[1]

مابعدِ طبیعات کے لغوی معانی اس شے یا علم کے ہیں جو طبیعات کے بعد آئے۔ ارسطو نے پہلے طبیعات کے موضوع پر کتابیں لکھیں۔ ان کتابوں کے بعد جو کچھ لکھا اسے کوئی مخصوص عنوان نہ دیا، اس لیے ان تحریروں کو مابعدِ طبیعات کہا جانے لگا۔

ارسطو ایک مشکل پسند فلسفی ہے اور اس کی مابعد طبیعات کو سمجھنا بھی کافی محنت طلب اور

(1)-Encyclopedia Britannica.

دُشوار ہے۔ بوعلی سینا ایک جگہ لکھتا ہے کہ اس نے ارسطو کی مابعدِ طبیعات کو 40 دفعہ پڑھا مگر سمجھنے سے قاصر رہا۔[1]

یہاں ارسطو کی مابعدِ طبیعات کا خلاصہ پیش کیا جاتا ہے۔ ارسطو کے مابعد طبیعاتی فلسفے میں چار موضوعات پر بحث کی گئی ہے۔

(۱)۔مایہ	Substance
(۲)۔سبب	Causality
(۳)۔موجودات کی ہیئت	Nature of beings
(۴)۔خدا کا وجود	Existance of God

طبیعات ان اشیاء کا مطالعہ کرتی ہے جو کہ:

(۱)۔مادے سے الگ نہیں ہوسکتیں۔

(۲)۔یہ اشیاء حرکت کرتی ہیں۔

مابعد طبیعات جس کا مطالعہ کرتی ہے وہ:

(۱)۔مادے سے الگ اپنا وجود رکھتی ہے۔

(۲)۔یہ ہر قسم کی نقل وحرکت سے بالاتر ہے یعنی (Absolutely motionless) ہے۔

کائنات کی ہر ساکت شے کو حرکت میں لانے کے لیے کسی نہ کسی قوت کی ضرورت پڑتی ہے۔ یہ طاقت خارجی ہوسکتی ہے اور اس میں پوشیدہ (Potentia) بھی ہوسکتی ہے۔ اس طاقت کے علاوہ کوئی بھی شے ساکت حالت سے متحرک حالت میں نہیں آتی۔ اسی طرح یہ کائنات بھی ابتدا میں ساکت تھی۔ اس میں کسی بھی طرح کی کوئی بھی حرکت نہیں تھی۔ نہ سورج، چانداور ستارے تھے۔ نہ ہی زمین پر کوئی جان دار موجود تھا۔ بس ایک لامحدود اور ساکت مادے کا ڈھیر تھا۔

اس ساکت مادے کو جب متحرک کیا گیا تو یہ کائنات وجود میں آئی۔ اس مادے کو کس نے متحرک کیا؟ ارسطو کا کہنا ہے کہ اس مادے کو متحرک کرنے والے کو "اوّلین محرک" (First mover) کہہ سکتے ہیں۔ یہ اوّلین محرک بذاتِ خود تو ساکت محض ہے، لیکن یہ دائمی حرکت کا باعث ہے۔ (جدید سائنس نے Big Bang کی تھیوری دی ہے جو کہ ارسطو کے فلسفے کی تصدیق کرتی ہے)

ارسطو وجود کی تین قسمیں بتاتا ہے:

---

(1)-Copleston S.J. Vol:1, Page:287.

(۱)۔ وہ وجود جسے محسوس تو کیا جا سکتا ہے مگر وہ فنا نہیں کیا جا سکتا۔ مثلاً سورج، چاند، ستارے وغیرہ
(۲)۔ وہ وجود جس کو (حواسِ خمسہ سے) محسوس کیا جا سکتا ہے اور وہ فانی ہے، مثلاً حیوانات، نباتات وغیرہ
(۳)۔ وہ وجود جس کو نہ محسوس کیا جا سکتا ہے اور نہ ہی کبھی ختم ہو سکتا ہے۔

ارسطو وجود کی اس تیسری قسم کو ''خدا'' کہتا ہے، جو کہ اس کائنات کا اوّلین محرک ہے اور خود کسی قسم کے محرک سے بالاتر ہے۔ بالفاظ دیگر جیسا کہ وہ ہر طور سے ''مکمل'' ہے لہٰذا اس میں کسی بھی قسم کی تبدیلی یا حرکت کا کوئی بھی جواز نہیں ہے، کیوں کہ تبدیلی یا حرکت کسی ضرورت یا کمی کو پورا کرنے کے لیے کی جاتی ہے۔

ارسطو کا خدا اپنی ذات کا مکمل ادراک رکھنے والی ہستی ہے۔ اسے کبھی بھی کچھ بھی کرنے کی ضرورت محسوس نہیں ہوتی اس میں کسی بھی قسم کی کوئی بھی خواہش پیدا نہیں ہوتی۔

ارسطو کا خدا کوئی بھی چیز تخلیق نہیں کرتا۔ بلکہ صرف اس کی حکمت کا اوّلین محرک ہے۔ بالکل اسی طرح جیسے کسی محبوب ہستی کا اشارہ عاشق کے لیے محرک ہوتا ہے۔

وہ جیسا کہ ہر حرکت سے بالاتر ہے، اس لیے وہ خوشی، غمی اور ناراضگی وغیرہ جیسے جذبات سے بھی بے نیاز ہے۔ اس کی پرستش کرنا یا نہ کرنا اس کے لیے دونوں برابر ہیں۔ ارسطو لکھتا ہے:

''وہ لوگ غلط ہیں جو کہتے ہیں کہ خدا سے دوستی ہو سکتی ہے، کیوں خدا ہماری محبت کا جواب محبت سے نہیں دے سکتا۔''(۱)

جیسا کہ خدا ایک غیر مادی وجود ہے۔ اس لیے وہ کوئی بھی مادی کام نہیں کرتا بلکہ صرف سوچتا ہے (یا خیال کرتا ہے) ''خدا صرف اور صرف اپنی ذات کے بارے میں ہی سوچتا ہے کیوں کہ اس کی ذات سے باہر کوئی بھی شے وجود نہیں رکھتی۔ اس کی ذات واحد ہے۔ اگر یہ سوچا جائے کہ وہ اپنی ذات سے ''باہر'' کے متعلق بھی سوچتا ہے تو پھر اس کا مطلب یہ ہوگا کہ اس کی ذات کی حد ہے اور پھر اس حد سے باہر کوئی دوسرا وجود بھی ہے۔(۲)

ارسطو کا خدا، غیر مادہ ہستی ہونے کے باعث محض ایک ''خیال'' ہے اور وہ سوچ بھی صرف ایک خیال کے متعلق ہی سکتا ہے۔ دوسرے لفظوں میں خدا ''خیال کا خیال'' ہے۔(۳)

یہاں ایک سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اوّلین محرک نے اسی ساکت مادے کو متحرک کیوں

(1)-Magn a Moralia By: Aristotle, Page: 1208.
(2)-Copleston S.J, Vol: 1, Page: 316.
(۳)۔ میں تاں ہک خیال ہاں، بل ساں نال خیال دے (بچل سرمست)

کیا؟ بالفاظ دیگر کہ اس کائنات کا مقصد کیا ہے؟ ارسطو جواب دیتا ہے۔

''جب کوئی سنگ تراش ایک مجسمہ بناتا ہے تو سنگِ مرمر یا پتھر یا چھینی اور شیشے کے وار کرتا رہتا ہے اور آخر کار اس پتھر میں سے ایک خوب صورت مجسمہ برآمد ہوتا ہے۔ یہ مجسمہ ہو بہو ویسا ہی ہوتا ہے، جیسا کہ سنگ تراش نے تصور کیا ہوتا ہے۔''(1)

خدا اس جہاں کو محرک مہیا کر کے، ارتقائی مراحل سے گزار کر بالکل اپنے جیسا بنانا چاہتا ہے۔ دنیا کی ہر وہ شے جس میں زندگی ہے، خدا کے متعلق کچھ نہ کچھ ادراک رکھتی ہے اور اس سے محبت کرتی ہے اور آخر کار ''تکمیل شدہ'' بننے کے لیے مسلسل ارتقائی مراحل سے گزرتی رہتی ہے۔ دوسرے لفظوں میں اس کائنات کا مقصد ارتقائی منازل طے کر کے ''خدا'' جیسا بننا (خدا میں ضم ہو جانا) ہے۔

خوشی اور اخلاقیات

انسان جو بھی عمل کرتا ہے یا جو بھی نقل و حرکت کرتا ہے، ان کے پیچھے یقیناً کوئی نہ کوئی مقصد ہوتا ہے۔ ارسطو کہتا ہے، اگر گہرائی سے دیکھا جائے تو ہر عمل کا حتمی مقصد ''خوشی'' یا ''مزا'' حاصل کرنا ہوتا ہے۔ مثلاً اگر کوئی انسان ورزش کرتا ہے تو اس کا مقصد صحت مند رہنا اور صحت مند رہنے کا مطلب خوش رہنا ہے۔ اس لیے ورزش کا حتمی مقصد خوشی کا حصول ہے۔ اس طرح انسان کی دن رات کی اَن تھک محنت کسی نہ کسی مسرت ہی کی جستجو ہوتی ہے۔ کسی کے لیے دولت خوشی ہے تو کسی کے لیے صحت اور کسی کے لیے طاقت اور اقتدار وغیرہ۔

جیسا کہ خوشی کا حصول انسان کا سب سے بڑا مقصد ہے، لہٰذا اس بات کی ضرورت محسوس کی گئی کہ خوشی کے حصول کی خاطر انسان کو کوئی ایسا قدم نہیں اُٹھانا چاہیے جو کسی دوسرے انسان کے لیے کسی عذاب یا پریشانی کا سبب بنے۔ دوسرے لفظوں میں کسی ایسے نظام کی ضرورت محسوس کی گئی جس سے ہر انسان کی خوشی کو تحفظ ملے۔ اس نظام کا نام اخلاقی ہے۔

ارسطو کا نظامِ اخلاق اس نکتے پر مشتمل ہے کہ خوشی کی طلب میں جو عمل یا کام کاج کیے جائیں ان کی بنیاد ''نیکی'' (Virtue) یا اچھائی پر ہونی چاہیے۔ یعنی یہ اعمال نسلِ انسانی کی انفرادی حتیٰ کہ اجتماعی بہتری کے لیے مناسب اور ضروری ہوں۔

نیکی وہ بنیادی چیز ہے، جس پر ارسطو کے اخلاق کی پوری عمارت کھڑی ہے، لیکن آخر نیکی ہے کیا؟ ارسطو اس کا جواب دیتا ہے:

---

(1)-History of Western Philosophy By :Bertrand Russel Page :181

نیکی کسی بھی عمل کی دو انتہاؤں کی درمیانی صورتِ حال کا نام ہے۔ یہ دونوں انتہائیں نیکی یا اچھائی کے برعکس ہیں اور ان کے نتائج بھی منفی ہیں۔ ان میں سے ایک انتہا، کسی بھی عمل کی زیادہ کثرت (Excess) ہے اور دوسری انتہا، اسی عمل کی بہت زیادہ کمی (Deficiency) ہے۔

ارسطو انتہا پسندی کے خلاف ہے اور اس کو نیکی کے برعکس اور برائی تصور کرتا ہے، کوئی شے اچھی ہے ہی اس صورت میں جب وہ درمیانی سطح کی ہے۔ وہ مثال دیتا ہے کہ اگر خود اعتمادی انتہا پر پہنچ جائے تو یہ ایک بے احتیاطی اور غیر ذمہ داری بن جائے گی، لیکن اگر یہ بالکل ختم ہو جائے تو انسان بزدل ہو جائے گا۔ یہ خود اعتمادی کی دو انتہائیں ہیں یعنی بے احتیاطی اور بزدلی یہ دونوں خراب اور منفی ہیں۔ ان دونوں کا درمیان نکالا جائے تو وہ ''ہمت'' ہو گا۔

ارسطو کے اس نظریے کو بہتر طور پر سمجھنے کے لیے پروفیسر نکولائی ہارٹ مین نے ذیل کا ڈایاگرام دیا ہے۔

Goodness
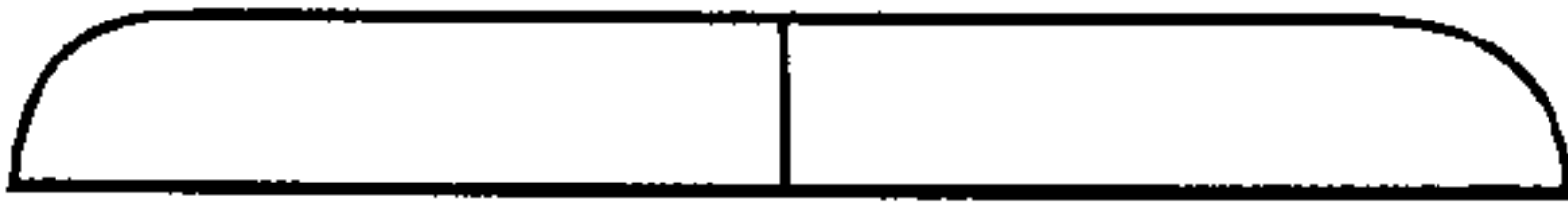
Deficiency　　Badness　　Excess

میانہ روی یا درمیانی طریقے کو عالموں نے سنہری اصول (Golden Principle of Mean) کہا ہے، جس کے تحت ارسطو نے نیک اعمال کی ایک طویل فہرست دی ہے، جس سے چند ایک کا یہاں لکھنا ضروری ہے۔

عمل/احساس Feeling/Action	کثرت Excess	میانہ روی Mean	کمی Deficiency
ا۔خوف	بزدلی	ہمت	بے حسی
۲۔رقم خرچ کرنا	فضول خرچی	سخاوت	کنجوسی
۳۔بڑے پیمانے پر عزت کا دعویٰ کرنا	احساسِ تکبر	خود اپنی عزت کرنا	بزدلی
۴۔غصہ	(طاقت کا) جنوں	بہادری	بے حسی
۵۔شرم	جھجک۔بزدلی	حیادار	بے شرمی

ارسطو کی اخلاقیات پر تحریر کی گئی جملہ کتب کا نچوڑ یہ ہے کہ انسانی خواہشات مزے اور خوشی کے گرد گردش کرتی ہیں لیکن خوشی کی منزل پر پہنچنے کا راستہ صرف اور صرف نیکی ہے۔ نیکی کے سوا کوئی

خوشی ممکن ہی نہیں ہے، جو انسان نیکی نہیں کرتا وہ خوش رہ ہی نہیں سکتا۔ نیکی کے بغیر خوشی حاصل کرنے کی کوشش، انسان کو محض وقتی ''مزا'' ہی دے سکتی ہے۔

''خوشی'' (Happiness) اور ''مزے'' (Pleasure) میں فرق ہے۔ مزا اکثر وقتی ہوتا ہے اور اس کے اثرات دیرپا نہیں ہوتے۔ مثلاً شراب کا مزا، نشہ اُترنے کے بعد ختم ہو جاتا ہے اور اس میں انسان کو کوئی بھی ''خوشی'' نہیں ملتی ہے۔ اسی طرح کھانے کا ذائقہ یا جنسی عمل کا مزا بھی محض وقتی ہوتا ہے، جس سے انسان کو دیرپا خوشی حاصل نہیں ہوتی لیکن کچھ لوگ ایسے بھی ہوتے ہیں جو خوشی کی بجائے مزے کے لیے جیتے ہیں۔ ارسطو ان کو ''غلامانہ سوچ'' کے مالک کہتا ہے۔ کیوں کہ غلام کا فعل اس کی منشاء کے مطابق نہیں ہوتا ہے۔ اسے مالک کے بتائے ہوئے کام کرنے سے کوئی خوشی نہیں ہوتی ہے اس لیے وہ صرف اور صرف ''مزے'' کے لیے کوئی ''عمل'' کرتا ہے۔

مسرت جو کہ ہر انسان کی اوّلین خواہش ہوتی ہے۔ صرف اس وقت نصیب ہوتی ہے جب انسان[1] ''اچھے عمل کرے'' اچھائی کے بغیر ہونے والے ہر عمل میں انسان کے لیے تکلیف اور عذاب ہے۔

ارسطو نے خوشی کی کئی اقسام بتائی ہیں، لیکن ان سب میں سرِ فہرست اور اعلیٰ خوشی وہ ہے جو انسان کو اپنے ''فکری حاصلات'' سے ہوتی ہے۔ ارسطو فلسفے کو خوب اور برتر خوشی دینے والی چیز سمجھتا ہے اور ''فلسفی کو سب سے زیادہ خود کفیل انسان'' سمجھتا ہے۔

ارسطو نے دوستی پر بھی بہت کچھ کہا ہے، اس کے خیال کے مطابق، دوستی بھی اچھائی اور نیکی ہے ''بہترین دوستی صرف 'اچھے' لوگوں کے درمیان ہی ہو سکتی ہے، یہ ناممکن ہے کہ کوئی انسان بہت سارے لوگوں کا دوست بن سکے۔'' کیا انسان خود اپنا دوست ہو سکتا ہے؟ ''ہاں صرف وہ جو ''اچھا'' اور نیک ہے، باقی (Wicked) انسان اکثر اپنے آپ سے نفرت کرتے ہیں۔ دوست مصیبت کے وقت کام آتے ہیں اور خوشی کے وقت، خوشی کو دُگنا کر ڈالتے ہیں۔''[2]

انسان جب اچھے دوست بناتا ہے تو دوسرے لفظوں میں یوں کہنا چاہیے کہ وہ اپنے آپ سے پیار کرتا ہے کیوں کہ دوست اپنے دوسرے وجود کا نام ہے۔

ارسطو نے دوستی کی مندرجہ ذیل اقسام بتائی ہیں:

(۱)۔ کارآمد دوستی: ''یعنی وہ دوست جو کام آسکیں۔''

---

(1)-Coplestoin Page:349.

(2)-Russel, Page:191.

(۲)۔ وہ دوست جو مسرت کا باعث بنیں، نوجوان لوگوں کی دوستی زیادہ تر اس قسم کی ہوتی ہے۔
(Young people live by feelings.)
(۳)۔ وہ دوستی جو اچھائی یا نیکی پر منحصر ہو۔ یہ دوستی اس وقت تک قائم رہے گی جب تک دوستوں میں نیکی اور بھلائی برقرار رہے گی۔

سیاست

ارسطو نے اپنے سیاسی نظریے کی وضاحت کے لیے ایک (Politics) سیاست نامی مقالہ لکھا، جس میں وہ اپنے استاد افلاطون سے اس بات پر متفق ہے کہ: ''فرد کی طرح ریاست بھی ایک بنیادی مقصد رکھتی ہے اور یہ بنیادی مقصد عوام کی بھلائی اور خوشی حالی ہے۔'' ارسطو کہتا ہے کہ اگر کسی کو ریاست کی ضرورت محسوس نہیں ہوتی تو وہ انسانیت کے درجے سے بہت بلند ہے یا پھر انسانیت کے درجے سے کم تر ہے، بالفاظِ دیگر صرف خدا اور جانور کو ریاست کی ضرورت نہیں ہے۔

اگر انسان کسی معاشرے اور ریاست کے بغیر رہتا ہے تو اس کی زندگی بالکل وحشی جانوروں کی سی ہوتی ہے۔ یہ ریاست ہی ہے جو وحشی کو انسان بنا کر اسے نیکی اور بھلائی کی تعلیم دیتی ہے اور نیکی کرنے کے مواقع بھی فراہم کرتی ہے۔

ارسطو، افلاطون کی مثالی ریاست سے متفق نہیں تھا اور اس نے اس کی سخت مخالفت کی ''کیمونزم فساد کرائے گا اور نا اہلی پھیلائے گا کیوں کہ لوگ ذاتی ملکیت کے مزے سے دست بردار نہ ہوں گے!''

ارسطو ریاست کی 6 اقسام بتاتا ہے، جن میں سے تین اصلی ریاست کی ہیں اور تین قسمیں ان کی بگڑی ہوئی شکلیں یا متضاد ہیں۔

ا۔ بادشاہت (Monarchy)

اس قسم کی حکومت میں بادشاہ اپنی صلاحیتوں، نیکی، ذہانت، بہادری، قانونی اور اخلاقی طریقوں سے حکومت کرتا ہے اور عوام کی بھلائی کے لیے کام کرتا ہے۔ اس نظام کی مسخ شدہ صورت یا متضاد (Tyranny) جبری حکومت ہے، جس کا مقصد عوام کی بھلائی کے بجائے عوام کے حقوق غضب کرنا، لوٹ مار کرنا اور اپنے طبقے کے ذاتی مفادات حاصل کرنا ہے۔ اس قسم کے حکمران لوگوں کو مار کر، ہراساں کر کے اور دہشت زدہ کر کے حکومت کرتے ہیں اور عوام کی منشاء کی قطعی پروا نہیں کرتے ہیں۔

۲۔امراءراج(Aristocracy)

اگر نیک اور شریف امراء خاندان، کسی اصول اور ضابطے کے تحت حکومت کریں جس میں عوام کی رضامندی بھی شامل ہو اور ان کے مفادات کا خیال بھی رکھا جائے تو وہ امراء راج کہنا چاہیے۔ اس راج یا نظامِ حکومت کی مسخ شدہ صورت (Oligarchy) سے ہے، تو یہ بھی امراء راج لیکن اس میں امراء عوامی مفادات کے بجائے ذاتی مفادات کے لیے کام کرتے ہیں، جو کہ خودغرض، خودپرست، نادان اور بداخلاق ہوتے ہیں۔ (اس طرزِ حکومت کو ''غنڈہ راج'' کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا)

۳۔آئینی جمہوریت(Timocracy)

اس طرزِ حکومت میں ایک آئین ہونا چاہیے اور حکمران اس آئین کے تحت حکومت کریں۔ حکمران عوام میں سے ہوں اور عوام کو اپنے حقوق و فرائض کی مکمل آگاہی ہو۔ اس نظام کی مسخ شدہ صورت (Democracy) یعنی عوامی جمہوریت ہے جو کہ ہے تو عوام کی حکومت لیکن اس میں جاہل اور نیکی و بدی کا شعور نہ رکھنے والے لوگوں کی حکمرانی ہو جاتی ہے، جن سے خیر کی توقع کم ہی رکھی جا سکتی ہے۔[1]

ارسطو نے تین نظامِ حکومت اس لیے دیئے ہیں کہ لوگ اپنے علاقے کی ضروریات اور عوام کے مزاج کے مطابق ان تینوں میں سے کسی ایک نظام کو نافذ کریں لیکن ایک بات جو ان تمام نظاموں اور حکمرانوں میں ہونی چاہیے وہ یہ ہے کہ عوام کو نیکی اور خوش حالی تک پہنچا دیں۔

ریاست کیسی ہونی چاہیے

(۱)۔ریاست کو درمیانی رقبے پر مشتمل ہونا چاہیے۔ کیوں کہ زیادہ بڑی ریاست کا انتظام سنبھالنا دُشوار ہوتا ہے اور زیادہ چھوٹی ریاست اپنا وجود برقرار نہیں رکھ سکتی۔

(۲)۔ریاست کو اپنی فاضل، اضافی اشیاء برآمد اور ضرورت کی اشیاء درآمد کرنی چاہئیں۔

(۳)۔ثقافتی سرگرمیاں ضرور ہونی چاہئیں مگر یہ عیاشی میں تبدیل نہ ہوں۔

(۴)۔زرعی مزدور، کسان، ہنرمند اور غلام ضرور ہونے چاہئیں مگر یہ مکمل شہری (Citizens) نہیں کہلائیں گے۔ مکمل شہری صرف وہ لوگ ہوں گے جو کہ نوجوانی میں فوجی، جوانی یا درمیانی عمر

---

(1)-Critical Analysis of Greek Philosophy By: W.T.Stace.

میں مجسٹریٹ یا معزز اور بڑھاپے میں مذہبی رہنما بن کر جئیں گے۔

"تعلیم دلانا ریاست کی ذمہ داری ہو۔" تعلیم انسان کے جسم سے شروع ہونی چاہیے۔ کیوں کہ بدن اور اس کی ضروریات، روح سے پہلے پلنے بڑھنے لگتی ہیں۔ جسم کو تعلیم اس لیے دینا چاہیے کہ وہ روح کے طابع ہو سکے اور جسمانی تقاضوں کی تعلیم اس لیے دینا چاہیے کہ وہ عقلی استدلال (Reason) کے طابع ہو سکیں۔[1]

جمالیات۔فن کا فلسفہ

جمالیات فلسفے کی وہ شاخ ہے جس کا تعلق، فن کی تخلیق، فن کی اہمیت اور اس کے تجربے کے ساتھ ساتھ فن کے تجزیے، اس سے متعلق مسائل اور ان کے حل سے ہے۔[2]

جمالیات بنیادی طور پر حسن و جمال کا فلسفہ ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ وہ یہ اصول وضع کرتا ہے یا کسوٹی مقرر کرتا ہے کہ جس کی مدد سے کسی فن کو فن کہا جا سکے یا اس فن کو حسین یا قبیح کہا جا سکے۔

ارسطو نے جمالیات پر بھی بہت کچھ لکھا ہے۔ حُسن، فنونِ لطیفہ اور حزن (Tragedy) اس کے موضوعات ہیں، جن پر اس نے Poetics اور متعدد دیگر کتابوں میں بہت کچھ لکھا ہے۔

حُسن کیا ہے؟

حُسن دیکھنے والے کی آنکھوں میں ہے یا اشیاء میں؟ اگر حسن دیکھنے والے کی نگاہ میں ہے تو پھر اسے ہر شے خوب صورت دکھائی کیوں نہیں دیتی؟ اگر حسن چیزوں میں ہے تو پھر یہ چیزیں سب کو یکساں نظر کیوں نہیں آتیں؟ ان سوالوں کے جوابات تو آگے چل کر کانٹ (Kant) وِل ڈیورانٹ (Durrant) اور دیگر نے تفصیل سے دیئے ہیں لیکن ارسطو کے زمانے میں اہم سوال یہ تھا کہ "وہ کون سے معیار ہیں جن کے ذریعے کسی تخلیق شدہ شے کو خوب صورت کہا جا سکتا ہے؟" ارسطو جواب دیتا ہے:

حسن، توازن، تناسب اور مربوط، کُل اور اجزاء کی فطری ترتیب کا نام ہے۔[3] یعنی اجزاء اور کل کے تعلق میں ایک خاص توازن اور ترتیب ہونا چاہیے۔ کُل کے لحاظ سے اگر اجزاء بہت بڑے

---

(1)-Coplestion S.J. Vol:1, Page:349.

(2)-A Dictionary of Philosphy By:A.R. Lacey.

(3)-A Dictionary of Philosophy By:A.R. Lacey. P:5.

یا بہت چھوٹے ہوں گے تو چیز خوب صورت نہیں رہے گی۔ مثال کے طور پر اُونٹ کا پورا جسم ایک ''کل'' ہے اور اس کے کان اجزاء ہیں۔ جسم انتہائی بڑا اور کان کافی چھوٹے ہیں۔ لہٰذا اُونٹ کو خوب صورت جانور نہیں کہا جاسکتا۔ کیوں کہ اجزاء اور کل کے تناسب میں توازن نہیں ہے۔ گھوڑا اس لیے ایک خوب صورت جانور ہے کہ اس کے اعضا اور جسم میں توازن موجود ہے۔ اسی طرح انسان بھی خوب صورت اور بدصورت ہوتے ہیں۔ کسی قدآ ور اور صحت مند جسم میں اگر آنکھیں چھوٹی چھوٹی ہیں یا کسی چھوٹے چہرے پر بڑی ناک یا بڑے کان موجود ہوں تو اس انسان کو خوب صورت نہیں کہا جائے گا۔ خوب صورت انسان وہ ہے جس کے تمام اعضاء اس کے جسم سے صحیح تناسب میں ہم آہنگ ہوں۔

فن کیا ہے؟

فن اس شے کو کہا جائے، جو انسان کی تیار کردہ ہو۔ تو کیا کچرے کا ڈھیر بھی فن ہے جو انسان کا بنایا ہوا ہے؟ نہیں فن وہ ہے جو انسانی تخلیق ہو اور خوب صورت بھی ہو۔ فن خوب صورت ہوتا ہے اور انسان کو خوشی بھی فراہم کرتا ہے۔ فن کی دو قسمیں ہیں۔ ایک فن برائے افادیت اور دوسرا فن برائے خوب صورتی۔ فنِ تعمیر، موٹر کار، صوفہ سیٹ اور قالین وغیرہ فن برائے افادیت ہیں۔ یعنی خوب صورت ہونے کے علاوہ کارآمد بھی ہیں۔ موسیقی، ادب اور مصوری وغیرہ فن برائے خوب صورتی ہیں۔ یعنی ان کی کوئی مادی افادیت نہیں ہے یہ صرف خوب صورتی پیدا کرتے ہیں اور انسانی ذہن کو خوشی و سکون دیتے ہیں۔ ان کو فنونِ لطیفہ کہا جاتا ہے۔

افلاطون نے کہا تھا کہ یہ دنیا اصل دنیا کی نقل ہے اور فن اس نقل کی نقل ہے لیکن ارسطو افلاطون سے متفق نہیں ہے۔ ارسطو اسی دنیا کو حقیقی سمجھتا ہے اور اس کی نقالی کو فن کہتا ہے لیکن یہ نقالی اس طرح نہیں ہے کہ فن کار کسی منظر کو ہو بہو نقل کر ڈالے فن کار کا کام ہے فطرت کے حُسن میں معانی تلاش کرنا اور اس منظر کو معنی سمیت نقل کرنا۔ اس مکتبۂ فکر کو ان دِنوں ''نمائندہ فن'' (Re Presentative Art) کہا جاتا ہے۔

فن میں ''شاعری'' کو ارسطو بڑی امتیازی حیثیت دیتا ہے، جس میں شاعر محض نقالی نہیں کرتا ہے بلکہ ایک شے بھی تخلیق کرتا ہے جو ''ممکن'' ہو سکتی ہے لیکن ارسطو کے ہاں فن کی بلند ترین شکل موسیقی ہے۔ موسیقی کو ارسطو اخلاقی رویوں اور اقدار کی نقالی یا ان کی نمائندہ کہتا ہے۔ اس قدر کہ کردار کی تعمیر کو ضروری سمجھتے ہوئے اسے اسکولوں میں لازمی مضمون کے طور پڑھانے پر اصرار کرتا ہے۔

حزن (Tragedy)

ارسطو کے دَور میں یونان میں ڈراموں کا بہت رواج تھا اور ڈرامہ اعلیٰ فن ہونے کے ساتھ ساتھ اپنے اندر اخلاقیات اور تعلیمی سچائی کے عناصر بھی رکھتا تھا۔ ڈرامے دو قسم کے ہوتے تھے ایک المناک، دوسرے مزاحیہ، ارسطو المیہ ڈرامے کو مزاحیہ ڈرامے پر بہت فوقیت دیتا تھا اور حزنیہ عنصر کو فن کے دیگر ذرائع سے نمایاں کرنے پر زور دیتا ہے۔ المیہ یا حزن کیا ہے؟ المیہ اس عمل کی نقالی ہے جو کہ سنجیدہ، اعلیٰ، اپنے آپ میں مکمل، رحم اور خوف کو اُبھارنے والا اور جذبات میں ہیجان کی طہارت (Catharsis) کرتا ہے۔

ارسطو کا کہنا ہے کہ ڈرامے میں ایسے حقائق دکھائے جائیں جن کی جمالیاتی اور تعلیمی اہمیت تو اپنی جگہ پر ہو مگر اس سے بڑھ کر ان کی نفسیاتی اہمیت اور افادیت پر زور ہونا چاہیے۔ اسٹیج پر ایک ایسی کہانی پیش کی جاتی ہے جسے دیکھ کر ناظرین کے دل میں رحم اور خوف کے جذبات پیدا ہوتے ہیں اور نتیجے میں اس کے اندر ایک ہیجانی کیفیت پیدا ہوتی ہے جس کا فائدہ یہ ہوتا ہے کہ اس کے جذبات کی منفی شدت ختم ہو جاتی ہے اور وہ کارآمد بن جاتے ہیں۔ ارسطو نے اس عمل کو کیتھارسس (Catharsis) کہا ہے، جس کے معنی جذبات اور ہیجان کی تطہیر یا پاکیزگی کے ہیں۔

ارسطو نے سانحے (Tragedy) پر بہت تفصیل سے لکھا ہے لیکن یہاں سانحے کے ترکیبی اجزاء درج کرنا کافی ہوں گے، جو کہ ذیل ہیں:

۱۔ مرکزی خیال

۲۔ کردار

۳۔ زبان

۴۔ فکر

۵۔ منظری ترنم یا موسیقیت

ارسطو نے اپنی کتاب Rhetoric, Poetics اور Meta Physics میں حُسن، فن، شاعری، موسیقی، ڈرامے اور حزن پر جو کچھ لکھا ہے، وہ اس قدر بھرپور ہے کہ قریباً 24 صدیاں گزرنے کے باوجود کوئی بھی ادبی/فنی تنقید ارسطو کے ذکر کے بغیر ادھوری ہے۔

یونان کا سیاسی زوال

یونانی ریاستیں جو چھوٹی چھوٹی آبادیوں پر مشتمل تھیں اکثر ایک دوسرے سے برسرِ پیکار رہتی تھیں۔ سکندرِ اعظم کی وفات کے بعد ان کی لڑائیوں میں شدت آ گئی، آبادی کی کثرت اور وسائل جھگڑوں کے بنیادی سبب تھے۔ جنگلات کی کٹائی، معدنیات کی کثیر کھدائی اور جنگ کی خون ریزی نے یونان کی کمر توڑ ڈالی اور معاشی بدحالی عروج پر پہنچ گئی۔

آخر کار سن 146 قبل مسیح میں رومیوں نے یونان فتح کر لیا۔ رومی لشکر وحشی قبائلیوں، گنواروں اور چرواہوں کا لشکر تھا، جس نے یونان کو تباہ کر ڈالا۔

رومی لشکریوں نے جو قتلِ عام کیا سو کیا مگر انہوں نے یونانی علم و ہنر کو ناقابلِ تلافی نقصان پہنچایا۔ دنیا کے بہترین فن پاروں اور مصوری کے نادر نمونوں کو وہ تاش اور چوپڑ کے کھیل کے بورڈ کے طور پر استعمال کرتے تھے۔

رومی علم و ادب سے کوسوں دُور تھے اور صرف اپنی قوت پر یقین رکھتے تھے۔ ان کے ہاں عالم کے بجائے جنگجو کی قدر اور قلم کے بجائے تلوار کی اہمیت تھی۔ ایسے ماحول میں فلسفے، ادب اور فن کے نازک پھولوں کا مرجھا جانا ایک فطری بات تھی۔

یوں تو یونان نے کئی فلسفی پیدا کیے مگر بڑے فلسفی سقراط، افلاطون اور ارسطو ہی تھے۔ ان تین دانش وروں کے بعد بھی کئی فلسفی پیدا ہوئے، لیکن ان کے چار پیروکار مشہور ہوئے، جن کا مختصر ذکر ضروری ہے۔

ا۔ دیو جانس (Diogenes)

دیو جانس، سقراط کے ایک شاگرد کا شاگرد تھا اور ایتھنز سے باہر لکڑی کے ایک ڈربے میں رہتا تھا۔ ایک عصا، ایک چادر اور ایک تھیلا اس کے کل اثاثہ تھے۔ اس کی تعریف سُن کر سکندر اعظم اس سے ملنے گیا تو دیو جانس سردی کے موسم میں دھوپ سے لطف اندوز ہو رہا تھا۔ سکندر اعظم نے ادب واحترام کے ساتھ کہا ''دیو جانس صاحب، آپ کو کسی بھی چیز کی ضرورت ہو تو حکم کریں، مَیں آپ کی خدمت میں پیش کر سکتا ہوں۔''

''ہاں ایک کام کرو، مہربانی کر کے سامنے سے ایک طرف ہٹ جاؤ۔ تاکہ دھوپ مجھ تک پہنچ سکے۔''

دیو جانس کا نظریہ یہ تھا کہ خوشی حاصل کرنے کے لیے مادی اشیاء اور عیش وعشرت کو خیر باد کہنا ہوگا۔ کیوں کہ خوشی خارجی اور مادی اشیاء سے حاصل نہیں ہوتی ہے یہ صرف نیکی اور قلندری سے حاصل ہوگی۔

''اس نے ہر قسم کی روایت کو رَد کیا، حکومت نہ ہو، ذاتی جائیداد نہ ہو، شادی نہ کی جائے، باقاعدہ مذہب کوئی نہ ہو۔ کپڑوں وغیرہ کی پروا نہ کی جائے، گھر گھاٹ، خورد ونوش اور بناؤ سنگھار کی چنداں ضرورت نہیں ہے۔ فقیر بن کر زندگی گزاری جائے تو خوشی ملے گی۔ [1]

اس قسم کے فلسفے کو ''قنوطی'' (Cynical) کہا گیا مگر وہ آج کل کی قنوطیت سے قطعی مختلف تھا۔ (آج کل قنوطیت کا مطلب ''مایوسی'' ہے)

۲۔ زینو (Zeno) (رواقی Stoic)

تیسری صدی قبل مسیح میں زینو نے روایت کی بنیاد ڈالی۔ زینو اور اس کے پیروکاروں کا فلسفہ اس طرح ہے:

خدا کائنات/انسان سے الگ نہیں ہے۔ وہ کائنات کی روح ہے۔ ہر انسان میں خدا کے آفاقی نور کا ذرّہ ہے۔ خوش صرف وہی رہ سکتا ہے، جو فطرت سے ہم آہنگی اور مطابقت میں ہے۔ انسان کی سب سے اچھی بات نیکی ہے۔ صحت، دولت اور لذت کی کوئی اہمیت نہیں ہے۔ مادے اور روح میں کوئی جھگڑا نہیں ہے۔ یہ بظاہر دو نظر آتے ہیں۔ درحقیقت ایک ہی ہیں، یعنی وجود صرف

(1)-History of wostern Philosophy By:Bertrand Russel, Page:241.

واحد ہے، تمام انسان برابر ہیں۔

زینو کا فلسفہ روم، شام اور مصر میں کافی پھیلا اور مقبول ہوا۔

زینو اور اس کے پیروکار تقدیر کے قائل تھے اور کہتے تھے کہ کوئی بھی واقعہ اتفاقیہ نہیں ہے۔ لہٰذا خوش ہونا یا افسوس کرنا بیکار ہے۔ تکلیف کو بھی حوصلے سے برداشت کرنا چاہیے۔

۳۔ اپیکیورس (Epicurius)

(341 قبل مسیح تا 270 قبل مسیح) قنوطی اور رواقی ہمہ وقت تکلیف سہنے کے لیے تیار تھے، مگر اپیکیورس نے کہا کہ لذت سے منہ نہ موڑیں۔ لذت ہی نیکی ہے اور دُکھ بڑی برائی ہے۔ یہاں اس کا یہ مطلب ہرگز نہ تھا کہ خواہشات کا غلام بن کر رہا جائے اور نفس کو بالکل بے لگام چھوڑ دیا جائے، جیسا کہ نفس پر قابو پانے میں بھی خوشی اور لطف ہے لہٰذا یہ خوشی حاصل کرنا ضروری ہے۔ مطلب یہ کہ جسم اور ذہن کے ذریعے خوشی بلکہ بہتر خوشی اور لذت حاصل کی جائے زندگی عزت سے گزاری جائے۔ دیوتاؤں سے خوف زدہ ہوا جائے۔ کیوں کہ یہ نہ تو انسان کا کچھ بگاڑ سکتے ہیں اور نہ ہی انسان کے کسی کام آسکتے ہیں۔ لہٰذا ان کی خوشنودی کی خاطر عبادتیں کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ موت سے نہ ڈرا جائے، کیوں کہ جب موت آتی ہے تو زندگی نہیں ہوتی ہے اور جب تک زندگی رہتی ہے موت نہیں آتی۔ اذیت اور غم برداشت کرنا کوئی کمال نہیں ہے۔ نیکی کو تلاش کیا جائے اور دوستی کی قدر کی جائے کیوں کہ دوستی خوشی سے ہمکنار کرتی ہے۔

اپیکیورس، ڈیموکریٹس اور ارسطو دونوں سے متاثر تھا اور کہتا تھا کہ کائنات انتہائی چھوٹے چھوٹے ذرّات (Atoms) سے بنی ہے، جو کہ لامحدود ہے، ازل سے ہے اور ابد تک رہے گی۔

۴۔ پلاٹینیوس (Plotinus) (نوافلاطونیت Neo-Platonism)

(270 تا 205 قبل مسیح) پلاٹینیوس اصل میں کہاں کا باشندہ تھا اس کا کچھ پتہ نہیں لیکن اس نے گیارہ سال اسکندریہ میں تعلیم حاصل کی۔ بعدازاں وہ روم کی فوج میں بھرتی ہوگیا۔ 40 سال کی عمر میں مستقل طور پر روم میں آباد ہوگیا۔ دیوجانس، زینو اور اپیکیورس بہرکیف سقراط کے فلسفے سے متاثر تھے لیکن پلاٹینیوس، افلاطون سے بہت زیادہ متاثر تھا۔ اس کے فلسفے نے مستقبل میں عیسائیوں، مسلمانوں اور بڑی حد تک ہندوؤں کو بھی متاثر کیا۔ اس کے فلسفے کا اختصار ذیل میں دیا جاتا ہے۔

خدا اور مادہ الگ الگ ہیں۔ حقیقی وجود صرف خدا کا ہے جو کہ واحد ہے، جس طرح

غروبِ آفتاب کے بعد تاریکی چھا جاتی ہے مگر اس تاریکی کا کوئی وجود نہیں ہوتا۔ حالاں کہ ہم اس تاریکی کو دیکھ اور محسوس کر سکتے ہیں۔ یہ تاریکی اثر انداز بھی ہوتی ہے کیوں کہ اشیاء پر پردہ ڈالتی ہے۔ اس تاریکی کی حقیقت کیا ہے؟ اس کی ماہیت کیا ہے؟ یہ صرف اور صرف روشنی کی ''عدم موجودگی'' ہے۔ باالفاظِ دیگر تاریکی عدم وجودیت ہے۔ اسی طرح خدا کا نور جہاں نہیں پہنچتا وہ ظلمت ہے، بدی ہے، برائی ہے۔ ظلمت کا مطلب ہے نورِ خدا کی عدم موجودگی۔ دوسرے الفاظ میں ظلمت کا کوئی حقیقی وجود (اندھیرے کی طرح) ہے ہی نہیں، یہ محض عدم وجودیت ہے۔

پلاٹینیوس نے افلاطون کی ثنویت (Dualism) کو وحدانیت (Monism) میں بدل ڈالا۔ یعنی وجود دو نہیں ہیں بلکہ ایک ہے۔

پلاٹینیوس کا فلسفہ صوفی ازم کی ابتدائی صورتوں میں سے ایک تھا کہ وہ کہتا ہے کہ تمہاری روح خدا سے مل کر ایک ہو جائے گی۔

پلاٹینیوس نے یہ دعویٰ کیا کہ اسے یہ تجربہ ہو چکا ہے کہ اس کی روح خدا سے مل کر ایک ہو جاتی ہے اور کوئی فاصلہ نہیں رہتا۔ پلاٹینیوس کے علاوہ کئی انسانوں خصوصاً صوفیوں نے یہ دعویٰ کیا ہے کہ انھیں خدا کے ساتھ مدغم ہونے یا اس میں جذب ہونے کا تجربہ ہوا ہے، جس کے لیے وہ کہتے ہیں کہ ان تجربات کو بیان کرنے سے دنیاوی زبان قاصر ہے، لیکن وہ کہتے ہیں کہ ''جب ادغام ہوتا ہے تو وہ ایسا محسوس کرتے ہیں کہ اپنا آپ کھو رہے ہیں اور یوں وہ خدا کی ذات میں گم ہو جاتے ہیں، یوں جیسے پانی کا قطرہ سمندر میں گرنے کے بعد اپنا وجود گم کر ڈالتا ہے۔''[1]

پچھلے صفحات پر ذکر کردہ چاروں مکتبۂ فکر دراصل سقراط، افلاطون اور ارسطو کے فلسفے کی اصلاحات، اضافے، یا تبدیلیاں تھیں۔ ان تشریحات اور تضادات کا اثر کم و بیش آنے والے ہر دَور پر مرتب ضرور رہا ہے، لیکن درحقیقت ارسطو کے بعد ایک طویل عرصے تک کوئی بھی حقیقی اور عظیم فلسفی پیدا نہ ہو سکا۔ ایسا لگتا ہے کہ رومیوں نے یونان کو جو تاراج کیا تھا، اس میں نسلِ انسانی کا بڑے سے بڑا نقصان یہ ہوا کہ فلسفے کی روشنی پر ایک سیاہ چادر پھیل گئی اور ایک طویل تاریک دَور کا آغاز ہوا۔

حضرت عیسیٰؑ کی پیدائش ہوئی اور مصلوب کر دیے گئے۔ عیسائیت دھیرے دھیرے پھیلنے لگی اور کلیسا پھلنے پھولنے لگی۔ سینٹ پال نے ایتھنز میں تبلیغ کی اور چند عیسائی پیدا کر لیے لیکن تاریخ

---

(۱)۔ صوفی کی دنیا۔۔۔ جوسٹن گارڈن، صفحہ نمبر ۲۰۷

گواہ ہے کہ مذاہب کے پھیلاؤ میں تبلیغ کا اثر انتہائی کم اور سیاسی اقتدار کا ہاتھ زیادہ ہوتا ہے۔ کلیسا نے اقتدار پر قبضہ جما لیا اور سن 529ء کا سال فلسفے کے لیے بڑا اندوہناک ثابت ہوا۔ کیونکہ اس سال کلیسائی قوتوں نے 900 سال سے قائم افلاطون کی اکیڈمی بند کر ڈالی۔

قرونِ وسطیٰ

سن 400ء سے 1400ء تک کے ہزار سالہ زمانے کو تاریخ کے عالموں نے قرونِ وسطیٰ کا نام دیا ہے۔ یہ زمانہ مذہبی تسلط کا زمانہ ہے۔ اس دور میں علم پہ پہرے، عقل پہ تالے اور فلسفے پر فتوے لاگو ہوتے رہے۔ عقل کو مذہب کی دشمن اور فلسفے کو مذہب کا حریف قرار دیا گیا۔ صرف مذہبی تعلیم ہی رہ گئی۔

اس دور میں علم اور عقل کی بات کرنے کا مطلب اپنی جان گنوانا تھا۔ اس طرح گھٹن اور حبس کے ماحول میں آہستہ آہستہ فلسفے پر وقت کی گرد جمتی رہی اور یونانی دانش ور زمانے کے اذہان سے فراموش ہوتے چلے گئے۔

ہر تاریک دور کو اختتام ہونا ہوتا ہے۔ ہر سیاہ، زہریلے اور گھپ اندھیرے کی خوفناک اور مایوس رات کے بعد سحر کی کرنوں کو طلوع ہونا ہوتا ہے مگر۔۔۔ آہ!

نسلِ انسانی کے ان گم شدہ ہزار برسوں کا حساب کس سے لیا جائے!؟ کس کا احتساب کیا جائے اور کس کو کٹہرے میں کھڑا کیا جائے کہ ''میاں بتاؤ تو سہی کہ وہ ہزار سال کہاں غائب کر ڈالے؟ تہذیب وثقافت کی روشنی کو غلاف میں لپیٹ کر طاق پہ کیوں رکھ چھوڑا؟''

مسلمانوں کے اقتدار میں آنے کے بعد کئی علاقے ان کے تسلط میں آ گئے، جن میں اسکندریہ اور شمالی افریقہ بھی شامل تھے۔ ان علاقوں میں ارسطو کے فلسفے کے اثرات باقی رہنے کے ساتھ ساتھ ارسطو کی تحریر کردہ کتابوں کے چند نسخے بھی موجود تھے، جیسا کہ مسلمانوں میں سائنسی علوم حاصل کرنے کا شعور بیدار ہوا تھا۔ لہٰذا وہ ارسطو کو اشتیاق سے پڑھنے لگے اور اس پر بحث مباحثے کرنے لگے۔ یوں ایک طویل عرصے کے بعد ارسطو دوبارہ بحث کا موضوع بن گیا۔

افلاطون، عیسائیوں میں پہلے ہی مقبول تھا کیوں کہ سینٹ آگسٹین (Augustine) نے تو بے چارے افلاطون کو بھی مشرف بہ عیسائیت کر ڈالا تھا۔ حالاں کہ افلاطون حضرت عیسیٰ کی

ولادت سے 347 سال پہلے انتقال کر چکا تھا۔

نشاۃِ ثانیہ (Renaissance)

بالآخر علم، عقل اور سائنس پر لگے پہروں اور مصائب کے دور کو بھی اختتام ہونا تھا۔ یورپ میں کلیسا انتہائی طاقت ور ہو چکی تھی۔ طاقت جب حد سے تجاوز کر جاتی ہے تو ظلم کی شکل اختیار کر لیتی ہے۔ طاقت ور انسان آہستہ آہستہ عیاش، سطحی اور سہل پسند ہو جاتے ہیں۔

اس دورِ سیاہ میں پادریوں نے ہر اُس آواز کو دبا رکھا تھا جس نے عیسائیت سے ٹکرانے کی کوشش کی۔ ہر وہ گردن قلم کر دی گئی جو پادریوں کی اشیر باد رکھنے والے حکمرانوں کے مقابل کھڑی ہوئی۔ سچ صرف وہی تھا جو پادری کہتے تھے، باقی سب کچھ جھوٹ تھا۔

قرونِ وسطیٰ میں ہر عمل اور ہر شے میں الہامی عمل دخل سمجھا جاتا تھا۔ زندگی کے ہر رخ کو خدائی نکتۂ نگاہ سے دیکھا جاتا تھا۔

زمانۂ قدیم یا عہدِ عتیق (Antiquity) میں ہر شے کو انسانی نکتۂ نگاہ سے دیکھا جاتا تھا۔ یعنی انسان دنیا کی ہر شے اور طاقت سے اہم ہے۔ سب کچھ انسان کے لیے ہے، یعنی اگر مذہب ہے تو وہ بھی انسان ہی کے لیے تخلیق کیا گیا ہے۔ نہ کہ انسان مذہب کے لیے نشاۃ ثانیہ کا مطلب ہی یہی ہے۔ اسی عہدِ عتیق کو ایک مرتبہ پھر زندہ کرنا اور عہدِ قدیم کے فنون، ثقافت، سائنس اور انسان دوستی کو محور اور بنیاد بنا کر اس پر نئی طرزِ زندگی استوار کرنا۔

عرب مفکر، ابنِ رُشد (Averroes) سن 1126ء تا 1198ء) ارسطو کے فلسفے سے بہت زیادہ متاثر ہوا، اور اس کے فلسفے کی تشریحات لکھیں۔ اندلس کے مسلم مفکر، غزالی کی کتاب کے جواب میں کتاب لکھی۔ غزالی نے "تحافت الفلاسفہ" لکھ کر فلسفے پر سخت تنقید کی، جس کے جواب میں ابنِ رشد نے "تحافت التحافت" لکھ کر فلسفے کا دفاع کیا۔

ابنِ رشد لکھتا ہے کہ "مذہبی عالم میں یہ اہلیت ہی نہیں ہے، کہ وہ علم اور آگاہی کو سمجھ سکے۔ اس لیے وہ خدائی قانون کی تشریح کرنے کی قابلیت ہی نہیں رکھتا۔"

ابنِ رشد کے لکھنے کے دو مقصد تھے۔

(ا)۔ اسلامی فلسفے کو نو افلاطونی نظریات سے محفوظ رکھا جائے۔

(۲)۔خالص فلسفے کو مذہبی تشریحات سے جدا کرے۔ (الفارابی اور بوعلی سینا نے فلسفے کو مذہب کے غلاف/جزدان میں لپیٹنے کی کوشش کی تھی)

ابنِ رشد کی کتابیں اور تشریحاتِ ارسطو، تشریحاتِ افلاطون، ارسطو کا فلسفہ لاطینی زبان میں ترجمہ ہوکر پورے یورپ میں پھیل گئیں۔

ارسطو کے فلسفے پر بہت تیز ردِعمل ہوا، افلاطون کے فلسفے کی طرح، پہلے تو اسے عیسائیت اور یہودیت سے ہم آہنگ کرنے کی کوشش کی گئی لیکن کچھ ایسی بنیادی باتیں تھیں جو کہ مکمل طور پر عیسائیت اور یہودیت کے برعکس تھیں مثلاً

(۱)۔ارسطو نے کہا کہ یہ کائنات ازل سے ہے اور ابد تک رہے گی۔ یہ کسی خاص وقت پر ''تخلیق'' نہیں کی گئی، جب کہ انجیل کے مطابق اسے تخلیق کیا گیا ہے۔

(۲)۔ارسطو نے کہا ہے کہ ہر انسان میں ذہانت اور دانش ہے، ہر انسان کو فنا ہونا ہے، جب کہ عیسائیت میں حضرت عیسیٰؑ زندہ ہیں اور ہمیشہ زندہ رہیں گے۔[1]

کچھ لوگوں نے ابنِ رشد کو نظر انداز کیا، کچھ نے سخت تنقید کی لیکن چند لوگوں نے اس کی باتوں پر غور بھی کیا اور اس سے متاثر ہوئے۔ارسطو کے فلسفے میں انسان دوستی تھی اور انسان کو مرکزی حیثیت حاصل تھی، جب کہ عیسائی فکر میں انسان گناہ گار ہے اور بدی اس کی سرشت میں شامل ہے۔ لہٰذا اس کائنات میں انسان کی مرکزی حیثیت ہرگز نہیں ہے۔

ارسطو کے فلسفے نے لوگوں کی فکر کو جلا بخشی اور انہوں نے یونانی فلسفے کے ساتھ ساتھ دیگر یونانی علوم وفنون کو دوبارہ پڑھنا اور سمجھنا شروع کیا۔حصولِ علم کو اہمیت ملی، دریافت اور تحقیق کا سلسلہ دوبارہ شروع ہوا۔اٹلی میں نشاۃِ ثانیہ کا دور شروع ہوگیا۔

جہاں اٹلی میں نشاۃِ ثانیہ کی ابتدا انسان دوستی سے شروع ہوئی۔ وہیں آگے چل کر یورپ کے دوسرے ملکوں میں اس کا رُخ سائنسی تحقیق کی طرف مڑ گیا۔ ''علم طاقت ہے'' (Knowlege is Power) فرانسس بیکن نے نعرہ لگایا اور لوگ علم حاصل کرنے میں جُت گئے۔

تقریباً تمام مذاہب اور اوائلی فلسفے میں صدیوں سے یہ نظریہ تھا کہ ''زمین کائنات کا مرکز ہے اور سورج زمین کے گرد گھومتا ہے'' مگر نکولائی کوپرنیکس (سن 1474ء تا 1543ء) نے یہ نظریہ دیا کہ

---

(1)-Copleston S.J. Page:4

''زمین کائنات کا مرکز نہیں ہے، سورج زمین کے گرد نہیں گھومتا بلکہ زمین سورج کے گرد گھومتی ہے۔''

یہ نظریہ کلیسا کے لیے بہت بڑا دھماکہ تھا اور عیسائیت کی تعلیمات کے بالکل برعکس، علم کا ایک عاشق اور سر پھرا مجاہد، کوپرنیکس کا نظریہ لے کر یورپ کے شہر شہر میں تقاریر کے ذریعے اس کا پرچار کرنے لگا ''سنو سنو، سورج کے گرد زمین گھومتی ہے، زمین کے گرد سورج نہیں گھومتا ہے۔'' سر ہتھیلی پر رکھ کر یورپ کی گلیوں میں دہائیاں دینے والا وہ سرفروش ''برونو'' (Bruno) تھا۔ برونو کی تقاریر سے کلیسا شدید حد تک بھڑک اُٹھی اور سن 1600ء میں برونو کو روم کے ایک چوک میں کھمبے کے ساتھ باندھ کر ہزاروں لوگوں کی موجودگی میں آگ لگا کر زندہ جلا دیا گیا۔

آگے چل کر کوپرنیکس کے نظریے کو کیپلر (Kepler) اور گلیلو (Galilo) نے زیادہ سلجھایا لیکن اس کے نتیجے میں بھی گلیلو کو دو دفعہ معافی مانگنا پڑی اور پوری عمر کے لیے گھر میں نظر بندی کی سزا اس کے علاوہ تھی۔

لیکن علم کی شمع پوری آب و تاب سے جلنے لگی نیوٹن (Newton) جیسا عظیم ماہرِ طبیعات پیدا ہوا، دُوربین ایجاد ہوگئی جس نے فلکیات کے مطالعے کو آسان کر دیا اور کائنات کے بارے میں لوگوں کی آراء تبدیل ہونے لگیں۔ قطب نما کی ایجاد سے جہاز رانی آسان ہوگئی اور جہاز سمندر کی وسعتوں میں دُور دراز پھیل گئے۔

چھاپے خانے کی ایجاد نے نشاۃ ثانیہ کے عمل کو انتہائی تیز کر دیا اور مصر کا تیار کردہ کاغذ یورپی ملکوں میں باآسانی دستیاب ہونے لگا۔

پہلے انجیل صرف لاطینی زبان میں دستیاب تھی اور وہ بھی محدود قلمی نسخوں کی شکل میں، جن کی تلاوت صرف پادری ہی کر سکتے تھے۔ پادریوں کی اجارہ داری کا نتیجہ یہ نکلا کہ عام لوگوں کی انجیل تک رسائی ناممکن ہوگئی۔ پادری لوگوں کو آخرت کے عذاب سے نجات دلانے کے لیے ''جنت کی اسناد'' فروخت کرنے لگے۔

چھاپے خانے کی ایجاد کے بعد انجیل کے عبرانی اور یونانی ترجمے ہو کر اشاعت ہوئے اور دھڑا دھڑ عام لوگوں تک پہنچنے لگے۔

مارٹن لوتھر (Luther) نجات کی سندوں یا معافی ناموں کا سخت مخالف تھا۔ اس کے خیال میں خدا سے معافی مانگنے کے لیے کسی پادری یا دوسرے وسیلے کی قطعی ضرورت نہیں تھی۔ انسان کو

براہِ راست خدا سے رجوع کرنا چاہیے (مارٹن لوتھر (Luther) عیسائیت میں پروٹسٹنٹ فرقے کا بانی تھا) لوتھر نے جرمن میں انجیل کا ترجمہ کیا۔ آگے چل کر کیتھولک اور پروٹسٹنٹ فرقے آپس میں خون ریز جنگیں کرنے لگے۔ (فرقہ پرستی کا لازمی نتیجہ خون ریزی اور بدامنی ہی ہے)

نشاۃِ ثانیہ کا دَور عظیم فلسفیوں کا نہیں بلکہ فلسفے کے نئے جنم کا زمانہ تھا۔ سائنس فلسفے کی ذہین بیٹی ہے جو کہ اس دَور میں پھلنے پھولنے لگی۔ سائنسی ایجادات ہونے لگیں اور انسانی ذہن پابندی کی زنجیریں توڑ کر سوچنے لگے۔ فرانسس بیکن (Bacon) کے مضامین عقل کے استعمال اور اس کے افادی پہلوؤں کی طرف راہنمائی کے لیے معاون ثابت ہوئے اور مذہب پر لپٹے سیاہ سخت غلاف کو پھاڑ کر عقل اور علم کا سورج پوری طرح نمودار ہو چکا تھا۔

عقلی دور (Age of Reason)

رینی ڈیکارٹ

نشاۃ ثانیہ کا آفتاب مکمل طور پر طلوع ہو چکا ہے، اور فلسفے کے نئے دَور کا آغاز ہو چکا ہے، جس کو عالموں نے ''جدید دَور'' کا نام دیا ہے اور اس جدید اور عقلی دَور کے فلسفے کا بانی ڈیکارٹ ہے۔

رینی ڈیکارٹ مارچ 1596ء میں طورین کے ایک معزز گھرانے میں پیدا ہوا۔ دس سال کی عمر میں اسے کالج بھیجا گیا جو کہ عیسائی تعلیمات کے زیر اثر تھا۔ اس کالج میں اصولوں کے بابت انتہائی سختی تھی۔ ہر کام کے لیے اصول مقرر تھے۔ حتیٰ کہ چلتے وقت زمین پر پاؤں کس طرح رکھنے چاہئیں، اس کے لیے بھی وضع کردہ اصول موجود تھے۔

رینی ڈیکارٹ 1617ء سے 1621ء تک فوج میں رہا مگر اُکتا کر ملازمت چھوڑ دی اور تعلیم کا سلسلہ دوبارہ شروع کر دیا۔ انہی دِنوں اس کی ملاقات ڈچ کے ریاضی دان بیکرمین سے ہوئی، اسی وجہ سے ڈیکارٹ ریاضی پڑھنے لگا۔ اس کے علاوہ ڈیکارٹ نے ادویات، کیمیا وغیرہ کی بھی کافی تعلیم حاصل کی اور اس کے فوراً بعد ہالینڈ میں رہائش اختیار کی۔

ہالینڈ میں قیام کے دوران اس نے کئی مضامین لکھے جن میں سے Demundo خاصا اہم تھا، ابھی وہ Demundo چھپوانے کی تیاریاں ہی کر رہا تھا کہ اسے معلوم ہو گیا کہ کلیسا گلیلو سے سخت نالاں ہو گئی ہے اور گلیلو کو معافی مانگنا پڑی ہے۔ اس خبر نے اسے پریشان کر ڈالا۔ کیوں کہ اس کی کتاب کا کافی سارا مواد کوپرنیکس کے نظریے پر مبنی تھا۔

بہر حال ڈیکارٹ نے یہ اور اس طرح کے کئی مضمون قسط وار چھپوائے، جن پر تنقید تو ہوئی مگر یہ قابلِ برداشت تھی۔

ڈیکارٹ نے ہر شے کی اصلیت اور ماہیت کو سمجھنے کے لیے عقل کے استعمال پر زور دیا اور یوں اس نے عقل اور انسانی ذہن کو تمام اشیاء پر ترجیح دی۔ اس دور میں ہر شے کو "آسمان نکتہ نگاہ" سے دیکھا جاتا تھا، جن میں انسانی عقل کی چنداں اہمیت نہ تھی۔ کیوں کہ کلیسا ناقص کہہ کر اس کی مذمت کرتی تھی۔

کلیسا کے نزدیک عقل کا استعمال ممنوع تھا۔ خصوصاً شک کرنا تو حرام تھا لیکن ڈیکارٹ نے اس رویے پر کاری وار کیا اور عقل کی افادیت اور اہمیت کو سب پر ترجیح دی۔

ڈیکارٹ کی تعریف سُن کر سویڈن کی رانی نے اس کو مدعو کیا کہ آ کر اسے فلسفہ پڑھائے۔ فلسفہ پڑھنے کے لیے رانی نے سویڈن کی سخت سردی میں صبح پانچ بجے کا وقت طے کیا۔ ڈیکارٹ کو سخت سردی میں صبح چار بجے اُٹھنا پڑتا اور رانی کو پڑھانا پڑتا۔

یہ نازک مزاج فلسفی سردی کی تاب نہ لا سکا اور فروری 1650ء میں نمونیے میں مبتلا ہو کر انتقال کر گیا۔

رینی ڈیکارٹ کا فلسفہ

"کسی بھی قوم کے تہذیب یافتہ ہونے کا براہِ راست تعلق اس کی فلسفیانہ برتری پر ہے اور ریاست کے نزدیک بڑی سے بڑی نیکی یہ ہو سکتی ہے کہ اس کے پاس بہترین فلسفہ ہو۔"(۱)

ڈیکارٹ نے نوجوانی کی عمر میں فلسفہ پڑھنا شروع کیا اور جوں جوں پڑھتا گیا اسے اپنے جاہل ہونے کا احساس زیادہ ستانے لگا اور اندرونی بے یقینی کی کیفیت بڑھنے لگی۔ اسے پڑھی اور سُنی ہوئی باتوں پر شک گزرنے لگا اور وہ اس نتیجے پر پہنچا کہ "صحیح علم کا حصول صرف عقل کے ذریعے ہی ممکن ہے، حواس جو کچھ بتاتے ہیں ان پر مکمل بھروسہ نہیں کیا جا سکتا، کیوں کہ حواس اکثر دھوکہ دے جاتے ہیں۔"(۲)

یوں وہ عقل یعنی ذہن اور حواس یعنی جسم کے درمیان واضح فرق محسوس کرنے لگا اور آگے

---

(1)-Modern Philosophy By: Copleston S.J. Page:67.

(2)-Meditations (vith) By: Descarts, Page:164 (Pinguncl ossics)

چل کر اس نے ذہن کو جسم پر ترجیح دی۔

اس نے ایک نہایت فلسفیانہ سوال کیا ''جسم اور ذہن کا آپس میں کیا تعلق ہے؟'' یہ وہ سوال ہے جو رینی ڈیکارٹ کے بعد آنے والے فلسفیوں کے لیے ڈیڑھ صدی تک موضوعِ بحث بنا دیا۔ رینی ڈکارٹ اپنی مشہور عالم کتاب Meditation میں لکھتا ہے کہ ''مَیں کہتا ہوں کہ جسم اور ذہن میں بہت زیادہ فرق ہے۔ جسم کو چھوٹے چھوٹے ذرّات میں تقسیم کیا جا سکتا ہے، مگر ذہن کو بالکل بھی تقسیم نہیں کیا جا سکتا، جسم کے کسی عضو کو جسم سے الگ کر سکتے ہیں مگر ذہن کے کسی بھی حصے یا رو مثلاً خواہش، محسوسات وغیرہ کو ذہن سے جدا نہیں کیا جا سکتا۔ پورے کا پورا ذہن ایک اکائی (Unit) ہے۔ میرے سمجھنے کے لیے اُوپر کہی گئی بات ہی کافی ہے کہ ذہن اور جسم ایک دوسرے سے مختلف ہیں۔

رینی ڈیکارٹ جدید فلسفے کا بانی ہے اور ہر بات کو سمجھنے کے لیے عقلی استدلال استعمال کرنے کی بات کرتا ہے۔ اس کا مشہور جملہ ہے۔ ''Cogito Ergo Sum'' یعنی ''مَیں سوچتا ہوں اس لیے مَیں ہوں۔''

رینی ڈیکارٹ آگے چل کر دلیل دیتا ہے کہ ''ہو سکتا ہے کہ میرا وجود ہی نہ ہو یا ہے، جو موجودات ہیں یہ حواس کا فریب ہو۔ لہٰذا حقیقت تک پہنچنے کے لیے مجھے حواس پر شک کرنا چاہیے لیکن اس سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ شک کرنے کے لیے بھی شک کرنے والے کا وجود ضروری ہے، جیسا کہ میں شک کرتا ہوں لہٰذا مَیں شک کرنے والی ہستی ہوں، اسی لیے میرا وجود ہے۔''[1]

رینی ڈیکارٹ نے روح اور وجودِ خدا کے بارے میں کافی بحث کی ہے۔ اس کے خیال میں خدا کا وجود، انسان کی خودی، زمان و مکان، حرکت اور ریاضی کی سچائیوں (Axioms) کے بارے میں تصورات، انسان کے ذہن میں پیدائشی طور پر موجود ہیں۔ اس کے لیے کسی حس یا تجربے کی ضرورت نہیں ہے۔ تجربہ یا حواس صرف بالا تصورات کو لاشعور کے خانے سے نکال کر شعور میں لاتے ہیں۔ اس سے ڈیکارٹ یہ نتیجہ اخذ کرتا ہے کہ ''روح تجربے کی پیداوار نہیں ہے۔'' یہ روح انسان میں سوچ اور فکر پیدا کرنے میں اہم کردار ادا کرتی ہے، مگر یہ استدلالی روح مکمل طور پر غیر مادی ہے، کیونکہ فکر یا استدلال نہ وزن رکھتا ہے، نہ جگہ گھیرتا ہے، نہ ہی لمبائی چوڑائی ہے۔ مطلب یہ کہ اس میں کوئی بھی مادی خوبی نہیں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جب مادی جسم فنا ہو جاتا ہے۔ تو روح پر کوئی اثر نہیں پڑتا اور یہ باقی رہتی ہے۔

(1)-Discource on the method of property conducting one's reason and of seeking the truth in the Science, By:Descartes. Page:54.

رینی ڈیکارٹ اپنے استدلال / عقل کے ذریعے اس نتیجے پر پہنچا ہے کہ حقیقت کے دو رُخ ہیں ایک سوچ دوسرا جسم۔ خدا ان دونوں چیزوں سے بالاتر ہے اور ان کا خالق بھی ہے۔ خدا اور عقلی دلیل کے بغیر کائنات کی ہر شے میکانکی انداز میں کام کرتی ہے۔ بالفاظِ دیگر تمام موجودات، حیوانات اور نباتات مشینیں ہیں اور یہ طبعی قانون کے تحت عمل کرتی ہیں۔ سوچ جسم کے اثر سے آزاد اور جسم کے اعمال سوچ سے آزاد ہیں لیکن اگر انسانی جسم ایک مشین ہے تو اس پر غیر مشین یعنی دماغ یا روح کنٹرول کس طرح رکھ سکتا ہے؟

اس سوال کا جواب دیتے وقت رینی ڈیکارٹ اپنا اعتماد کھو بیٹھا اور مایوسی میں جواب دیا ''خدا جسم اور ذہن کے درمیان پُراسرار طریقے سے رابطہ کراتا تھا لیکن یہ ہماری محدود فہم سے بالاتر ہے۔''

رینی ڈیکارٹ نے جب اپنے ذہن کے خانوں کی پڑتال کی تو اسے یہ یقین ہو گیا کہ اس کے ذہن میں خدا کا تصور ایک ''کامل ذات'' کے طور پر موجود ہے۔ اس کی دلیل ہے کہ اگر کوئی کامل ذات نہ ہوتی تو اس کا تصور بھی ہمارے ذہن میں نہ ہوتا۔

ہم جو غیر کامل ہیں، ایک کامل ذات کا تصور کیسے کر سکتے ہیں۔ اگر کوئی کامل ہو ہی نہ تو؟ اس طریقے سے رینی ڈیکارٹ یہ یقین دلانے کی کوشش کرتا ہے کہ خدا خود انسان کے ذہن میں اپنی خدائی کا تصور ڈالتا ہے، جیسا کہ رینی ڈیکارٹ بنیادی طور پر افلاطون سے متاثر تھا۔ اس لیے وہ حقیقت کی دو صورتوں یعنی سوچ اور مادے کا قائل تھا۔ یعنی دوئی / ثنویت پسند تھا۔

باروح اسپائینوزا (Spinoza)

اسپائینوزا 24 نومبر سن 1632ء میں ہالینڈ کے شہر ایمسٹرڈم میں پیدا ہوا۔ اس کے آباؤاجداد دراصل پورچوگال کے یہودی تھے' جو ہجرت کر کے ہالینڈ میں آباد ہو گئے تھے۔

اسپائینوزا کو بچپن ہی سے یہودی مذہب اور یہودیوں کی عبادت گاہ سینا گوگ سے شدید محبت تھی' جس کی وجہ سے اس نے یہودی مذہب اور تاریخ کی تعلیم حاصل کرنا شروع کی۔ وہ توریت اور انجیل کے مطالعے میں اس قدر محو ہو گیا کہ ان کتابوں میں کی گئی تشریحات پر اعتراضات کرنے لگا۔

''اس قدر کہ اس کا اپنا عقیدہ اور ایمان کمزور پڑنے لگا اور وہ شک میں پڑ گیا۔ شاید مادہ' خدا کا جسم ہے' ہو سکتا ہے کہ فرشتے انسانی ذہن کی پیداوار ہوں' بائبل لاقانونیت کے متعلق کچھ بھی نہیں کہتی۔۔۔ وغیرہ وغیرہ۔''(1)

اسپائینوزا کے یہ اعتراضات اس قدر طاقت ور تھے کہ یہودی مذہبی رہنما (جن کو ربی کہا جاتا تھا) سخت خوف زدہ ہو گئے اور اسپائینوزا کو لالچ دیا کہ اگر وہ اپنی زبان بند رکھے اور کبھی کبھار سینا گوگ کا صرف چکر لگا لیا کرے تو اسے 1000 فلورنس سالانہ دیئے جائیں گے۔

اسپائینوزا نے یہودیوں کی پیش کش کو سختی سے ٹھکرا دیا اور اپنا کام جاری رکھا۔ یہودیوں نے مشتعل ہو کر اسپائینوزا پر قاتلانہ حملہ کروا دیا مگر یہ سخت زخمی ہونے کے باوجود بچ نکلا۔ آخر کار ربیوں نے مل کر اسپائینوزا کو یہودیت سے خارج قرار دے دیا اور اس کے خلاف مرتد ہونے کا فتویٰ جاری کر ڈالا۔

یہودیت سے اخراج کا مطلب محض مذہب سے علیحدگی نہیں تھی بلکہ یہ ساری یہودی قوم

(1)-The age of Laus xiv By:Will Dirrant, Page:621.

اور ثقافت سے بھی علیحدگی تھی۔ فتوے میں یہ حکم صادر کیا گیا تھا کہ کوئی بھی یہودی اسپائینوزا کے ساتھ کسی بھی قسم کا لین دین یا کوئی بھی تعلق نہیں رکھے گا۔ تمام یہودیوں کے لیے لازمی قرار دیا گیا کہ وہ اسپائینوزا کو 'ملعون' جانیں اور اس کو لعنت ملامت کرنا کارِ ثواب سمجھیں۔

مذہب اور قوم سے اخراج کے بعد اسپائینوزا بالکل تنہا اور بے یارومددگار ہو گیا' لیکن وہ گھبرایا بالکل نہیں۔ اس کے عزیز و اقارب' دوست احباب' حتیٰ کہ بہن نے بھی منہ موڑ لیا لیکن اس کے باوجود اسپائینوزا پرسکون رہا۔

اس نے ایک عیسائی سے کمرہ کرائے پر لے کر وہاں رہائش اختیار کی۔ گزر بسر کے لیے عینک سازی کا کام شروع کیا۔ عینکوں کے لیے شیشے کاٹنا اور ان کو پالش کرنے کا ہنر اس نے اسکول میں سیکھا تھا جو اس کے کام آ گیا۔

اسپائینوزا نے اپنے کمرے تک محدود رہنے کے باوجود فلسفے کا گہرا مطالعہ کیا۔ اسے فلسفے سے عشق تھا اور وہ سب سے پہلے اپنے عہد کے فلسفی رینی ڈیکارٹ سے بہت زیادہ متاثر ہوا اور ایک کتاب (Principles of Philosophy) لکھی، جو اس کی زندگی میں ہی یک فرضی نام سے شائع ہوئی۔ نیز اس کی شہرۂ آفاق اور دھماکہ خیز کتاب Ethics اس کے انتقال کے بعد شائع ہوئی۔

اسپائینوزا کی کتابوں پر شدید ردِعمل ہوا۔ اسے ہر روز گالیوں اور دھمکیوں بھرے خطوط ملنے لگے۔ چند خط اسے ہدایت کرنے کے لیے ہوتے۔ کافی خطوط اس کی ہمت افزائی اور مداح سرائی میں ہوتے لیکن خطوط کی اکثریت لعنت و ملامت سے بھرپور ہوتی۔ نمونے کے طور پر اس کے ایک سابق شاگرد والبرٹ کے ایک خط سے اقتباس ذیل میں دیا جاتا ہے۔

''تمہیں یہ جرأت کیسے ہوئی کہ تم اپنے آپ کو تمام نبیوں، ولیوں، شہیدوں، مجتہدوں اور پادریوں سے بھی بہتر سمجھتے ہو؟ کمینے انسان' مٹی کے کیڑے' کیڑوں کی خوراک' کہاں تمہارا کفر اور کہاں لازوال دانش مندی۔ تم نے جو ایک بے وقوفانہ، جاہلانہ اور افسوس ناک لعنتی نظریہ پیش کیا ہے تو تمہارے پاس اس کا کیا ثبوت ہے۔ شیطان کہیں کے۔۔۔''(1)

اسپائینوزا کا فلسفۂ مابعد الطبیعات

رینی ڈیکارٹ نے جہاں پر اپنے فلسفے کا اختتام کیا تھا، اسپائینوزا نے وہاں سے شروعات کی ڈیکارٹ نے حقیقت کے دو روپ بتائے تھے۔ یعنی ذہن اور مادہ جو کہ دونوں خدا کے تخلیق کردہ

(1)-The Story of Philosophy By: Will Durrant, Page:159.

تھے۔ ڈیکارٹ ذہن اور جسم کو دو بالکل الگ روپ دیتا ہے۔

اسپائینوزا، ڈیکارٹ کی ثنویت کو احدیت میں تبدیل کرتا ہے اور ذہن و جسم کو دو کے بجائے ''ایک'' حقیقت مانتا ہے، جو ایک ہی بنیادی عنصر (Substance) یا ہستی کے دو رخ ہیں۔

''خدا، اسپائینوزا کہتا ہے' ہستی کی بنیاد ہے اور ذہن و مادے کی کثرت کو وحدت میں تبدیل کرتا ہے۔ خدا مادہ نہیں ہے (اس لیے اسپائینوزا مادہ پرست Materialist نہیں ہے) مگر مادہ خدا کی ایک صفت ہے اور خدا ذہن بھی نہیں ہے' مگر ذہن صرف خدا کی دوسری صفت ہے۔ خدا یا بنیادی وجود فطرت سے مطابقت رکھتا ہے۔ بالالفاظ دیگر فطرت بھی خدا کے وجود کا حصہ اور خدا کے وجود کی مظہر ہے۔ اس لیے اسپائینوزا، ہمہ اوست (Pantheism) کا قائل ہے۔''[1]

اسپائینوزا کے نظریے کے مطابق ہر شے خدا میں ہے۔ خدا ہر شے پر محیط ہے۔ کوئی بھی شے خدا سے باہر نہیں ہو سکتی۔ کیوں کہ خدا محدود نہیں ہے۔ انسان خدا کی صرف دو صفتوں یعنی ذہن اور مادے سے واقف ہے۔ ہو سکتا ہے کہ خدا کی مزید صفات بھی ہوں۔

مادے کے تمام انفرادی روپ مل کر خدا کا جسم جوڑتے ہیں اور سارے انفرادی ذہن خدا کے ذہن کا حصہ ہیں۔ اسی طرح کائنات کا ذرّہ ذرہ خدا کے وجود کا حصہ ہے اور انسانی ذہن خدا کے ''کل ذہن'' کا ایک ننھا ''جز'' ہے۔

کائنات میں ہونے والی ہر حرکت فطری قوانین کے تحت ہوتی ہے۔ کسی بھی قسم کی حرکت دراصل کسی محرک (Cause) کا نتیجہ (Effect) ہے اس طرح بات اوّلین محرک (First Cause) یعنی خدا تک جا پہنچتی ہے۔ یہ فطری قوانین کیا ہیں۔ اسپائینوزا کے بقول یہ فطری قوانین خدا کی مرضی یا منشاء کا دوسرا نام ہیں۔ خدا کی مرضی کا کوئی بھی خارجی سبب نہیں ہے، کیوں کہ خدا کے سوا کوئی خارجی وجود ہے ہی نہیں۔ خدا کی منشاء کا سبب خود خدا ہے' جو کہ ہر خواہش سے بالاتر اور بے نیاز ہے۔

جیسا کہ فطرت کا ہر عمل' محرک اور نتیجے' (Cause & Effect) کی وجہ سے ہی ظہور پذیر ہوتا ہے۔ اس لیے کوئی بھی معجزہ ممکن نہیں ہے کیوں کہ معجزے کا مطلب خدا کی منشاء یا قانونِ فطرت میں رخنہ ڈالنا ہے، جیسا کہ معجزہ خدا کی منشاء کے خلاف ہے۔ اس لیے یہ ناممکن ہے کیوں کہ خدا کی منشاء کے خلاف کچھ بھی ممکن نہیں ہے۔

جہاں سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ پھر برائی کا محرک کون ہے؟ اگر ہر ایک شے محرک کی محتاج ہے

---

(1)-The age of Lous xiv By:Will Durrant, Page:637.

اور اوّلین محرک خدا ہے تو پھر کیا بُرائی کا اوّلین محرک بھی خدا ہے؟

اس سوال کا جواب بھی وِل ڈیورانٹ، اسپا ئینوزا کے فلسفے سے دیتا ہے۔ نیکی اور بدی، خوب صورتی اور بدصورتی، انسان کے موضوعاتی (Subjective) فیصلے ہیں۔ بالکل یوں جس طرح گرم اور سرد کا تعین خارجی ماحول یا ہمارے فائدے، نقصان کرتے ہیں۔

اس جواب پر برٹرینڈ رسل تبصرہ کرتے ہوئے لکھتا ہے ''اسپا ئینوزا کا ارادہ انسان کو خوف کے عذاب سے نجات دلانا ہے۔ آزاد انسان، موت سے کم تر بات سوچتا ہی نہیں ہے۔''[1]

جیسا کہ انسان ایک حقیقت کا جز ہے۔ اس لیے فنا نہیں ہوتا لیکن یہ بقا انفرادی نہیں بلکہ اجتماعی ہے۔ انفرادی بقا کا مطلب ہے کہ انسان اپنے شعور سمیت زندہ رہے جو اسپا ئینوزا کے بقول ممکن نہیں ہے۔ انفرادی شعور جسم کے فنا ہونے کے ساتھ ختم ہو جاتا ہے۔

فلسفۂ اخلاق / نیکی

اسپا ئینوزا کا نظام اخلاق اس کے مابعد الطبیعات کی طرح احدیت پر مشتمل ہے جیسا کہ اسپا ئینوزا یونانی فلسفے سے متاثر تھا۔ لہٰذا اس کا نظامِ اخلاق ارسطو سے مماثلت رکھتا ہے۔ ارسطو کے ہاں زندگی کا اصول' خوشی کا حصول ہے اور خوشی نیکی سے جنم لیتی ہے۔ اسپا ئینوزا کے ہاں بھی کردار کا نصب العین خوشی ہی ہے۔ خوشی کا مطلب ہے ''لذت کی موجودگی اور اذیت' دُکھ اور درد کی غیر موجودگی'' مگر اسپا ئینوزا کے نزدیک لذت اور اذیت کی حقیقت کوئی حقیقت مطلق نہیں ہے، جب انسان اپنی تکمیل کے ادنیٰ درجے سے اعلیٰ درجے کی طرف سفر کرتا ہے تو اسے بے انتہا خوشی ہوتی ہے۔ دوسرے لفظوں میں تکمیلِ ذات کی جدوجہد میں ہی خوشی ہے۔ اسی طرح اذیت یا عذاب وہ ہے کہ انسان اپنی تکمیلِ ذات کے اعلیٰ درجے سے ادنیٰ درجے کی طرف یا بلندی سے پستی کی طرف سفر کرے۔

تکمیلِ ذات کا سفر کرنے کے لیے ایک عدد وجود یا نفس کی ضرورت ہوتی ہے اور نفس کی بقا کا مسئلہ اوّلین ہے اس لیے انسان کا ہر عمل اس کے وجود کی بقا کے لیے ہوتا ہے۔ ہر وہ عمل جو کہ نفسی بقا کے لیے ضروری ہوتا ہے' وہ نیکی ہے (یہاں اسپا ئینوزا کا مقصد ذاتی بقا کے ساتھ انسانی بقا بھی ہے)

اسپا ئینوزا حسنِ سلوک پر زور دیتے ہوئے نفرت ختم کرنے کے لیے کہتا ہے۔ ''نفرت کا جواب نفرت سے نہیں بلکہ محبت سے دینا چاہیے۔ نفرت کا مطلب اپنی ذات کی کمزوری کا اعتراف ہے۔ اسپا ئینوزا لکھتا ہے۔ ''انسان صرف اس دشمن سے نفرت کرتا ہے جو اس سے طاقت ور ہو۔ کم

زور دشمن سے نفرت نہیں ہوتی۔"

انسان کے لیے سب سے بڑی نیکی یہ ہے کہ وہ حقیقتِ کبریٰ کو سمجھنے کی کوشش کرے "جو بھی انسان اپنے آپ کو پہچاننے اور اپنے جذبوں کو سمجھنے کی کوشش کرتا ہے، وہ یقینی طور پر خدا سے محبت کرتا ہے۔"(1)

اسی طرح خدا سے دانش ورانہ محبت کی جا سکتی ہے جو کہ ایک اعلیٰ ترین نیکی ہے۔ خدا سے محبت تب ہی ہو سکتی ہے جب انسان خود کو پہچاننے کی کوشش کرے۔ خدا کو پہچاننے کے لیے انسان کو اپنے آپ کو اور اپنے جذبوں کو پہچاننا پڑتا ہے کیوں کہ جذبات اکثر عقل کے خلاف ہوتے ہیں اور انسان کو خلافِ عقل، عمل کرنے کے لیے اُکساتے رہتے ہیں۔ لہٰذا ضرورت اس بات کی ہے کہ ان جذبوں کو سمجھا جائے جو انسان کے عقل و فہم سے ٹکراتے ہیں۔

جو جذبات فہم سے ٹکرائیں، ان کو چھوڑ دیا جائے تا کہ خدا کو پہچانا جا سکے۔ کیوں کہ خدا کو پہچاننے کے لیے جذبے کے بجائے عقل کی ضرورت پڑتی ہے۔

جب انسان عقل سے کام لیتا ہے اور عقل کے ذریعے جبلت پر قابو پاتا ہے تو اس کے اندر ایثار اور آزادی کا جذبہ پیدا ہوتا ہے یوں دھیرے دھیرے عقل حاوی ہوتی جاتی ہے۔

نفس کی غلامی سے آزاد شخص میں ایک توازن اور سکون کی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے، جو اس کے اندر دوسرے انسان کے لیے ہمدردی اور برابری کا احساس پیدا کرتی ہے۔ اس منزل پر پہنچ کر یہ پُرسکون انسان تمام انسانوں کی بھلائی کے لیے سوچتا ہے اور خود کوئی بھی ایسا کام نہیں کرتا ہے جس سے دوسرے انسانوں کو تکلیف پہنچے۔

اسپائینوزا خدا سے نیکی کا کوئی صلہ طلب نہیں کرتا ہے کیوں کہ خدا پر نیکی کا اثر نہیں ہو سکتا۔ نیکی خود اپنا صلہ آپ ہے (Virtue is itsownrewaid) سکونِ قلب اور لازوال مسرت صرف نیکی سے ہی مل سکتی ہے۔ یہی اسپائینوزا کی نیکی کا فلسفہ ہے۔

نفسیات اور ذہن

اُوپر یہ ذکر ہو چکا ہے کہ اسپائینوزا نے ڈیکارٹ کی دوئی کے فلسفے یعنی ذہن اور جسم کی ثنویت کو رَد کرتے ہوئے دونوں کو ایک ہی حقیقت کے دو روپ کہا ہے۔ ذہن جسم کا داخلی اور جسم ذہن کا

(1)-B Russel, Page:567.

خارجی روپ ہے۔ان دونوں کے عمل ایک دوسرے سے جدا نہیں ہیں۔''ذہن کا فیصلہ اور جسم کی خواہش ایک دوسرے سے الگ نہیں کیے جا سکتے، کیوں کہ یہ ایک ہی چیز کے دو نام ہیں۔ذہن کا کوئی بھی فیصلہ جسمانی خواہش کے برعکس نہیں ہو سکتا۔''(۱)

جسم کی سب سے بڑی خواہش وجود کی بقا ہے۔لہٰذا ذہن ہر ممکن کوشش کرتا ہے کہ بقا کو کوئی خطرہ درپیش نہ ہو۔اس طریقے سے اسپائینوزا کی نگاہ میں مرضی یا اختیار (Will) کچھ اور نہیں بلکہ ایک شدید خواہش کا نام ہے۔لہٰذا آزاد رائے یا خود اختیاری (Free will) ایک فریب ہے۔ انسان کی مرضی ''آزاد'' ہو ہی نہیں سکتی۔کیوں کہ یہ ''شدید خواہش'' کا تبدیل شدہ روپ ہے اور انسان کا عمل اس شدید خواہش یا مرضی کے طابع ہوتا ہے۔

ایک دوسری جگہ اسپائینوزا لکھتا ہے کہ اگر انسان اپنے آپ کو سمجھنے کی کوشش کرے تو وہ کسی حد تک خواہش پر قابو پا سکتا ہے۔ورنہ دوسری صورت میں انسان کے لیے اس کے سوا کوئی دوسری راہ نہیں ہے کہ وہ شدید خواہش کا غلام بن کر رہے۔انسان سمجھتا ہے کہ وہ آزاد ہے مگر در حقیقت وہ اپنے فیصلوں کی پشت پر پوشیدہ اسباب کو نہ سمجھنے کی وجہ سے یہ کہہ رہا ہوتا ہے۔

سیاسی فلسفہ

اخلاقیات کی طرح اسپائینوزا کا سیاسی فلسفہ بھی اس کے مابعدِ طبیعات کے زیرِ اثر ہے۔وہ خوف اور اُمید کو انسانی جدوجہد کا اہم سبب قرار دیتا ہے۔یہ دونوں جذبے پھر ایک نیک جذبے یعنی بقائے وجود کے تحت کام کرتے ہیں۔

انسان جب فطری حالت میں رہتا ہے تو وہ ہر وقت حالتِ جنگ میں رہتا ہے کیونکہ وہاں جس کی لاٹھی اس کی بھینس والی بات ہے۔وہاں قوت ہی سب کچھ ہے اور انسان ہر وقت خوف کی زندگی گزارتا ہے۔وہ فطرتاً آزاد ہوتے ہوئے بھی آزاد نہیں ہے۔نیز ہر وقت بقا کی فکر انسانی ذہن کو ترقی نہیں کرنے دیتی۔ان سب باتوں کو مدِنظر رکھتے ہوئے تمام انسان ایک مشترکہ معاہدہ کرتے ہیں جس کے ذریعے ایک منظم سماج اور ریاست کا وجود عمل میں آتا ہے۔

''منظم سماج کا مقصد ہے امن اور تحفظ۔بہترین ریاست وہ ہے جہاں انسان اتحاد سے رہ سکیں اور وہاں قانون شکنی ہرگز نہ کی جائے۔''(۲)

---

(1)-Ethics Appendix By:Spinoza.

(2)-Poltical Treatise, By:Spinoza 5,10.

مابعدِ طبیعات میں اسپائینوزا کے ہاں جہاں انفرادی ذہن خدا کے ذہن کا حصہ اور انفرادی جسم خدا کے وجود کا حصہ ہے۔ اس طرح سماج میں پھر انفرادی قوتیں ریاستیں قائم کرتی ہیں۔ ریاست کا مطلب اجتماعی قوت ہے۔ فرد اپنی کچھ انفرادی قوت اور کچھ آزادی ریاست کو دیتا ہے تا کہ وہ بے خوف ہو کر اپنی زندگی گزار سکے اور فطری زندگی کی مشکلات سے آزادی حاصل کی جا سکے۔

ریاست کا سب سے اہم اور معتبر مقصد انسان کو ایک اعلیٰ آدرشی زندگی گزارنے میں مدد دیتا ہے، جب انسان کو آزادی اور بے خوفی میسر ہوتی ہے تو تب ہی وہ اعلیٰ اخلاق اور نیک زندگی گزار سکتا ہے۔ اپنے آپ کو پہچاننے کا معاملہ بھی پھر آسان ہو جاتا ہے۔

''منظم ریاست میں انسان جبلت اور خواہش کی بجائے عقل کے ماتحت زندگی گزارتا ہے۔ عقل کی رہبری میں انسان جذباتی کشمکش سے نکل کر منزلِ مقصود تک پہنچ جاتا ہے اور روحانی سکون حال کرتا ہے، جو انسان کے لیے انتہائے کمال ہے۔''(۱)

اسپائینوزا اپنے مقالے میں بادشاہت، اشرافیت اور جمہوریت پر بحث کرنے کے بعد جمہوریت کو بہتر نظامِ حکومت قرار دیتا ہے کیوں کہ جمہوریت انسان کو برابری کا درجہ دیتی ہے جو کہ انسانی فطرت سے ہم آہنگ ہے۔

اسپائینوزا بادشاہی نظامِ حکومت کے وجود کا سختی سے انکار کرتا ہے کیوں کہ کسی بھی ایک شخص کی ذات اس قدر جامع نہیں ہو سکتی کہ وہ پوری قوم کے مقاصد اور مفادات کا احاطہ کر سکے۔

ریاست میں موجود نظام کی خوبیاں بتاتے ہوئے اسپائینوزا لکھتا ہے:

''ہر انسان کو یہ آزادی ہونی چاہیے کہ وہ اپنا مسلک خود منتخب کرے اور مذہبی رواداری کے ساتھ ساتھ ہر قسم کی رواداری اور قوتِ برداشت کو بھی ریاست یقینی بنائے۔''(۲)

اس کے علاوہ رائے اور اظہار کی آزادی کو بھی اسپائینوزا ریاست کی اہم خوبی بتاتا ہے۔ عقل مندانہ بحث اور تنقید سے نقصان کے بجائے فائدہ ہوتا ہے۔

اگر اس آزادی کو کچلنے کی کوشش کی جاتی ہے اور سوچوں پر تالے اور تقریروں پر پہرے لگائے جاتے ہیں تو اس کے خطرناک نتائج برآمد ہوں گے۔ یہ ممکن ہی نہیں ہے کہ ہر قسم کی فکر کو طاقت

---

(۱)۔ سیاسی فلسفہ از محمد مجیب، صفحہ نمبر 223

(2)-Poltical Treatise By:Spinoza.

کے ذریعے دبایا جاسکے، اگر اظہار کی آزادی کو دبایا گیا تو پھر بیوقوف، خوشامدی اور غیر مخلص لوگ چھا جائیں گے۔

اسپائینوزا انقلاب کی حمایت نہیں کرتا لیکن اگر ریاست غیر ضروری تسلط اور استعماریت کا ذریعہ بن جائے تو پھر کیا کیا جائے؟ اس حالت میں بھی اگر ریاست مناسب احتجاج کی اجازت دے بحث اور اظہار رائے پر کوئی پابندی عائد نہ کرے تو ریاست کے ناانصافی کے متعلق قوانین کی بھی پابندی کرنی چاہیے۔

اسپائینوزا ابھی سیاست پر اپنا مقالہ لکھ ہی رہا تھا اور بحث ابھی تمام نہیں ہوئی تھی کہ اس کی ٹی بی کی موروثی بیماری خطرناک حد تک بڑھ گئی۔

شیشوں کی دھول اور مٹی نے اس کے پھیپھڑوں کو لہولہان کر ڈالا، جس کی وجہ سے ہمارا فلسفی 44 سال کی عمر میں ہی دنیا سے رخصت ہونے پر مجبور ہو گیا۔ اس نے ٹی بی کا باقاعدہ علاج بھی نہ کرایا۔ کیوں کہ اسے موت بھی زندگی ہی کی طرح عزیز تھی۔ وہ سکون سے موت کا انتظار کرتا رہا اور ہنسی خوشی یہ جہاں چھوڑ کر چلا گیا۔

زندگی کے آخری دور میں اسے پذیرائی بھی خوب ملی۔ اس کے ایک مداح نے اپنی ڈھیر ساری جائیداد اسپائینوزا کے نام کر دی تھی، مگر اسپائینوزا نے اسے قبول کرنے سے انکار کر دیا۔ اسے ہائیڈل برگ یونی ورسٹی کی جانب سے فلسفے کا پروفیسر مقرر کرنے کی پیش کش کی گئی لیکن اس پروقار مفکر نے یہ کہہ کر معذرت کر لی کہ "وہ امن وسکون سے محبت کرتا ہے۔ اسے کوئی بھی لالچ نہیں ہے۔"

اپنی برادری اور پوری دنیا کی نفرت اور ذلت برداشت کرنے کے باوجود بھی یہ سچا انسان مسکراتا رہا اور نفرت کے بدلے محبت کا درس دیتا رہا۔

اسپائینوزا کو یہودیوں نے مرتد قرار دے کر مذہب سے خارج کر دیا۔ عیسائیوں نے اسے بے انتہا نفرت دی۔ اس کا سچا فلسفہ خدا کے تصور سے بھرپور ہے مگر اس کے باوجود مذہبی انتہا پسندوں نے اسے دہریہ قرار دیا اور لعنت ملامت کرتے رہے۔

سب کہاں کچھ لالہ وگل میں نمایاں ہو گئیں
خاک میں کیا صورتیں ہوں گی کہ پنہاں ہو گئیں

تجربیت

جان لاک

(1632ء تا 1704ء)

جان لاک (Locke) انگلستان کے علاقے سمرسیٹ میں سن 1632ء میں پیدا ہوا۔ 1632ء وہ عیسوی سال ہے جس نے دنیا کو دو عظیم فلسفی دیئے ایک جان لاک اور دوسرا اسپائینوزا۔

جان لاک اپنے عہد کا وہ فلسفی ہو گزرا ہے جس نے اپنے بعد آنے والے قریباً تمام فلسفیوں کو متاثر کیا۔ اسے فلسفے میں "تجربیت" (Empricism) کا بانی بھی کہا جاتا ہے۔

اس کے فلسفے نے مستقبل میں کئی ممالک اور وہاں کی سیاسی فکر پر گہرے اثرات چھوڑے لہٰذا اس کے سیاسی فلسفے کو سمجھنے کے لیے ضروری ہے کہ اس کے زمانے کے حالات اور انگلستان کی تاریخ مختصر الفاظ میں بیان کی جائے۔

سن 43ء میں رومیوں نے انگلستان پر قبضہ کر لیا۔ اس وقت انگلستان میں قبائل تھے۔ رومیوں نے انگلستان فتح کرنے کے بعد اسے رومی سلطنت کا صوبہ قرار دے دیا، جو قریباً سن 400ء تک رومی سلطنت کے زیر تسلط رہا، جب روم پر وحشی قبیلوں نے یلغار کی تو رومیوں نے انگلستان سے اپنے فوجی منگوا لیے' جس کی وجہ سے انگلستان کا دفاع بہت کمزور پڑ گیا۔ اس صورتِ حال سے فائدہ اُٹھاتے ہوئے جرمن قبائل نے انگلستان پر قبضہ کر لیا۔ وہ قبیلے یہ تھے۔

۱۔ اینگلس ۲۔ سیکسن ۳۔ جیوٹس

اینگلس اور سیکسنس نے جنوبی اور مغربی انگلستان پر قبضہ کر کے وہاں اپنی ''بادشاہت'' قائم کرلی، جو اینگلوسیکسن کے نام سے پکاری جاتی تھی۔ انگلینڈ نام بھی اسی بادشاہت سے لیا گیا ہے۔

سن ۵۹۷ء میں سینٹ آگسٹائن نے اس ملک کا دورہ کیا، جس کے نتیجے میں جیوٹس کا بادشاہ ایتھل برٹ عیسائی ہو گیا۔ سینٹ آگسٹائن نے کنٹر برے (Centerburry) میں مشہور گرجا گھر قائم کیا اور آہستہ آہستہ عیسائیت پورے انگلینڈ میں پھیل گئی۔

ریاست اینگلوسیکسن وقت گزرنے کے ساتھ سات چھوٹی چھوٹی بادشاہتوں میں تقسیم ہوگئی۔

گیارہویں اور بارہویں صدی میں بادشاہ اور اشرافیہ (Nobles) کے درمیان اقتدار میں حصہ داری کے معاملے پر کشمکش شروع ہوگئی اور چھوٹی چھوٹی بغاوتیں بھی ہونے لگیں۔ اسی دوران پورے یورپ میں کلیسا ایک بڑی طاقت کی حیثیت میں اُبھری۔ پادری خود کو خدا کے نمائندے تصور کرنے لگے اور بادشاہ سے عوام کے نچوڑے گئے لہو سے حصہ بھی لینے لگے۔ اس طرح کلیسا کے پاس کافی ساری دولت جمع ہوگئی، جس سے کلیسا نے کئی جائیدادیں خریدیں۔

کلیسا کی بڑھتی ہوئی طاقت خطرے کی گھنٹی بن گئی، جسے ہنری دوئم نے شدت سے محسوس کیا اور اس نے کلیسا پر حاوی ہونے کی کوشش کی، جس کے نتیجے میں کنٹر بری کا آرک بشپ مارا گیا۔ آرک بشپ کے مارے جانے پر عوام کے غم و غصے کی لہر دیکھ کر ہنری دوئم نے لوگوں کو خوش کرنے کے لیے انھیں کئی ''مذہبی حقوق'' دیے۔

1215ء میں میگنا کارٹا (Magna Carta) یعنی عظیم معاہدہ عمل میں آیا۔ اس وقت کے بادشاہ جان (John) کے کئی طبقوں سے تعلقات خراب تھے، جن میں پوپ انوسینٹ سوئم (Innocent III) بھی شامل تھا۔ جان کے خلاف بغاوت ہوئی اور عظیم معاہدہ عمل میں آیا، جس کے تحت ''بادشاہ'' کو انگریزی قانون کے ماتحت کر دیا گیا اور اس کے اختیارات کم کر دیے گئے۔ قبل ازیں بادشاہ ہر قسم کے قانون سے بالاتر تھا۔

تیرہویں صدی میں پارلیمنٹ کے وجود کو اہمیت ملی اور یہ طے پایا کہ بادشاہ پارلیمنٹ کی اجازت لیے بغیر ٹیکس نہیں لگائے گا۔ 1390ء کا سال اہمیت کا حامل ہے جب بادشاہ رچرڈ (Richard) نے پارلیمنٹ پر اپنا سکہ جمانے کی کوشش کی جس کے نتیجے میں اسے تاج وتخت سے ہاتھ دھونے پڑے اور پارلیمنٹ نے اس کے مخالف فریق کو بادشاہ منتخب کرلیا۔ (بادشاہت کی تاریخ

میں غالباً یہ پہلا بادشاہ تھا جسے پارلیمنٹ نے منتخب کیا۔)

سن 1466ء میں فرانس کے علاقے نارمنڈی (Normandy) کے ڈیوڈ ولیم نے انگلینڈ پر قبضہ کرلیا۔ اس نے عیسائیت کو فروغ دِلایا اور کئی گرجا گھر تعمیر کرائے۔

نارمن بادشاہت میں اینگلو سیکسنس کی حالت کسان و مزدور تک جا پہنچی لیکن وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اینگلس، سیکسنس اور نارمن قومیں آپس میں غلط ملط (Mix up) ہوگئیں اور ایک نئی قوم بن گئی۔ تینوں زبانیں ایک دوسری میں مدغم ہوگئیں اور ایک نئی زبان وجود میں آئی جسے ہم سب ''انگریزی'' کہتے ہیں۔

سن 1534ء میں ہنری ہشتم (Henry VIII) نے پارلیمنٹ سے یہ قانون منظور کرایا کہ انگلینڈ کے چرچ کا سب سے بڑا مذہبی رہنما یا روحانی پیشوا پوپ نہیں بلکہ خود بادشاہ ہے۔ پارلیمنٹ نے چند دوسرے قوانین بھی پاس کر کے کلیسا کی قوت میں کمی کی اور اس میں اصلاحات (Reforms) کیں جن کا اہم سبب یہ تھا کہ کیتھولک عیسائیت کے خلاف پروٹسٹنٹ فرقہ وجود میں آ چکا تھا اور پارلیمنٹ ممبران کی اکثریت پروٹسٹنٹ تھی۔

سن 1558ء میں میری (Merry) رانی بن کر تخت نشین ہوئی تو اس نے دوبارہ کیتھولک عیسائیت کو بہت زیادہ فروغ دلایا۔ کیوں کہ وہ خود کیتھولک تھی۔ میری کے بعد اس کی بہن الزبتھ (Elizabeth) تخت پر بیٹھی۔ الزبتھ کا دَور علم و ادب کا سنہری دَور تھا' جس میں بیکن (Bacon) جانسن (Johnson) کرسٹوفر مارلو (Marlow) اور شیکسپیئر پیدا ہوئے۔

الزبتھ کے بعد اس کا چچازاد جیمس اوّل (James-I) تخت نشین ہوا' جس نے پارلیمنٹ پر تسلط جمانے کی روایت دُہرائی۔ جیمس سمجھتا تھا کہ اس کے کاموں میں ٹانگ اُڑانے والی پارلیمنٹ کون ہوتی ہے؟ کیوں کہ اس کے خیال میں تو بادشاہ خدا کا نمائندہ اور ظلِ الٰہی ہے☆۔ نیز بادشاہت اور اقتدار خدا کی طرف سے عطا ہوتے ہیں نہ کہ پارلیمنٹ کی طرف سے۔ اس لیے بادشاہ جو چاہے سو کرے۔ پارلیمنٹ اور عوام کی چنداں اہمیت نہیں ہے۔

جیمس کا بیٹا چارلس اوّل (Charles-I) جب تخت پر بیٹھا تو اقتدار کی جنگ تیز ہوگئی۔

☆ جیمس اوّل کا دورِ اقتدار سن 1603ء تا 1625ء ہے۔ اکبر اعظم کا دورِ حکومت سن 1605ء میں ختم ہوا۔ اکبر اعظم نے خود کو ظلِ الٰہی کا خطاب دیا تھا۔ ممکن ہے جیمس نے ظلِ الٰہی بننے کا خیال اکبر اعظم سے لیا ہو۔

پیورٹنس، قانون دان اور پارلیمنٹ تینوں متحد ہو گئے اور انھوں نے بادشاہ کے خلاف بغاوت شروع کر دی' جس کے نتیجے میں ایک خونخوار خانہ جنگی شروع ہو گئی۔ شاہی افواج اور باغی فوجیں آمنے سامنے ہو گئیں اور باغی فوجیں جن کو عوام کی حمایت بھی حاصل تھی، سرخرو ہوئیں۔ باغی فوجوں کی قیادت کراموِیل (Cromwell) نے کی تھی۔ 1649ء میں بادشاہ کا سر قلم کر دیا گیا۔

بادشاہ کو مارنے کے بعد انگلینڈ ری پبلک بن گیا جس کا نام (Common Wealth of England) رکھا گیا، جس کا سربراہ کراموِیل کو بنایا گیا۔

کراموِیل نے بھی عوامی منشاء کو نظر انداز کر دیا اور اپنی ڈکٹیٹر شپ قائم کر ڈالی کراموِیل کے بعد اس کا بیٹا اقتدار نشیں ہوا تو اس کے خلاف بغاوتیں شروع ہو گئیں۔ پارلیمنٹ نے سن 1660ء میں بادشاہت بحال (Restore) کر ڈالی اور مقتول بادشاہ کے بیٹے چارلس دوم (Charles-II) کو بادشاہ بنا دیا گیا۔

جب چارلیس کا بھائی تخت پر بیٹھا تو اس نے بھی اپنے باپ دادا والی حرکتیں شروع کر دیں' جن کی وجہ سے اس کے باپ کا قتل ہوا تھا۔ وہ اقتدار پر مکمل تسلط چاہتا تھا اور اس نے کیتھولک ہونے کی وجہ سے کیتھولک عیسائیت کو سرکاری مذہب بنانے کی کوشش کی۔

جیمس کی بیٹی میری (Merry) ہالینڈ کے حکمران کے ساتھ بیاہی ہوئی تھی۔ جیمس کے انتقال کے بعد انگریز عوام نے ہالینڈ کے حکمران ولیم آف اورنج (Orange) سے درخواست کی کہ وہ انگلینڈ پر قبضہ کر کے انھیں کیتھولک بادشاہ کی اقتدارانہ ہوس سے نجات دلائے۔

سن 1688ء میں ولیم انگلینڈ آیا تو جیمس تاج و تخت چھوڑ کر فرانس فرار ہو گیا۔ ولیم اور میری دونوں اکٹھے تخت نشیں ہوئے اور پارلیمنٹ اور بادشاہ کی مرضی سے مشہور Bill of Rights پاس ہوا' جس کے مطابق بادشاہ کے لیے ضروری تھا کہ:

۱۔ پارلیمنٹ کی مرضی کے بغیر کوئی ٹیکس نہیں لگائے گا۔

۲۔ مستقل فوج نہیں رکھے گا۔

۳۔ ہمیشہ پروٹسٹنٹ رہے گا۔

لاک کی زندگی

لاک کی ابتدائی زندگی اور بچپن انگلینڈ کے خونریز متصادم اور سیاسی کشمکش کے دور میں گزرا۔

حالات کی سنگینی نے اس کے فلسفے پر بھی گہرے اثرات مرتب کیے۔

لاک نے آکسفورڈ میں تعلیم حاصل کی اور ارسطو کو خاص طور پر پڑھا۔ اخلاقیات، منطق اور جیومیٹری بھی سیکھی۔ سن 1658ء میں فارغ التحصیل ہو کر آکسفورڈ میں ہی درس و تدریس شروع کر دی۔ اسی دوران وہ ڈیکارٹ کو بھی نہایت دلچسپی سے پڑھنے لگا اور اس کے ساتھ ساتھ سن 1674ء میں میڈیکل کی ڈگری بھی حاصل کی۔

لاک ارل آف شیفٹس برے (Shaftesburry) کا ذاتی ڈاکٹر بھی تھا' جس کی وجہ سے وہ آہستہ آہستہ انگلینڈ کی سیاست میں شریک ہو گیا۔ اس کا والد پہلے ہی پارلیمنٹ کی طرف سے بادشاہی افواج کے خلاف لڑ چکا تھا۔ لاک متعدد سرکاری عہدوں پر بھی فائز رہا۔

سن 1675ء میں لاک فرانس چلا گیا، جہاں اس نے فرانس کے فلسفے اور سیاست کا گہرا مطالعہ کیا اور وہیں ڈیکارٹ کے فلسفے سے بنیادی اختلافات ہوئے۔ واپس لوٹ کر وہ دوبارہ آکسفورڈ میں پڑھانے لگا۔

سن 1683ء میں اس نے اپنے لیے خطرہ محسوس کرتے ہوئے خاموشی سے ہالینڈ کو ہجرت کی۔ اس کا مہربان شیفٹس بری پہلے ہی ہالینڈ میں پناہ حاصل کر چکا تھا۔

جب ڈیوک آف ہالینڈ اور میری انگلینڈ پر قبضہ کرنے آئے تو لاک بھی ان کے ہمراہ تھا۔ اس نے سن 1688ء کے انقلاب کا بہ چشمِ خود مشاہدہ کیا جس میں جیمس فرار ہو گیا۔ میری اور اس کا شوہر انگلینڈ کے حکمران بن گئے۔ نئی حکومت میں بھی لاک کو اہم انتظامی اور سیاسی منصب دیئے گئے۔ لاک نے اپنی ساری زندگی کے دوران انگلینڈ میں امن نہ دیکھا' اس فلسفی نے صرف خانہ جنگی اور خوں ریزی دیکھی۔ اسی کے دور میں ایک بادشاہ کا سر قلم ہوا تو دوسرے کو فرار ہونا پڑا۔

ان واقعات کے مشاہدے اور آکسفورڈ میں مطالعے نے اسے پختہ اور عظیم فلسفی بنا ڈالا۔

لاک نے ایک عشق بھی کیا جس نے اسے عقل سے بیگانہ کر دیا مگر شاید روحِ عصر کی بھی اپنی طاقت ہوتی ہے۔ لاک کے زمانے کے کسی بڑے فلسفی نے شادی نہیں کی مثلاً برانچے، فونٹی ٹیلے، ہوبز' اسپائنوزا اور لائبنز وغیرہ غیر شادی شدہ تھے۔

لاک نے بھی محبت کر کے وقتی طور پر عقل کو خدا حافظ کہا مگر اسے اپنی عقل زیادہ عزیز تھی۔ لہٰذا اس نے اپنی محبوبہ سے ترکِ تعلق کر کے دوبارہ عقل کا دامن تھام لیا اور زندگی بھر کنوارہ رہا۔

لاک کا سیاسی فلسفہ

لاک کا سیاسی فلسفہ انگلینڈ کے حالات و واقعات اور تاریخ و سیاست کے پس منظر کے ساتھ ساتھ ہوبز (Hobbes) اور فلمر (Flimmer) کے سیاسی نظریات کا جواب بھی ہے۔ اس نے 1690ء میں ''حکومت کے متعلق مقالے'' نامی کتاب لکھی۔

سر فلمر چارلس اوّل کا مشیرِ خاص تھا اور اس نے سنجیدگی کے ساتھ ایک ایسا نظریہ پیش کیا جسے آج کا انسان بھی پڑھنے کے بعد بیوقوفانہ نظریہ قرار دے گا لیکن فلمر نے اپنا سارا زورِ قلم استعمال کرتے ہوئے اپنے نظریے کو مدلل بنانے کی بھرپور کوشش کی۔ فلمر لکھتا ہے:

> ''خدا نے حضرت آدم کو نہ صرف پیغمبر بنا کر بھیجا بلکہ اسے دنیا کا بادشاہ بھی بنایا۔ حضرت آدم کے بعد یہ بادشاہت اس کے بیٹوں کے حصے میں آئی اور وہاں سے ہوتی ہوئی آج کل کے بادشاہوں تک پہنچی ہے۔ لہٰذا موجودہ بادشاہوں کو بھی اقتدار خدا نے ہی دیا ہے۔''[1]

فلمر کی دلیل یہ تھی کہ حضرت آدم کو کس پارلیمنٹ یا عوام نے منتخب کیا تھا' جب بادشاہت خدا نے دی تھی تو اقتدارِ اعلیٰ کا مالک بھی خدا ہے اور خدا کی طرف سے زمین پر اقتدارِ اعلیٰ کا مالک خدا کا نمائندہ بادشاہ ہے۔ بادشاہ کے خلاف بغاوت کا مطلب خدا کے خلاف بغاوت ہے۔ لہٰذا جو کوئی بھی ایسی بغاوت کرے گا۔ وہ بہت بڑا پاپ اور جرم کرے گا۔

فلمر کی دلیل یہ تھی کہ جب آدم علیہ السلام نے اپنی مرضی کی تو خدا نے اسے جنت سے نکال باہر کیا۔ اس لیے خدا کو یہ ہرگز پسند نہیں ہے کہ انسان اپنی مرضی کرے انسان کو چاہیے کہ وہ صرف خدا اور بادشاہ کی مرضی پر چلے ورنہ بڑا گناہ گار ہوگا۔

فلمر کے خیال میں پارلیمنٹ کا مقصد صرف بادشاہ کو مشورے دینا ہے۔ باقی بادشاہ کی مرضی پر منحصر ہے کہ ان پر عمل کرے یا نہ کرے۔ ملک کا قانون عوام کے لیے ہے۔ بادشاہ کے لیے نہیں۔ بادشاہ ہر قانون سے ماوراء اور خود قانون ہے۔ رعایا کے لیے بادشاہ کی حیثیت یوں ہے جیسے اولاد کے لیے باپ کی ہوتی ہے اولاد کا یہ فرض ہے کہ وہ باپ کا حکم مانے البتہ باپ کے لیے اولاد کی بات ماننا ہرگز ضروری نہیں ہے۔

1-History of Western Philosophy, By:B. Russal Page:597.

"لاک نے محسوس کیا کہ سب سے پہلے فلمر کو جواب دینا چاہیے اور عظیم انقلاب (Glorious Revolution) کا دفاع بھی کیا جائے۔ لاک نے دلیل دی کہ فطرت نے کسی بھی انسان کو کسی دوسرے انسان سے زیادہ حقوق نہیں دیئے ہیں اور تمام انسان برابر، آزاد، خود مختار اور اپنی مرضی کے مالک ہیں۔ ان کی رضامندی کے خلاف کوئی بھی انھیں محکوم نہیں بنا سکتا۔"(۱)

لاک دلائل کے ذریعے ثابت کرتا ہے کہ انسان کس طرح فطری طور پر آزاد اور استدلالی مخلوق ہے۔ تمام انسان دیگر انسانوں سے اپنی استدلالی قوت کے ذریعے ایک "سماجی معاہدہ" (Social Contract) کرتے ہیں اور اس معاہدے کے ذریعے وہ اپنے انصاف کرنے اور سزا دینے کے انفرادی حقوق اپنی ایک اجتماعی اور بڑی برادر کو سونپتے ہیں۔ وہ صرف "برادری" کی خاطر اپنے ان حقوق سے دست بردار ہوتے ہیں۔ نہ کہ بادشاہ کے حق میں۔ لہٰذا بادشاہ براہِ راست اور عوام کے سامنے جواب دہ ہے۔ کیوں کہ برادری/عوام اپنے اکثریتی ووٹ سے بادشاہ کو اپنا منتظمِ اعلیٰ منتخب کرتی ہے۔ بادشاہ بھی عام شہری کی طرح قانون کا پابند ہے۔ اگر وہ قانون شکنی کرے یا عوام کی منشاء کے مطابق نہ چلے تو عوام اسے تخت سے اُتارنے کا حق رکھتے ہیں۔

"تھامس ہوبز نے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی تھی کہ اگر حکومت کے اقتدار میں کوئی کمی آئی یا رعایا نے حکومت کی باقاعدہ مخالفت کی تو معاشرہ اور ریاست دونوں تباہ ہو جائیں گے۔ لاک نے جواب دیا کہ حکمران کی تبدیلی سے معاشرہ منتشر نہیں ہوتا۔ حکومت قائم رکھنے کے لیے عوام سے کسی قسم کی قربانی طلب کرنا بے جا ہے۔ حاکم کو کسی بھی صورت میں رعایا سے جان تو کُجا مال پر بھی کوئی اختیار نہیں ہے۔ عوام کی خواہشات اور ان کے حقوق کا تحفظ کرنا حکومت کی اوّلین ذمہ داری ہے۔"(۲)

لاک نے اپنے مقالے میں پارلیمنٹ کو بادشاہ سے طاقت ور بنانے کے ساتھ ساتھ اس بات پر بھی اصرار کیا کہ پارلیمنٹ یعنی قانون ساز ادارہ (Legisrature) انتظامیہ (Executive)

1-Age of Louis XIV By: Will Durrant, Page:580.

(۲)۔ سیاسی فلسفہ از محمد مجیب، صفحہ 212۔

اور عدلیہ میں (Check and Balance) بھی رکھیں۔حکومت کا کام صرف یہ ہے کہ وہ عوام کے جان و مال کی حفاظت کرے اور عوام کی آزادی سمیت دیگر حقوق کی حق تلفی نہ کرے۔

جان لاک کے نظریے نے فرانس میں والٹیر، مونٹیسکو اور روسو کو متاثر کیا اور امریکہ میں قبل از انقلاب اور بعد ازاں تھامس جیفرسن و دیگر کو متاثر کیا۔امریکی آئین زیادہ تر لاک کے فلسفے کا پرتو ہے۔اس میں انسانی حقوق (Civil Rights) والی ترامیم تو مکمل طور پر لاک کے نظریے پر مبنی ہیں۔امریکی عوام کی سوچ بھی لاک کے نظریات سے متاثر ہے۔

تجربیت اور لاک

''تجربیت (Empricism) کے معانی یہ ہیں کہ اشیاء کا علم صرف اور صرف تجربے کے ذریعے حاصل کیا جا سکتا ہے اور تجربے کا ذریعہ حواس ہیں۔''(۱)

افلاطون نے یہ نظریہ دیا تھا کہ اس دنیا کی ساری چیزیں دراصل حقیقی چیزوں یعنی امثال کا عکس یا پرتو ہیں۔حقیقی چیزیں یا امثال حقیقی دنیا میں ازل سے موجود ہیں۔افلاطون کے نظریے کے پیروکاروں کے لیے اس دنیا میں کوئی کشش نہیں ہے۔کیوں کہ جو کچھ ہے یہ تو ''وہیں'' ہے۔باقی تو صرف ان کا عکس ہے اور عکس کبھی بھی دائمی نہیں ہوا کرتے۔

اس نکتۂ نظر کے خلاف دوسرا نکتۂ نظر، یہ اُبھرا کہ امثال کا کوئی بھی حقیقی وجود نہیں ہے۔یہ محض افلاطون کے شاعرانہ ذہن کا خیالی پیکر ہے۔اس دنیا میں موجود اشیاء ہی حقیقی ہیں۔صدیوں تک یہ جھگڑا چلتا رہا کہ اصل دنیا کون سی ہے؟ یہ جس میں ہم رہتے ہیں یا وہ جو اس دنیا سے ماورا، کہیں امثال یا Model کی شکل میں موجود ہے۔

''اسی طرح کائنات کی حقیقت کے متعلق بھی دو نظریے وجود میں آئے، ایک افلاطون کا جسے توڑ مروڑ کر اس سے مذہب کی تصدیق کا کام لیا گیا اور دوسرا نظریہ یہ کہ کائنات صرف وہ ہے جو ہمارے حواس کے ذریعے تجربے اور مشاہدے میں آسکے۔آگے چل کر اسی نظریے نے (تحقیق اور تجربے کا راستہ اختیار کر کے) جدید سائنس کی بنیاد رکھی۔''

فرانسس بیکن نے یہ کہہ کر تجربیت کی بنیاد رکھی کہ ''علم کا خزانہ حواس ہیں اور تجربے، مشاہدے

(۱)۔روایاتِ فلسفہ، از: علی عباس جلالپوری، صفحہ ۹۴۔

مشاہدے کے بغیر علم حاصل کرنا ناممکن ہے۔

جان لاک کے سامنے بھی یہ ایک بڑا اُلجھاوہ موجود تھا کہ اصل جہان کون سا ہے؟ اور اس کے متعلق علم حاصل کرنے کے لیے کشف، وجدان اور الہام وغیرہ حقیقی ہیں یا علم صرف حواس کے ذریعے ہی حاصل کیا جا سکتا ہے؟

لاک نے آکسفورڈ میں فلسفے کے ساتھ ساتھ سائنس بھی پڑھی اور طب و کیمیا کا علم خاص طور پر حاصل کیا، جس کی بنیاد خالص تجربے و مشاہدے پر ہے۔

لاک نے تجربیت کی طرف داری کرتے ہوئے اسے اس حد تک فروغ دلایا کہ لاک کو (کسی حد تک) تجربیت کا بانی کہا جا سکتا ہے۔ اس نے ایک طویل مضمون ''انسانی فہم کے متعلق مقالہ'' (Essay Concerning Human Understanding) رکھا۔

ڈیکارٹ نے کہا تھا کہ انسان کے ذہن میں چند نظریے پیدائشی (Innate) ہوتے ہیں۔ لاک نے پہلا حملہ ڈیکارٹ کے اس نظریے پر کیا اور اسے رَد کرتے ہوئے انسانی ذہن کو کورا کاغذ کہا، جب بچہ پیدا ہوتا ہے تو اس وقت اس کا ذہن بالکل صاف ہوتا ہے، جس میں کسی بھی قسم کا کوئی نظریہ یا علم نہیں ہوتا ہے۔ ہاں البتہ اس میں پیدائشی طور پر کچھ عادتیں یا جبلتیں ہوتی ہیں، جو نہ صرف انسانوں بلکہ جانوروں میں بھی ہوتی ہیں۔ ان جبلتوں کو علم یا تصور نہیں کہا جا سکتا۔ اسی طرح کوئی بھی انسان پیدائشی طور پر خدا کے بارے میں یا نیکی اور بدی کے متعلق کچھ نہیں جانتا ہے۔

اس دنیا میں وارد ہوتے ہی انسان کے حواس اپنا کام کرنا شروع کر دیتے ہیں۔ یعنی سننا، سونگھنا، چھونا اور چکھنا، حواس جو کچھ محسوس کرتے ہیں۔ وہ فوراً ذہن کی طرف منتقل کر دیتے ہیں۔ ذہن ان معلومات کو محفوظ کرتا رہتا ہے (جیسے کسی کمپیوٹر میں ڈیٹا بیس وغیرہ) ذہن پہلے میسر معلومات کو اکائیوں (سادہ تصورات) کی شکل میں جمع کرتا رہتا ہے۔ لاک حواس کے معلومات جمع کرنے کے کام کو ''محسوسات'' کا نام دیتا ہے اور جب ذہن میسر معلومات کو پہچان اور سمجھ لیتا ہے تو اسے ادراک (Perception) کہتا ہے۔ محسوسات اور ادراک کا دوسرا نام ''تجربہ'' ہے۔ اگر ذہن کی خالی تختی پر حواس کے ذریعے کچھ بھی نقش نہ کیا جائے تو وہ کورا رہے گا اور اس میں کوئی خیال یا تصور پیدا ہو ہی نہیں سکے گا۔ مثلاً اگر کسی نومولود بچے کو کوئی آواز نہ سنائی جائے تو وہ آواز کے بارے میں کوئی تصور قائم نہیں کر سکے گا۔ بلکہ اس کے ذہن میں یہ خیال ہی نہیں اُبھرے گا کہ آواز بھی کوئی شے ہے اور بچہ

بول بھی نہیں سکے گا۔اسی طرح اگر حواس کے ذریعے کوئی بھی معلومات نہ ملے تو انسان کا ذہن نہ تو خدا کو پہچانے گا اور نہ ہی نیکی اور بُرائی کو۔

ثابت یہ ہوا کہ کسی بھی تصور اور علم کے حصول کے لیے حواس ہی واحد ذریعہ ہیں۔یعنی حواس کے ذریعے ہی مشاہدہ اور تجربہ کر کے علم حاصل کیا جا سکتا ہے۔

اگر کسی پیدائشی اندھے بچے کو بتایا جائے کہ گلاب کا رنگ سُرخ ہے تو وہ ''سرخ'' ہونے کو سمجھ ہی نہیں سکے گا، بے شک اسے سو مثالیں دی جائیں کہ گلاب کا رنگ لہو کی مانند سُرخ ہے لیکن جب نابینے نے لہو دیکھا ہی نہیں تو اسے کیا پتا چلے گا کہ خون یا گلاب کا رنگ کون سا ہے۔اس کے لیے تو رنگ بے معنی ہیں۔اس کے نزدیک تو ہر شے کا رنگ تاریک ہے۔لاک کے مطابق:

1۔ پہلے حواس معلومات جمع کر کے دماغ کی طرف منتقل کرتے ہیں۔

2۔ پھر دماغ ان معلومات کو پہچانتا اور سمجھتا ہے۔

3۔ پھر دماغ ان فہم شدہ معلومات کو یادداشت کے خانے کی طرف بھیجتا ہے۔اس مرحلے پر پہنچ کر میسر معلومات کسی خیال، تصور یا نظریے کی شکل اختیار کر لیتی ہیں۔

لاک کے بقول اشیاء کی کچھ بنیادی خاصیتیں اور کچھ ثانوی خاصیتیں ہوتی ہیں۔

بنیادی خاصیتیں یہ ہیں:

1۔ٹھوس پن	Solidity
2۔توسیع	Extention
3۔تعداد	Number
4۔حرکت یا سکون	Motion or Rest

ثانوی خاصیتیں یہ ہیں:

1۔ذائقے	Tastes
2۔آوازیں	Sounds
3۔رنگ	Colors
4۔خوشبوئیں اور بدبوئیں	Odors
5۔سرد گرم	Cold-Hot
6۔ہلکا، وزنی	Weights

لاک کہتا ہے کہ اشیاء کی بنیادی خصوصیات تو ان میں موجود ہوتی ہیں مگر ان کی ثانوی خصوصیات چیزوں کی بجائے ذہن کا ادراک ہیں جو حواس کے ذریعے بنیادی خاصیتوں سے پیدا ہوتا ہے۔ سادہ لفظوں میں کہا جا سکتا ہے کہ اشیاء کی بنیادی خاصیتیں اشیاء میں اور ثانوی خاصیتیں محسوس کرنے والے کے ذہن میں ہیں۔☆

لاک کے مطابق محسوسات کے ذریعے ذہن، پہلے معلومات کو اکائیوں میں تقسیم کرتا ہے اور پھر مختلف یکساں اکائیاں (Units) ملا کر مرکب تصور (Complex Idea) قائم کرتا ہے۔

اکائی یا واحد تصور یا سادہ خیال وہ ہے، جو ایک وقت میں ایک حس کے ذریعے حاصل ہو۔ مثلاً چائے کی مثال لی جائے یہ کئی سادہ تصورات کا مجموعہ یعنی پیچیدہ یا مرکب تصور ہے۔ اس میں (۱)۔ گرمی، (۲)۔ مٹھاس، (۳)۔ ترشی، (۴)۔ آب داری، (۵)۔ رنگ وغیرہ شامل ہیں۔ چائے کا علم اس وقت ہی ہو سکتا ہے جب حواس کے ذریعے ذہن ان تمام جمع شدہ سادہ خیالات یا اکائیوں سے واقف ہو۔ بالفاظِ دیگر کوئی بھی منطق (یا الہام وغیرہ) انسان کو اس چیز کا علم نہیں دے سکے گی۔

اسی طرح لاک نے ایک ہی وار سے مابعد الطبیعات، تصوف اور کشف وغیرہ کے قلعے مسمار کرنے کے علاوہ عقلیت پسندوں پر بھی کاری ضرب لگائی ہے۔

اگر علم حاصل کرنا ہے۔ چیزوں کے بارے میں جاننا ہے تو تجربے اور مشاہدات کریں۔ چلے اور مجاہدے آپ کو کوئی بھی علم نہیں دے سکتے۔☆☆

لاک کے فلسفے کے اثرات

لاک کے فلسفے کے اثرات سب سے پہلے لاک کے بعد آنے والے انگریز فلسفی یعنی برکلے (Berkley) اور ہیوم (Hume) پر ہوئے۔ ان کے بعد لاک نے فرانس، جرمنی، امریکہ

☆ بنیادی اور ثانوی خاصیتوں والے نظریے کے بابت پہلے گلیلو نے بات کی تھی مگر لاک نے اس پر تفصیلی بحث کر کے تجربیت پسندی کی باقاعدہ بنیاد رکھی۔

☆☆ مشرقِ وسطیٰ اور ایشیا کے مذہبی ممالک نے افلاطون کی پیروی کرتے ہوئے اس دنیا کو جھوٹ اور دوسری دنیا کو حقیقی سمجھا، جس کی وجہ سے وہ اس جھوٹی دنیا کو سمجھنے، تجربے کرنے وغیرہ سے غافل رہے اور اس طرح سائنسی علوم حاصل نہ کر سکے۔ یورپ اور امریکہ وغیرہ نے تجربیت کو اہمیت دیتے ہوئے اس دنیا کو حقیقی سمجھا اور اسے پرکھنے میں مصروف ہو گئے اور آج وہ سائنسی علوم کی انتہائی بلندیوں پر ہیں۔ ایشیا کی آنکھوں پر ابھی تک ''اس'' دنیا کا خمار چھایا ہوا ہے، جو کہ آہستہ آہستہ اُتر رہا ہے۔

سمیت دنیا کے تمام فلسفیوں، ادیبوں، قانون دانوں اور سائنس دانوں کو متاثر کیا۔ لاک کے تجربیت کے فلسفے نے اس دنیا کے ٹھوس حقائق کو سمجھنے کے لیے سائنس کی راہ لی اور ترقی کی منازل طے کرتا ہوا مریخ پر پہنچنے والا ہے۔

لاک کے سیاسی فلسفے نے اس کے وطن انگلینڈ کے علاوہ فرانس پر گہرے اثرات چھوڑے اور فرنچ انقلاب میں استعمال ہونے والے ''آزادی، برابری اور اقتدارِاعلیٰ'' کے خیالات لاک ہی کے تھے۔ اس کے علاوہ امریکہ کا آئین بھی لاک ہی کے فلسفے پر ایستادہ ہے۔ کہنے والے تو یہاں تک کہتے ہیں کہ معاشیات میں Laiseez Faire نظریہ لاک ہی کے فلسفے سے متاثر ہے۔

> ''مختصراً یہ کہ لاک روشن خیالی کے عہد کا ایک اہم اور نامور فلسفی ہے' جس نے اپنے فلسفے کے ذریعے ''آزاد تحقیق'' کی روایت ڈالی اور مطلق العنانیت کی مذمت کی۔ اس کے ساتھ ساتھ لاک ایک متوازن' نیک اور احساسِ ذمہ داری سے بھرپور شخصیت تھا۔''[1]

1-The British Philosophers By:Copleston S.J. Page:142.

بشپ جارج برکلے

(سن 1685ء تا سن 1753ء)

آئرلینڈ کا رہائشی یہ فلسفی، جدید مثالیت پسندی (Idealism) کا بانی کہا جاتا ہے۔

12 مارچ سن 1685ء کو آئرلینڈ کے شہر کلکینی میں پیدا ہوا اور بنیادی تعلیم ڈبلن میں حاصل کی۔

سن 1710ء میں اس نے اپنا مقالہ ''انسانی علم کے اصول'' (Principles of Human Knowledge) شائع کرایا، جسے ڈائلاگ کی شکل میں آسان بنا کر دوبارہ (Three Dialogues between hylas and Philonous) کے نام سے سمجھایا گیا۔

سن 1734ء میں اسے بشپ کے عہدے پر مقرر کیا گیا، جہاں وہ پوری عمر بیمار رہا اور 14 جنوری سن 1753ء میں وفات پا گیا۔

برکلے کے دور میں لاک کا فلسفہ اپنی آب و تاب سے چمک رہا تھا اور ہر کسی کی زبان پر تجربیت پسندی کے قصے تھے۔ اس پادری نے تجربیت پسندی یا مادیت پسندی کو عیسائیت کے لیے للکار سمجھا اور خدا کے دفاع کی خاطر میدان میں کود پڑا۔

ہتھیار وہی تجربیت پسندی کا ہی استعمال کیا اور مادیت کا مقابلہ کرنے کے لیے سرے سے مادے کے وجود سے ہی انکار کر ڈالا۔

برکلے کا فلسفہ، لاک کے فلسفے پر تنقید اور کسی حد تک اس کے متضاد بھی ہے۔☆

☆ لاک کے فلسفے پر تنقیدی مقالہ لکھ کر برکلے نے تقریباً تصوریت (Idealism) کی باقاعدہ بنیاد رکھی۔ برکلے کو کسی حد تک تصوریت کا بانی بھی کہا جا سکتا ہے۔

جیسا کہ برکلے کٹر مذہبی انسان تھا، لہٰذا اسے یہ خوف لاحق ہو گیا تھا کہ کہیں لاک کی مادیت، عیسائیت کو ہڑپ نہ کر جائے۔ اسی وجہ سے اس نے تجربیت کے اصول استعمال کرتے ہوئے تجربیت اور لاک کے فلسفے پر ایک زوردار حملہ کیا۔ لاک نے لکھا تھا کہ اشیاء یعنی مادے کی بنیادی اور ثانوی خاصیتیں ہیں جن کو جاننے اور سمجھنے کے لیے انسان حواس سے کام لیتا ہے۔ حواس کی مدد کے بغیر دنیا کا کوئی بھی علم ممکن نہیں ہے۔ یہیں سے برکلے شروع ہوتا ہے۔

برکلے کے خیال میں جب ہم اشیاء کو صرف حواس کی مدد سے پہچان سکتے ہیں یا ان کا ادراک کر سکتے ہیں تو پھر ان اشیاء کی اصلیت یا حقیقت انھی میں ہے کہ ان کا ادراک کیا جائے اور ادراک کرنے والا مادہ نہیں بلکہ ذہن ہے۔ بالفاظِ دیگر ذہن ہی سب کچھ ہے، جس کے ذریعے اشیاء کا ادراک ہوتا ہے اگر ذہن ہے تو ادراک ہے اور ادراک ہے تو اشیاء ہیں، اگر ذہن ہے تو ادراک ہے اور ادراک ہے تو اشیاء ہیں، اگر ذہن نہیں ہے تو اشیاء کا ادراک نہیں ہے اور اگر ادراک نہیں ہے تو چیزیں بھی نہیں ہیں۔☆

یہاں برکلے یہ کہنا چاہتا ہے کہ دراصل چیزوں کا کوئی مادی وجود ہے ہی نہیں بلکہ ان کے بارے میں صرف تصورات ہیں، جن کا ادراک، ذہن کرتا ہے۔ یہ دنیا مادی اور حقیقی نہیں بلکہ خیالی اور تصوراتی ہے، جو محض دماغ میں موجود ہے۔

لاک نے اشیاء کی بنیادی خاصیتوں کو معروضی (Objective) اور ثانوی خاصیتوں کو موضوعی (Subjective) قرار دیا تھا، جب کہ برکلے اشیاء کی بنیادی خاصیتوں حتیٰ کہ ثانوی خاصیتوں کو موضوعی (Subjective) قرار دیتا ہے۔ ایسا کرنے سے دونوں خاصیتیں تصور بن جاتی ہیں۔

مثلاً ایک سیب کی خاصیتیں یہ ہیں (۱)۔ گولائی، (۲)۔ سختی، (۳)۔ خاص شکل، (۴)۔ عدد وغیرہ۔ ثانوی خاصیتیں (۱)۔ سبز، (۲)۔ میٹھا، (۳)۔ ہلکا، (۴)۔ ہلکی خوشبو وغیرہ ہیں۔ برکلے کا کہنا ہے کہ یہ بنیادی حتیٰ کہ ثانوی خاصیتیں جن کا ذہن ادراک کرتا ہے۔ یہ سیب سے نکال دی جائیں تو باقی کیا بچے گا؟ یعنی اگر ایک سیب سے اس کی گولائی، سختی، تعداد، شکل، مٹھاس، وزن، رنگ اور خوشبو وغیرہ نکال دیں تو کیا پھر بھی وہ سیب ہی رہے گا؟

☆ نہ تھا میں تو کیا تھا، نہ ہوتا میں تو کیا ہوتا
ڈبویا مجھ کو ہونے نے، نہ ہوتا میں تو کیا ہوتا (مرزا غالب)

یہ تمام خاصیتیں ہیں تو سیب بھی ہے لیکن اگر یہ ساری خاصیتیں نکال دی جائیں تو سیب کا وجود ہی باقی نہیں رہے گا۔ لہٰذا یہ ثابت ہوا کہ ساری خاصیتیں سیب کے بجائے ذہن کے تصور میں موجود ہیں۔ دوسرے لفظوں میں سیب، ایک سیب (مادی وجود) نہیں ہے بلکہ صرف سیب کا تصور ہے۔ لہٰذا اس دنیا کی حقیقت بھی سیب کی طرح مادی نہیں بلکہ تصوراتی ہے۔

اس اصول سے برکلے خدا کا وجود بھی ثابت کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ برکلے جب اشیاء کی مادی حقیقت سے انکار کرتا ہے تو یہ انکار محض ''مادیت'' کا ہے۔ یہ انکار اشیاء کے ''اقرار'' کا نہیں ہے۔ مطلب یہ کہ اشیاء مادی نہیں ہیں البتہ ''ہیں'' ضرور۔

یہ اشیاء اگر کسی کے ادراک میں نہ بھی آئیں تو بھی ہیں ضرور اور ان کی موجودگی سے انکار نہیں کیا جا سکتا لیکن یہ تمام چیزیں کہاں ہیں؟ برکلے جواب دیتا ہے کہ یہ اشیاء نہ ہمارے ذہن میں اور نہ ہی خارجی ماحول میں کسی دوسری جگہ پر ہیں، مگر یہ صرف خدا کے ذہن میں ہیں۔ بالفاظِ دیگر ہمارا کوئی حقیقی اور ٹھوس وجود نہیں ہے۔ البتہ ہم صرف خدا کے ذہن میں ''موجود'' ہیں۔

یہاں سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ پھر اس دنیا میں ہم جو کچھ محسوس کرتے ہیں۔ اس کا سبب کیا ہے؟ یہ دنیا ہم کس وجہ سے محسوس کرتے ہیں جب کہ یہ خارجی طور پر (Objectively) ہے ہی نہیں؟

برکلے جواب دیتا ہے:

''ہم جو اشیاء کو محسوس کرتے ہیں یا ان کا ادراک رکھتے ہیں تو اس کا سبب یہ چیزیں نہیں بلکہ ''خدا'' ہے۔ صرف روح ہی روح پر کوئی عمل کر سکتی ہے۔ اس لیے ہماری تمام محسوسات کا سبب اور محرک (Cause) خدا ہے۔''[1]

1-The age of Louis XIV By: Will Durrant, Page:595.

ڈیوڈ ھیوم

(سن 1711ء تا سن 1776ء)

ڈیوڈ ہیوم 26 اپریل سن 1711ء کو ایڈن برگ کے ایک اعلیٰ اور بااثر خاندان میں پیدا ہوا (آگے چل کر 1964ء میں اس خاندان کا ہیرولڈ ولسن نامی فرد برطانوی وزیراعظم بھی بنا)

ڈیوڈ ہیوم کو بچپن میں کالونسٹ مکتبۂ فکر کے تحت عیسائیت کی مذہبی تعلیم دلائی گئی۔ وہ 12 سال کی عمر میں یونیورسٹی میں داخل ہوا، مگر تین سال کے بعد کوئی ڈگری حاصل کیے بغیر یونیورسٹی کو خیرباد کہہ دیا۔ اسے روایتی نصابی تعلیم سے زیادہ ادب و فلسفہ سے لگاؤ ہو گیا تھا۔ جلد ہی بچپن کے مذہب کی مضبوط دیوار میں نہ صرف دراڑیں پڑ گئیں بلکہ یہ دھڑام سے زمین بوس ہو گئی۔

اس نے قانون پڑھنے کی کوشش کی مگر وہاں بھی اس کا دل نہ لگا اور وہ دوبارہ فلسفے کی طرف متوجہ ہو گیا۔ وہ کچھ عرصہ لندن اور برسٹل میں رہنے کے بعد فرانس چلا گیا، جہاں وہ مختلف لائبریریوں میں مصروف رہا۔ اسی دوران ڈیوڈ ہیوم نے دو جلدوں پر مشتمل ایک کتاب A Treastise on Human Nature (Book 142) لکھی۔

اپنے دور کے واہموں سے مقابلہ کرنا بھی گویا سر دھڑ کی بازی لگانا ہوتا ہے۔ سن 1737ء میں جب ہیوم نے لندن واپس آ کر اپنی کتابیں شائع کرانے کی کوشش کی تو ناشر طیش میں آ گئے اور ہیوم کو اپنی کتابوں سے کافی سارا مواد حذف کرنے کے لیے کہا۔ مجبوراً ہیوم نے معجزوں کے متعلق

تحریر کردہ مواد الگ کر کے نکال دیا۔

ہیوم نے آگے چل کر عیسائی مذہب، معجزات اور واہموں وغیرہ پر کئی حملے کیے، جن کے نتیجے میں بڑی تعداد میں لوگ اس کے مداح یا مخالف بن گئے۔ 1755ء میں اسکاٹ لینڈ کے پادریوں نے تو باقاعدہ مہم چلائی کہ ہیوم کو کافر قرار دے کر سزا دی جائے لیکن حکومت میں بھی اس کے چند مداح موجود تھے، جنھوں نے اسے فرانس میں سفیر کا ڈپٹی سیکرٹری مقرر کر کے برطانیہ سے باہر بھیج دیا۔

فرانس۔ جہاں والٹیر تھا، ڈائڈرائٹ تھا اور روسو تھا۔ پیرس میں ماحول مکمل طور پر سازگار تھا اور ہیوم کا بہت پُرجوش استقبال کیا گیا۔ ایک خاتون کافی عرصے سے اس پر فدا تھیں، جب انھیں ہیوم کی پیرس آمد کا علم ہوا تو محترمہ ہاتھ دھو کر اس کے پیچھے پڑ گئیں، مگر ہیوم نے تو جیسے سدا کنوارہ رہنے کی قسم کھا رکھی تھی۔ وہ ہر محفل میں خوب صورت عورتوں اور روشن خیال نوجوانوں میں گھرا رہتا۔

ہیوم گفتگو میں نہایت دوستانہ لہجہ اپنائے رکھتا اور اختلاف کرتے وقت بھی بہت پُرسکون رہتا۔ وہ ہمہ وقت خوش اخلاق اور خوش گفتار ہونے کے ساتھ ساتھ مخالفین کے نکتۂ نظر کو بھی توجہ سے سنتا اور بے انتہا قوت برداشت کا مظاہرہ کرتا۔

اس کی کتاب .Enquiry concerning the human understanding نے آگے چل کر کانٹ (Kant) کو بھی نیند سے بیدار کیا، گبن (Gibbon) تو گویا ہیوم کے فلسفے ہی کی پیداوار تھا۔ روسو کافی عرصہ ذاتی دوست بن کر اس کے ساتھ رہا اور ڈائڈرائٹ نے لکھا: ''میں تمھیں سلام کرتا ہوں، مَیں تم سے محبت کرتا ہوں۔''[1]

ہیوم سن 1775ء میں شدید علیل ہو گیا اور سن 1776ء میں ایڈن برو میں واپس لوٹ آیا اور موت کا انتظار کرنے لگا۔

''اتنی جلدی مَر جاؤں جتنی جلدی میرے دشمن چاہتے ہیں اور اتنی جلدی مَر جاؤں جتنی جلدی میرے دوست (میری بیماری کی وجہ سے) چاہتے ہیں۔''[2]

بیماری کے عالم میں بھی ہیوم نے مطالعہ جاری رکھا اور اس کی طبیعت میں مزاح کا عنصر برقرار رہا۔

1-The age of voltaire by: Will Durrant Page: 160.

2-The age of voltaire by: Will Durrant Page: 160.

بسترِ مرگ پر بوسویل آئے اور ہیوم سے پوچھا ''اب تو آخرت پہ یقین رکھتے ہوناں؟''

''بالکل نہیں'' ہیوم نے جواب دیا۔ ''آخرت ایک انتہائی غیر عقلی خیالی دنیا ہے، جہاں ہمیشہ رہنا پڑے۔''

''لیکن آخرت اور جنت کا تو خیال بھی دل خوش کن ہے۔'' بوسویل نے کہا:

''ہرگز نہیں، یہ تو ایک اُداس کر دینے والا تصور ہے۔'' ہیوم نے سکون سے جواب دیا۔

کئی عورتیں آئیں اور اسے آخرت پر یقین لانے کے منت وسماجت کرتی رہیں مگر وہ سب سے ہنسی مذاق کر کے لوٹاتا رہا۔

بالآخر 25 راگست سن 1776ء کو وہ سکون کے ساتھ رخصت ہوا۔ بارش کے باوجود اس کے جنازے میں لاتعداد لوگ شریک ہوئے۔ ایک شخص نے کہا:

''یہ تو دہریہ تھا۔'' ''مگر'' دوسرا بولا ''کوئی بات نہیں، تھا تو ایمان دار ناں؟''[1]

ہیوم کا فلسفہ

ہیوم کے سامنے اس کے اپنے ملک میں قریباً اسی عہد کے دو تجربیت پسند لاک اور برکلے موجود تھے۔ اس نے برکلے کے بجائے لاک کے فلسفے پر توجہ دی اور اس سے بہت متاثر ہوا۔

لاک کی طرح ہیوم بھی اس بات کا قائل ہے کہ علم صرف حواس کے ذریعے ہی حاصل کیا جاسکتا ہے۔ ہیوم کے مطابق تو انسان کے ذہن میں کئی ایسے تصور یک جا ہو جاتے ہیں، جن کا حقیقت سے کوئی تعلق نہیں ہوتا ہے۔ ہیوم ان تصورات کا تعاقب کرتے ہوئے ان کی اصلیت تک پہنچتا ہے اور ایسا کرتے ہوئے وہ ایک تجزیاتی یا تنقیدی طریقہ کار بھی وضع کر دیتا ہے۔ اس کے خیال میں فہم یا ادراک کی دو قسمیں یا دو سیڑھیاں ہوتی ہیں۔ پہلی سیڑھی تاثر (Impression) اور دوسری سیڑھی خیال یا تصور (Idea) ہے، جب تاثرات ذہن کے خانے میں پہنچتے ہیں تو وہاں یادداشت میں محفوظ ہو جاتے ہیں۔ یادداشت میں محفوظ شدہ ان تاثرات کو خیال (Idea) کہا جاتا ہے۔

خیالات سادہ یا مفرد بھی ہوتے ہیں تو یہ اُلجھے ہوئے اور مرکب بھی ہوتے ہیں، جب

1-The age of voltaire by:Will Durrant Page:161.

مشاہدہ تجربہ یا مطالعہ حواس کے ذریعے دماغ تک پہنچتا ہے، تو یہ سادہ اور اُلجھے ہوئے خیالات کا مجموعہ ہوتا ہے۔ یہ سارے تاثرات جب دماغ کے یادداشت کے خانے میں محفوظ ہوتے ہیں تو دماغ ان سے ایک عجیب طریقے سے، شرارتی بچے کی طرح کھیلتا ہے اور ایک محفوظ شدہ تصورات کے اجزاء لے کر دوسرے محفوظ شدہ تصورات کے اجزاء سے ملا کر ایک تیسرا نیا تصور قائم کر لیتا ہے، جو کہ اکثر غیر حقیقی اور کاذب ہوتا ہے۔ اس سلسلے میں ہیوم اُڑنے والے گھوڑے کی مثال دیتا ہے۔ قصے کہانیوں میں سُنے ہوئے پَروں والے گھوڑے کا تصور تو ہر انسان کر سکتا ہے مگر آج تک کسی بھی انسان نے اس اُڑنے والے گھوڑے کو دیکھا نہیں ہے۔ اس کا وجود ہی نہیں ہے تو کوئی دیکھے گا کہاں سے۔ دماغ کی یادداشت میں پرندوں کے پَروں اور گھوڑے کے مفرد خیال تو موجود تھے۔ ذہن نے وہ پر گھوڑے کو لگا کر اسے اُڑنے والا گھوڑا بنا ڈالا۔

ایسے بے شمار غیر حقیقی اور کاذب خیالات دماغ روز سوچتا ہے جو اکثر رات کو انسان خوابوں کی شکل میں دیکھتا ہے۔

حقیقت صرف وہ ہے جو کہ مشاہدے یا تجربے میں لائی جا سکے۔ ہیوم نے یہ طریقہ کار ایجاد کیا کہ ہر تصور کا تعاقب کرتے ہوئے اس کے حقیقی سادہ اور مفرد تصور تک پہنچا جائے تو حقیقت واضح ہو جائے گی۔ اسی طرح ہیوم ہم سے مطالبہ کرتا ہے کہ ہمیں اپنے ذہنوں کو کھنگال کر ان میں موجود کاذب تصورات کی نشاندہی کرنی چاہیے اور ان غیر حقیقی تصورات کو مسترد کرنا چاہیے۔

ہیوم کے اس فلسفیانہ طریقہ کار کو دیکھا جائے تو اُن تمام لوگوں کے خیالات جھوٹے لگیں گے جو یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ انھوں نے ریاضت اور مجاہدے کے ذریعے مافوق الفطرت ہستیوں کو دیکھا ہے۔ دراصل ان کے ذہنوں میں موجود تصورات آپس میں گڈمڈ ہو کر چند نئے تاثرات قائم کر لیتے ہیں، جو اِن زاہدوں اور چلہ کشوں کو حقیقت لگتے ہیں۔ حقیقت صرف وہ ہے جو ہر کسی کے مشاہدے اور تجربے میں آ سکے۔ اسی طرح ہیوم فرشتوں، روحوں اور جنت کے تصورات کو کاذب کہتا ہے۔ جنت کیا ہے؟

> ’’مروارید کے دروازے، سونے کے راستے، حوریں اور غلام، دودھ اور شہد کی نہریں وغیرہ وغیرہ۔ یہ سارے مرکب خیالات ہیں جن کے مفرد یہ ہیں مروارید، دروازہ، سونا، راستہ، حسین عورت اور مرد، دودھ، شہد اور نہریں وغیرہ۔

یہ تمام مفرد خیالات انسان کے ذہن میں ہیں جن کو ذہن ایک دوسرے سے جوڑ کر نئے تصورات قائم کرتا ہے جو کاذب ہیں۔"(۱)

اسی طرح ہیوم انا (Ego) کو بھی مرکب خیال کہتا ہے۔ انسان کبھی بھی اپنی انا یا خودی (Self) کا بیک وقت مکمل ادراک نہیں کرسکتا کیوں کہ انا مفرد یا سادہ خیال ہرگز نہیں۔ ہیوم کہتا ہے:

جب میں اپنے آپ سے بہت زیادہ اپنائیت سے رجوع کرتا ہوں جسے میں خودی کہتا ہوں، تو کبھی یہ خیال محبت کا ہے تو کبھی نفرت کا، کبھی اذیت کا تو کبھی سرور کا، کبھی گرمی کا تو کبھی سردی کا وغیرہ وغیرہ۔۔۔

میں جب اپنا ادراک کرنا چاہتا ہوں تو میں اپنے اندر صرف بالا تصورات میں سے کوئی ایک دیکھ سکتا ہوں۔

آگے چل کر لکھتا ہے:

"ذہن ایک قسم کا تھیٹر ہے، جہاں بے شمار ادراک ایک دوسرے کے پیچھے (ڈرامے کے کرداروں کی طرح) ظاہر ہوتے ہیں، گزر جاتے ہیں، پھر گزرتے ہیں، سرعت سے پرے چلے جاتے ہیں اور حالات و واقعات کی لامحدود اقسام میں کھو جاتے ہیں۔"(۲)

اسی طرح انا یا خودی کے اجزا تیزی سے حرکت کر کے انا کو مسلسل تبدیل کرتے رہتے ہیں۔ نئے تصورات انا میں داخل ہو جاتے ہیں۔ کچھ وقت انا کا حصہ بن کر پھر خارج ہو جاتے ہیں۔ اس طرح انا ایک بہتی ہوئی ندی ہے جو ہر وقت تبدیل ہوتی رہتی ہے۔

بالا بحث سے ہیوم یہ ثابت کرنا چاہتا ہے کہ خودی یا انا جو کہ انسان کی شناخت ہے، وہ تو مسلسل تبدیلی سے گزرتی رہتی ہے۔ لہٰذا انسان کی شناخت یا "میں" مستقل نہیں ہے۔ ڈیکارٹ نے کہا تھا:

"میں سوچتا ہوں اس لیے میں ہوں" ہیوم نے کہا کہ "میں" ہے ہی کہاں کہ وہ سوچے۔ "میں" تو ہر وقت بدلتا رہتا ہے۔ میری کم سنی کی "میں"

---

(۱)۔ سوفی کی دنیا از جوسٹن گارڈ۔

2-The age of Enlighttement Page:246.

جوانی کی ''مَیں'' پھر بڑھاپے کی ''مَیں'' جیسی نہیں ہے۔کل تک جو''مَیں'' تھا۔
آج وہ ''میں'' نہیں ہوں۔لہٰذا ثابت یہ ہوا کہ انا نا قابلِ تبدیل ہرگز نہیں ہے۔
بلکہ ہر وقت تبدیل ہونے والی متضاد اور مختلف چھوٹے بڑے تصورات کی گٹھڑی
ہے۔''

ہیوم اور خدا

خدا کے بارے میں ہیوم عقلیت پسند فلسفے کے سخت خلاف ہے۔عقلیت پسند (ڈیکارٹ اسپائنوزا وغیرہ) خدا کا وجود عقل کے ذریعے ثابت کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ہیوم کے فلسفے کے مطابق تو ''ثابت'' صرف وہ شے یا حقیقت کی جاسکتی ہے جو کہ حسی تجربے سے گزر سکے۔خدا ہے کہ نہیں، لیکن اس کا حسی تجربہ نہیں ہوسکتا۔

ہیوم خدا کی ذات کا منکر نہیں ہے۔وہ کہتا ہے کہ بے شک خدا کا حسی تجربہ نہیں کیا جاسکتا، مگر اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں ہے کہ خدا کا وجود ممکن ہی نہیں ہے۔بالفاظِ دیگر ہیوم یہ کہتا ہے کہ نہ تو عقل کے ذریعے خدا کا وجود ثابت کیا جاسکتا ہے اور نہ ہی خدا کے وجود کی نفی ہی کی جاسکتی ہے۔ دوسرے لفظوں میں اثبات اور نفی دونوں کو ثابت نہیں کیا جاسکتا۔خدا کے بابت ایسا نظریہ رکھنے والے کو لاادری (Agnostic) کہا جاتا ہے۔یعنی نہ موحد، نہ منکر۔

اخلاقیات اور ہیوم

اخلاقیات کے میدان میں بھی ہیوم نے عقلیت پسندی کی مخالفت کی ہے۔عقلیت پسند یہ کہتے ہیں کہ انسانی ذہن میں نیکی اور بدی کا تصور (Innate) ہے اور جب انسان بُرائی کرتا ہے تو اسے اپنے اندر احساس ہوتا ہے کہ اس نے غلطی کی ہے۔ہیوم اس نظریے کو غلط قرار دیتا ہے۔اس کے خیال میں تو نیکی اور بدی کا تصور پیدائشی نہیں ہے بلکہ معاشرتی حالات وواقعات کی پیداوار ہے۔ ہم جو کچھ کرتے ہیں، اس کا فیصلہ عقل کے بجائے اس کے پیچھے پوشیدہ جبلتیں اور جذبات کرتے ہیں۔اس طرح جذبات کے نکتۂ نظر کے مطابق انسان وہی کرتا ہے جو کہ صحیح ہے مگر اس غلط فہمی میں ہے کہ وہ سب کچھ عقل کے تحت کر رہا ہے۔

بالفاظِ دیگر ہیوم کا یہ کہنا ہے کہ نیکی اور بدی کا تعلق انسانی عقل کے بجائے جذبات سے

ہے۔ جذبات بھی ایک اصول کے تحت متحرک ہوتے ہیں۔ وہ اصول ''مزے کا حصول اور اذیت سے فرار'' کا ہے۔ اس طرح انسان نے اسی اصول کے تحت نیکی اور بدی کے تصور بھی قائم کر لیے۔ یعنی جس شے یا عمل میں مزا فائدہ یا اذیت سے بچاؤ ہے۔ وہ اچھی ہے اور یہ ''نیکی'' کا عمل ہے جو خیال، عمل یا شے اذیت کا باعث بنے وہ برائی ہے اور یوں انسان نے نیکی اور بدی کے کئی تصور اور معیار مقرر کر لیے، جن کی اصلیت عقل کے بجائے جذبات ہیں۔ عقل تو انسانی منشا اور خواہش کا ایک اوزار ہے۔ عقل ہمیشہ خواہش کے مطابق فیصلے کرتی ہے اور کبھی بھی اس خواہش کے برعکس کوئی عمل نہیں کرتی، جب دو خواہشوں کا ٹکراؤ ہوتا ہے تو طاقت ور خواہش ہمیشہ فاتح بنتی ہے اور عقل اس کے طابع ہو کر کام کرتی ہے۔ انسان سمجھتا ہے کہ اس نے جذبات کو کچل کر صرف عقل سے کام لیا ہے۔ حالاں کہ یہ اس کی بھول ہے۔ مثال کے طور پر اگر کسی انسان کو بھوک لگتی ہے مگر اس کے پاس پیسے نہیں ہیں۔ اسے چوری کا خیال سوجھتا ہے مگر اس کو عملی جامہ پہنانے سے قبل وہ سوچتا ہے اگر پکڑا گیا تو اسے پولیس کے حوالے کر دیا جائے گا۔ یہ سوچ کر وہ چوری کے عمل سے باز آتا ہے اور بھوک برداشت کر لیتا ہے۔ اس صورتِ حال میں انسان سمجھتا ہے کہ اس نے چوری نہ کرنے کا فیصلہ کر کے عقل سے کام لیا ہے، مگر یہ صحیح نہیں ہے۔ اصل بات یہ ہے کہ اس کی بھوک کے جذبے سے اس کے تحفظ کا جذبہ کہیں زیادہ طاقتور تھا، جس کے غالب آنے پر وہ چوری نہ کر سکا لیکن اگر اس کی بھوک کا جذبہ شدید ہوتا تو وہ تحفظ کے جذبے کو شکست دے کر اپنی بات ضرور منواتا۔

ہیوم کہتا ہے کہ اس طرح انسان کے ہر اچھے اور بُرے عمل کے پیچھے جذبات کارفرما ہوتے ہیں، جو ایک دوسرے کی حمایت یا مخالفت کرتے رہتے ہیں۔ عقل بے چاری تو ان جذبوں کی کٹھ پتلی ہے۔

سیاست اور معاشیات

ہیوم نے جمہوریت اور طرزِ حکومت پر سیاسی مقالہ (Poltical Discourse) لکھا جو سن 1752ء میں شائع ہوا۔ ہیوم ذاتی طور پر مساوات کے نظریے سے متاثر تھا اور اس سے ہمدردی رکھتا تھا۔ وہ نظریاتی طور پر کیمونزم کا حامی تھا مگر اس نے یہ سوچ کر کیمونزم کو رد کر دیا کہ ''انسانی فطرت اس جنت کو ممکن نہ ہونے دے گی۔'' تاریخ کے علاوہ عام فہم انسان بھی یہ سمجھتا ہے کہ بے شک

مساوات کے یہ نظریات بڑے اچھے اور بھرپور ہیں مگر یہ ناقابلِ عمل ہیں۔ انسانی عقل، فن، حرفت اور محنت ایک دوسرے سے مختلف اور کم یا زیادہ ہیں، اگر ان کو آزاد چھوڑ دیا گیا تو برابری ختم ہو جائے گی اور اگر مساوات کو زبردستی نافذ کیا گیا تو یہ ایک بدترین آمریت بن جائے گی۔ اس طرح وہ کمیونزم کو رَد کرنے کے بعد جمہوریت کا قائل ہونے کے باوجود اسے رَد کرتا ہے اور اسے ''بچگانہ نظریہ'' قرار دیتا ہے۔ جمہوریت کے متعلق روسو نے اس کے خیالات کو بہت متاثر کیا۔ اس کے علاوہ ہیوم نے معاشیات پر بھی کافی لکھا۔ مستقبل میں ایڈم اسمتھ (Adam Smith) سمیت کئی مفکرین ان تحریروں سے متاثر ہوئے۔

> ''ہیوم نے فرانسیسی ماہرین کے اس نظریے کو رَد کیا ہے کہ محصولات کا بار بالآخر زمین، پر پڑتا ہے۔ ہیوم کے خیال میں محصولات آخر کار زمین پر نہیں بلکہ مزدور اور کسان پر پڑتا ہے۔ ہیوم نے حکومتوں کے اس عمل پر تنقید کی جس کے ذریعے وہ اپنے اخراجات پورے کرنے کے لیے عوام پر گردن توڑ ٹیکس عائد کرتی ہیں اور بانڈ جاری کرتی ہیں۔''[1]

اس کے علاوہ ہیوم نے تاریخ کے متعلق بھی مقالات لکھے اور اپنے نکتۂ نظر سے برطانیہ کی تاریخ بیان کی۔

یہ وہ دَور ہے جب گبن اور والٹیر بھی تاریخ لکھ رہے تھے اور ان تینوں کا مشترکہ حملہ واہمات پر اور ماورائی و مافوق الفطرت قوتوں پر اور تاریخ کی مذہبی تشریح پر تھا۔

1-The age of voltaire by:Will Durrant Page:155.

جین جیکئس روسو

(سن 1712ء تا 1778ء)

بیک وقت فلسفے، ادب اور سیاست پر گہرے اثرات چھوڑنے والے روسو کو بڑے مفکرین تو فلسفی ماننے کے لیے تیار ہی نہیں ہیں لیکن یہ سب مانتے ہیں کہ انقلابِ فرانس، یورپ میں رومانوی تحریک اور کانٹ (Kant) جیسے بڑے فلسفی اور گوئٹے (Goethe) جیسے بڑے شاعر پر روسو کے گہرے اثرات تھے۔

خود کو با آوازِ بلند گناہ گار کہنے والا اور دل کو دماغ پر ترجیح دینے والا روسو سن 1712 میں جنیوا میں پیدا ہوا۔ کم سنی میں ہی اس کی والدہ کا انتقال ہو گیا اور کچھ عرصے کے بعد ہی روسو کا والد اسے عزیزوں کے سپرد کر کے خود ہمیشہ کے لیے جانے کہاں چلا گیا۔

روسو 12 سال کی عمر میں اسکول کو الوداع کہہ کر ہنر سیکھنے لگا، مگر جلد ہی یہ بھی چھوڑ دیا۔ 16 سال کی عمر میں اپنی جنم بھومی جنیوا سے سواء چلا گیا اور وہاں کیتھولک پادری کے ہاتھ پر بیعت کر کے کیتھولک بن گیا۔ اس سے قبل خود کالوینی پروٹسٹنٹ تھا۔ اس زمانے میں روسو کے لیے سب سے بڑا مسئلہ پیٹ بھرنے اور تن ڈھانپنے کا تھا، جس کی خاطر اس نے چوری سے بھی گریز نہیں کیا۔

روسو کو میڈم وارن نامی ایک مال دار عورت ملی، جس نے روسو کو بہت زیادہ سہارا اور پیار دیا۔ سن 1742 میں روسو پہلے پیرس پہنچا، جہاں اس نے موسیقی کی دھنیں ترتیب دیں تاکہ کچھ پیسے کما سکے۔

سال بھر کے بعد روسو وینس (Venus) میں فرانس کے سفیر کا سیکرٹری مقرر ہوا لیکن جلد ہی پیرس واپس لوٹ آیا اور گزر بسر کے لیے موسیقی کے علاوہ ٹیوشن بھی پڑھاتا رہا۔ 1745ء میں وہ ایک ہوٹل کی بدصورت اور جاہل ملازمہ کے ساتھ رہنے لگا جسے پڑھنا لکھنا تو درکنار پیسے گننا بھی نہیں آتے تھے۔

سن 1750 وہ سال ہے جس نے روسو کو تاریکی سے نکال کر اُجالے میں پہنچا دیا۔ ڈجان اکیڈمی نے مضمون نویسی کا مقابلہ کرایا جس کا موضوع ''کیا سائنس اور آرٹ نسلِ انسانی کے لیے فائدہ مند ثابت ہوئے ہیں؟'' روسو نے موقعہ کا فائدہ اُٹھاتے ہوئے بھرپور مضمون لکھا کہ سائنس اور آرٹ نسلِ انسانی کے لیے قطعی فائدہ مند ثابت نہیں ہوئے ہیں۔ اس نے کہا کہ سائنس اور آرٹ نسلِ انسانی کے بڑے دُشمن ہیں جنھوں نے خود ساختہ ''طلب'' (Demand) پیدا کر کے انسان کو غلام بنالیا ہے۔

روسو کے مدلل مضمون نے انعام حاصل کیا۔ روسو نے سن 1755ء میں اصلاح اور اضافے کر کے اس مضمون کا دوسرا حصہ شائع کرایا جس میں اس نے ''ابتدائی وحشی زندگی'' کی نہایت تعریف کی جو ''آزادی'' پر مشتمل تھی۔

روسو نے اپنا مضمون اپنے ہم عصر والٹیر کو مطالعہ کے لیے بھیجا جس نے روسو کو بڑا دلچسپ جواب دیا:

> ''نسلِ انسانی کے خلاف آپ کی تحریر کردہ کتاب مجھے مل چکی ہے، جس کے لیے میں آپ کا شکر گزار ہوں۔ آپ سے قبل کسی نے بھی اس قدر ذہانت استعمال کرتے ہوئے نسلِ انسانی کو بالکل جاہل اور بیوقوف ثابت نہیں کیا تھا۔ آپ کی کتاب پڑھ کر تو ہر انسان کو چوپاؤں کی طرح چلنے کی خواہش ہوگی مگر میں ایسا نہیں کرسکتا کیوں کہ گھٹنوں کے بل چلنے کی عادت میں 60 سال پہلے ترک کر چکا ہوں اور نہ ہی یہ کرسکتا ہوں کہ آپ کے بتائے ہوئے وحشی قبائل کی تلاش میں کینیڈا کا سفر کروں۔۔۔''(1)

روسو اور والٹیر کی قلمی جنگ تا آخر جاری رہی اور دونوں ایک دوسرے پر کڑی تنقید کرتے

1-History of Western Philosophy By:Bertrend Russat, Page:663.

رہے۔ ایک دن سن 1755ء میں لزبن (Lisbon) میں زلزلہ آیا، جس سے ہزاروں آدمی ہلاک ہو گئے۔ یہ دن عیسائیوں کا مذہبی دن (All saints day) تھا اور تمام گرجا گھر پادریوں اور عبادت کرنے والوں سے بھرے ہوئے تھے۔ زلزلے نے سب کو خاک میں ملا دیا۔ زلزلے کے بعد جب والٹیر نے سُنا کہ پادریوں کے بقول یہ زلزلہ ''لزبن کے لوگوں کے گناہوں کی سزا ہے۔'' تو وہ جوش میں آ گیا اور اس کے متعلق ایک نظم لکھی لیکن ردِعمل میں روسو نے عجیب وغریب جواب دیا۔

''لزبن کے مکین اس عذاب سے اس لیے دوچار ہوئے کہ وہ کثیر منزلہ عمارتوں میں رہتے تھے۔ اگر وہ وحشی انسانوں کی طرح جنگل بیابانوں میں رہ رہے ہوتے تو ان پر زلزلے کا کچھ اثر نہ ہوتا۔''

سن 1762ء میں روسو نے اپنی مشہور تخلیقات ''سماجی معاہدہ'' (Social Contract) اور ایمائیل (Emile) لکھیں۔ ان کتابوں پر کیتھولک پروٹسٹنٹ اور بادشاہ سمیت سب لوگ ناراض ہو گئے اور روسو کے لیے وہاں رہنا دُوبھر ہو گیا۔ کوئی بھی اسے پناہ دینے کو تیار نہیں تھا۔ آخرکار فریڈرک اعظم نے اسے نیوچیٹیل میں پناہ دی۔ یہاں وہ تین سال مقیم رہا اور آخری دِنوں میں اِس پر قاتلانہ حملہ بھی ہوا۔

روسو فرار ہو کر انگلستان پہنچا اور اپنے فلسفی دوست ڈیوڈ ہیوم کے پاس جا کر پناہ لی۔ یہاں روسو کافی عرصہ رہا لیکن وہ ہمیشہ خوف زدہ رہتا تھا۔ ہیوم روسو پر بہت مہربان رہا لیکن آخری ایام میں روسو کو یہ وہم ہو گیا تھا کہ ہیوم اسے گرفتار کروا دے گا یا مروا دے گا۔ یہ سوچ کر وہ وہاں سے چپ چاپ فرار ہو گیا اور پیرس پہنچ کر خاموشی اختیار کر لی، جہاں 1778ء میں وہ کسمپرسی کے عالم میں وفات پا گیا۔ روسو نے مندرجہ ذیل کتابیں لکھیں:

1-Discourse on the Science and Arts.

2-The Dissourse on in-equality.

3-Julie (Novel)

4-Social Contract.

5-Emile.

6-Confessions (Autobiography)

7-Reveries of Solitory Walker.

روسو کا سیاسی فلسفہ

انگلستان کی طرح فرانس کی تاریخ بھی خوں سے بھری ہوئی ہے۔ ہر سو تشدد اور خوں ریزی کے واقعات ہیں۔ سیاسی کشمکش کے علاوہ بادشاہوں اور کلیسا میں صدیوں سے رسہ کشی چلی آ رہی تھی۔ سولہویں صدی میں کیتھولک اور پروٹسٹنٹ فرقے کا جھگڑا بھی مسلسل 30 سال جاری رہا، جس نے لہو کے دریا بہا ڈالے۔ سولہویں اور سترہویں صدی میں بادشاہت زور پکڑنے لگی اور لوئی چودہم کے دَور تک بادشاہت انتہائی طاقت ور اور مطلق العنان بن چکی تھی۔ اس قدر کہ لوئی چودہم نے کہا:

''مَیں ہی بادشاہ ہوں، مَیں ہی ریاست ہوں۔''

اٹھارویں صدی کے آغاز سے حکومت نے نوکر شاہی اور ذاتی فوج اپنے کنٹرول میں رکھنا شروع کر دی۔ وکیل اور جج بادشاہ کو خطیر رقم بطور نذرانہ دے کر اپنے پسندیدہ ''عہدے'' حاصل کرنے لگے۔ بادشاہ کو بھاری رقم دے کر کوئی بھی طبقۂ اشرافیہ (Noble) میں شامل ہو سکتا تھا۔ کیوں کہ اشرافیہ کو ٹیکس کی چھوٹ حاصل تھی۔

حکومتی اخراجات پورے کرنے کے لیے غریب عوام پر روز بروز گردن توڑ ٹیکس لگائے جا رہے تھے، جن پر بادشاہ، پادری اور اشرافیہ مزے لوٹ رہے تھے۔ عوام کو نہ تو احتجاج کا حق حاصل تھا اور نہ ہی اظہارِ رائے کی آزادی تھی۔ اعتراض کرنے والے کے لیے گلوٹین (Gullitone) نامی مشین تھی، جس میں باغی کا سر ڈال کر ایک ہی جھٹکے میں تن سے جدا کر دیا جاتا تھا۔ اس وقت کوئی ایسا تھا جو عوام کی بات کرے؟ جمہور اور جمہوریت کی بات کرے؟ ہاں ایک تھا، اس کا نام تھا روسو۔

روسو تہذیب و تمدن سے سخت بیزار تھا۔ اس کے خیال میں سائنس نے تو نسلِ انسانی کا سکون غارت کر دیا ہے۔ تہذیب ایک غیر فطری صورتِ حال ہے، جس نے انسان کو اس کی فطری جنت سے نکال باہر کیا ہے۔

> ''تہذیب و تمدن سے قبل جب انسان وحشی دَور میں رہتا تھا تو وہ آزاد، بے فکر اور خوش رہتا تھا اور پیاس لگنے پر کسی ندی یا چشمے سے پانی پی لیتا تھا اور بس دولت کے لالچ، ہر دل عزیز رہنے کا شوق، شہرت کا چسکا، نام و نمود کی خواہش اور سہل پسندی سے وہ کوسوں دُور تھا''(۱)

۱۔ سیاسی فلسفہ از محمد مجیب، صفحہ نمبر ۲۴۳۔

لیکن انسان کو اس کی جنت سے باہر نکلوانے کا پہلا ذمہ دار وہ شخص ہے جس نے ''معاشرے'' کی بنیاد رکھی۔ معاشرے کا بانی وہ پہلا شخص تھا جس نے زمین کے ایک ٹکڑے کے گرد باڑ دے کر کہا کہ ''یہ زمین میری ہے۔'' اس طرح ذاتی ملکیت کا رواج پڑا۔

ذاتی ملکیت سے پہلے انسان آزاد تھا اور دوسرے انسان کے برابر بھی، مگر ذاتی ملکیت کی وجہ سے اسے تحفظ کی ضرورت محسوس ہوئی جس کے لیے اس نے دوسروں کی مدد لی اور وسائل کو ذخیرہ کرنا سیکھا۔ یوں عدم مساوات کی ابتداء ہوئی۔

انسان نے اناج کی پیداوار اور لوہے کی دریافت پر تمدن کی بنیاد تو رکھ لی مگر اسے اپنی آزادی اور مساوات دونوں سے ہاتھ دھونا پڑے۔ ان دونوں چیزوں نے انسان کی دولت میں اضافہ کیا، پھر دولت نے فساد کو جنم دیا۔ دولت کی حفاظت اور امن وامان برقرار رکھنے کے لیے انسان کو قوانین بنانا پڑے، جنھوں نے انسان کو غلام بنا ڈالا۔

> ''فطرت نے انسان کو دو جبلتوں سے نوازا ہے ایک اپنے آپ سے پیار یا اپنے وجود کی بقا اور دوسری انسان کے لیے ہمدردی۔ ان دونوں جبلتوں میں ٹکراؤ کا خطرہ بھی موجود ہے۔ انسان نے ان دونوں جبلتوں میں ہم آہنگی پیدا کرنے کے لیے ضمیر کو جنم دیا، پھر ضمیر کی راہنمائی کے لیے استدلالی عقل نے جنم لیا۔''[1]

یوں روسو انسان کی عدم مساوات تشریح کرنے کے بعد اس نتیجے پر پہنچا ہے کہ اب یہ ناممکن ہے کہ انسان خود کو مکمل طور پر واپس لے جائے اور دوبارہ وحشیانہ زندگی گزارے۔ لہٰذا روسو ایک سیاسی نظام تجویز کرتا ہے، جس میں انسان سادگی سے اپنی آزادی اور مساوات حاصل کر سکتا ہے:

> ''روسو کے مطابق انسان نے اپنے فطری سکون اور آزادی کے حصول کی خاطر سماج تشکیل دیا، جس کی بنیاد رکھنے کے لیے تمام افراد نے ایک سماجی معاہدہ کیا ہے۔ اس معاہدے کے تحت تمام افراد اپنے فطری حق سے دست بردار ہوئے اور کہا: ''ہم میں سے ہر ایک اپنا آپ اور اپنی طاقت ایک عظیم ارادے کے ماتحت کرتا ہے اور اس کے بدلے میں وہ ایک ناقابلِ تقسیم کُل کا حصہ بن جاتا ہے۔''[2]

1-Discourse on in equality By: Rousseau Page:147.

2-Social Contract By:Rousseau Page:14.

یوں افراد نے اپنی انفرادی قوتوں اور آزادی کو جمع کر کے ایک مضبوط کُل جوڑا، جس کے وہ صرف انفرادی حیثیت میں جُز ہیں، مگر اجتماعی حیثیت میں مالک اور مختار بھی ہیں۔ اس مضبوط کل کا نام ''ریاست'' رکھا گیا۔ اس ریاست میں سب برابر ہیں کیوں کہ ان سب نے اس کو بنانے میں یکساں حصہ دیا ہے۔ یعنی انفرادی طاقت اور آزادی۔ اس ریاست میں وہ کسی کے غلام نہیں بلکہ سب آزاد ہیں۔ کیوں کہ انھوں نے اپنی آزادی کسی ایک فرد یا ادارے کے بجائے ریاست کے سپرد کی ہے، جس کا مالک کوئی اور نہیں بلکہ وہ خود ہیں۔ یوں ایک کُل کا جز بننے سے وہ زیادہ تحفظ اور سلامتی بھی حاصل کرتے ہیں۔ اس کے علاوہ وہ بے لگام فرد کے بجائے ''منظم شہری'' بن جاتے ہیں، جو کہ جبلت کے بجائے انصاف کے مطابق رویہ رکھتے ہیں۔ روسو کے مطابق انسان اپنا ارادہ ایک عظیم ارادے کو سونپتا ہے جسے وہ عام ارادہ☆ (General will) کہتا ہے۔ عام ارادہ کیا ہے؟

عام ارادہ دو ارادوں کا ملاپ یا ان میں توازن ہے۔ ایک اصل ارادہ (Actual will) جو کہ خود غرضی اور ذاتی بقا کا دوسرا نام ہے اور دوسرا ''حقیقی ارادہ (Real will) جو کہ معاشرے کے لیے ہمدردی پر مبنی ہے۔

انسان کا اصل یا بنیادی ارادہ خود غرضی کے علاوہ جبلی ہے جب یہ دونوں ارادے ملتے ہیں تو ان میں دونوں خصوصیات شامل ہو جاتی ہیں یعنی عام ارادے میں فرد کی بقا اور خوشی کے ساتھ معاشرے کی بھلائی اور بقا بھی شامل ہوتی ہے اور اس طرح عام ارادہ مشترکہ اور اجتماعی مفادات کا ترجمان بن جاتا ہے۔

روسو عام یا اجتماعی ارادے کا تصور پیش کر کے دراصل عوامی حکومت یعنی جمہوریت کا تصور دیتا ہے۔ اس دَور میں بادشاہ خود کو خدا کا نمائندہ اور بادشاہت پر اپنا پیدائشی حق سمجھتے تھے۔

عام ارادے کے مطابق، اقتدارِ عالیٰ کے مالک عوام ہیں اور ریاست پر کسی کا بھی موروثی حق نہیں ہے۔ ریاست کا انتظام چلانے کے لیے اور قانون پر عمل درآمد کرانے کے لیے روسو ایک حکومت تجویز کرتا ہے، جو کہ ''عام ارادے'' کے ذریعے اقتدار میں آئے۔ یہاں عام ارادے کا مطلب ''اکثریتی رائے'' ہے)

> ''یہ اکثریتی رائے، افراد کا انتخاب، ان کی اخلاقی اور عقلی برتری کی وجہ سے کرتی ہے اور انھیں اقتدار تک پہنچاتی ہے۔''[1]

☆ یہاں عام ارادے کا مطلب اجتماعی ارادہ ہے۔

1-Rousseau and Revolution By: Willand Arie/durrant P:173.

روسو کا ریاست اور جمہوریت کا تصور، یونانی ریاست سے لیا گیا ہے۔یعنی ریاست اتنی محدود ہو کہ اس میں ہر کوئی ایک دوسرے کو جانتا ہو اور براہِ راست اپنی رائے دے سکے۔اس کے تصور میں موجودہ ریاست جتنی بڑی ریاست ہرگز نہیں ہونی چاہیے۔اس کی جمہوریت کا مطلب بھی یہی ہے کہ جو نمائندے منتخب ہو کر آئیں وہ صرف انتظامی اور عدالتی امور نمٹائیں۔علاوہ ازیں قانون سازی ان کی ذمہ داری نہیں ہوگی۔قانون سازی کا کام (Legistation) جنرل اسمبلی کرے گی۔جنرل اسمبلی کا مطلب یہ ہے کہ ریاست کا ہر شہری اس کا ممبر ہے اور تمام ممبران قانون سازی کے لیے وقتاً فوقتاً ملاقاتیں کرتے رہیں۔(جیسا کہ یونان کی شہری ریاستوں میں ہوتا تھا)

روسو کے سیاسی فلسفے کے اہم نکات یہ ہیں:

ا۔ ریاست افراد کی منشا اور ان کی مشترکہ طاقت کا نام ہے۔

۲۔ ریاست کا اقتدارِ اعلیٰ عوام کے پاس ہے۔بادشاہت، اشرافیہ اور مطلق العنانیت غیر فطری ہے۔

۳۔ ریاست کا نظام جمہوری ہو، جمہوریت کا مطلب ''اکثریتی رائے'' ہے۔

۴۔ منتخب نمائندے صرف انتظامی اور عدالتی امور نمٹائیں گے۔قانون سازی کا کام عوام براہِ راست یعنی جنرل اسمبلی کے ذریعے خود کریں گے۔

۵۔ ریاست چھوٹی ہو۔

۶۔ فرد کو ذاتی ملکیت کا حق حاصل ہو مگر اس میں زیادہ سے زیادہ کی حد مقرر کی جائے اور اس ملکیت پر ریاست کا مکمل کنٹرول ہو۔

۷۔ بھاری ٹیکس صرف آسائشی اشیا پر لگائے جائیں۔

۸۔ ریاست بڑے شہروں کے بجائے دیہاتوں اور چھوٹی آبادیوں پر مشتمل ہو۔

۹۔ ریاست میں محدود سماجی مذہب ہو جو کہ ریاست کی طرف سے ہر شہری کیلئے لازمی قرار دیا جائے۔

روسو کا مذہبی فلسفہ

روسو نے سیاست کے علاوہ مذہب پر بھی خوب بحث کی اور اس میں کئی جدتیں پیدا کیں۔ اس کا مذہبی فلسفہ بھی اس کے فطری فلسفے سے متاثر ہے۔اس سے پہلے جو فلسفی خدا کے وجود کے قائل تھے، انھوں نے خدا کا وجود ثابت کرنے کے لیے عقلی دلائل دیئے مگر روسو نے خدا کے وجود کو سمجھنے کے لیے عقل کے بجائے دل اور ایمان سے سمجھنے کا کہا۔

''دینِ فطرت کو کسی وحی کی ضرورت نہیں ہے اگر انسان خدا کی آواز سنے تو وہ ہر انسان کے دل میں براہِ راست بولتا ہے۔''

روسو سے کسی نے دوزخ کے بارے میں پوچھا کہ ''کیا گناہ گار دوزخ میں ہمیشہ جلتے رہیں گے؟'' اس کا جواب واضح تو نہیں تھا مگر یہ ضرور کہا کہ ''دوزخ کا عذاب مستقل ہر گز نہ ہوگا۔ نجات پہ کسی مذہب یا کسی کلیسا یا فرقے کی اجارہ داری نہیں ہے۔''

اس نے وحی اور دوزخ کا دوٹوک انکار کر کے فرانس اور جنیوا کے عیسائی عالموں کو بھڑکا دیا، جیسا کہ روسو کا من پسند سماج فطری اور وحشی سماج ہے لہٰذا اس کے خیال میں مذہب ایسا ہو جسے ہر سادہ انسان اور ہر وحشی انسان بھی سمجھ سکے۔ خدا کے وجود کو عقلی دلائل کے ذریعے سمجھنے کے لیے بہت زیادہ عقل اور استدلال کی ضرورت پیش آتی ہے جو بے چارے جنگلی کے پاس کہاں سے آئی۔ لہٰذا اس نے عقل کی بات کو چھوڑ کر جذبے کی بات کی جس کا مطلب یہ ہوا کہ خدا کو محسوس کیا جائے، اسے ثابت کرنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔

روسو کے اثرات

روسو کا فلسفہ، خامیوں سے بھرپور فلسفہ ہے۔ جا بجا خود ہی اپنی باتوں کو رد کرتا رہا مگر پھر بھی ہر طبقے اور ہر مکتبۂ فکر پر روسو کا اس قدر اثر ہوا کہ شاید ہی کسی دوسرے فلسفی کا اتنا اثر ہوا ہو۔

''ادب، تعلیم، فلسفے، مذہب، اخلاقیات، فن، رویوں اور سیاست وغیرہ پر روسو کا بے پناہ اثر ہوا۔''[1]

رومانوی تحریک

''روسو کے نعرے 'فطرت کی طرف واپس چلو' (Go back to Nature) نے تو گویا عقل کے ذخیرے کو آگ لگا کر جلا ڈالا۔ عقل کسی بھی شے یا نظریے کی افادیت کو دیکھتی ہے۔ روسو کی عقل دشمنی کی وجہ سے اشیا کی افادیت کے بجائے ان کے حُسن اور خوب صورتی کو اہمیت ملی زمین پر رہنے والا کیڑا زمین کی زرخیزی کے لیے بہت مفید ہے مگر خوب صورت بالکل نہیں ہے۔ جنگل میں رہنے والا چیتا بہت خوب صورت ہے مگر اس کی افادیت نہ ہونے کے برابر ہے۔

1-Rousseau and Revolution By: Will Durrant, Page: 887.

ڈارون (Darwin) رومان پسند نہیں تھا۔ اس لیے اس نے سانپ کی تعریف کی۔ ولیم بلیک (William Blake) رومان پسند تھا۔ اس لیے اس نے چیتے پر نظمیں لکھیں۔"[1]

اسی طرح رومانیت کا کمال یہ تھا کہ حُسن کو افادیت پر فوقیت دو۔ مگر رومانوی تحریک کا مطلب کیا ہے؟ رومانیت بغاوت ہے:

"احساسات اور جذبات کے خلاف،
جبلت کی دانش کے خلاف،
محسوسات کی فکر کے خلاف،
موضوعیت کی معروضیت کے خلاف،
تنہائی کی سماج کے خلاف،
تصورات کی حقیقت کے خلاف،
دیومالا کی تاریخ کے خلاف،
مذہب کی تاریخ کے خلاف،
شاعری کی نثر کے خلاف،
نیوگوتھک کی نیوکلاسیکیت کے خلاف،
نسوانیت کی مردانگی کے خلاف،
رومانوی محبت کی منظم شادی کے خلاف،
فطرت کی تہذیب اور مصنوعیت کے خلاف،
جذباتی اظہار کی روایتی پابندی کے خلاف،
انفرادی آزادی کی سماجی تنظیم کے خلاف،
نوجوانی کی اختیاری کے خلاف،
جمہوریت کی اشرافیت کے خلاف،
فرد کی ریاست کے خلاف،

1-History of Wetrern Philosophy by:Bertrand Russel Page:653.

مختصر یہ کہ یہ انیسویں صدی کی اٹھارویں صدی کے خلاف ایک بھرپور جنگ تھی۔"(1)

روسو کے بعد بے شمار رومانوی شاعر اور ادیب پیدا ہوئے، جنھوں نے روسو سے متاثر ہو کر رومانوی شاعری اور ادب تخلیق کیا، جن میں سرفہرست گوئٹے، پشکن، ٹالسٹائی، ورڈز ورتھ، ساٹو تھے، کالرج، بائرن، شیلے، کیٹس اور تھوریو وغیرہ ہیں۔

فلسفے پر روسو کے اثرات

روسو کے فلسفے پر تنقید اپنی جگہ پر، البتہ اس نے اپنے بعد آنے والے تمام بڑے فلسفیوں کو متاثر کیا، جن میں کانٹ، ہیگل، شوپنھار، مارکس اور لینن جیسے اہم نام ہیں۔ کانٹ کے سامنے یہ مسئلہ تھا کہ وہ وحدانیت کا دفاع کیسے کرے؟ کیوں کہ وحدانیت کو رَد یا ثابت کرنے کے لیے "عقل" کا استعمال ہو رہا تھا۔ نتیجے میں عقل کے پاس وحدانیت کی موافقت اور حمایت میں کافی سارے دلائل تھے۔ کانٹ نے یہ مسئلہ روسو کے ہاں حل ہوتا دیکھا یعنی خدا کے وجود کے بارے میں دماغ کے بجائے دل استعمال کریں۔ عقل کے بجائے احساس استعمال کریں اور خدا کو سمجھنے اور ثابت کرنے کے بجائے اس کو دل سے محسوس کریں۔

سیاسی فلسفے اور سیاست پر بھی روسو کے "سماجی معاہدے" نے گہرا اثر ڈالا۔ جمہوریت پسندانہ نظریات اور انفرادی احساسات کے لیے فرانسیسی قوم تو گویا ترس گئی تھی۔ "انسان آزاد پیدا ہوتا ہے مگر وہ ہر جگہ زنجیروں میں جکڑا ہوا ہے" روسو کے اس جملے نے فرانسیسی جوانوں کے ذہنوں میں بارود بھر ڈالا۔

فرنچ انقلاب کے لیے ایندھن اکٹھا ہو چکا تھا۔ روسو نے اسے آنچ دِکھائی اور الاؤ بھڑک اُٹھا، جب امریکہ کے انقلابی رہنماؤں نے Declaration of Indepence لکھا تو وہ کافی حد تک سماجی معاہدے سے متاثر تھے۔

روسو کے فلسفے میں کسی حد تک سوشلسٹ نظریات کا پرچار بھی ہے۔ روسو اور سوشلزم دونوں کے ہاں سماج کی اہمیت زیادہ ہے اور سماج کی ترقی ہی فرد کی ترقی ہے۔ دونوں ذاتی ملکیت کے خلاف ہیں۔

دراصل روسو کے فلسفے میں کئی باتیں ایک دوسرے کے متضاد ہیں۔ لہٰذا مختلف طبقۂ فکر

1-Rousseau and Revolion By: Will Durrant Page:888.

کے لوگوں کو اس سے اپنی پسند کا مواد مل جاتا ہے۔ عجیب بات یہ ہے کہ مذہب، جمہوریت، سوشلزم، مطلق العنانیت، انفرادیت اور اجتماعیت وغیرہ جیسے تمام نظریے روسو کی گدڑی میں دستیاب ہیں۔ روسو آزادی اور مساوات دونوں کی بات کرتا ہے۔ حالاں کہ جہاں آزادی ہوگی وہاں مساوات برقرار نہیں رہ سکے گی اور جہاں مساوات قائم رکھنے کی کوشش کی جائے گی تو یقیناً وہاں آزادی متاثر ہو گی مگر روسو کے پاس یہ سب کچھ موجود ہے۔ روسو کے لیے یہ بالکل ٹھیک کہا گیا ہے کہ اسے کسی نے بھی مکمل طور پر پڑھنے اور سمجھنے کی کوشش نہیں کی۔ ہر کوئی اپنے مطلب کی بات نکال کر روسو کی شان میں قصیدے پڑھنے بیٹھ جاتا ہے۔ کوئی یہ کیوں نہیں کہتا کہ جہاں روسو کے فلسفے نے جمہوری اقدار کو پروان چڑھایا، وہیں ہٹلر جیسا جابر حکمران بھی پیدا کیا۔

روسو کے تعلیمی نظریات نے بھی اکثریت کو متاثر کیا۔ امریکہ کے جان ڈیوے (Dewey) اٹلی کی ماریا مانٹیسوری اور جرمنی کے فریڈرک فروئیل نے کے جی (Kinder Garton) کا نظام بھی روسو سے متاثر ہو کر متعارف کرایا۔

روسو پر تنقید

دنیا بھر میں روسو پر ہونے والی تنقید اور تعریف کے انبار لگ چکے ہیں۔ تعریف کرنے والوں کی اکثریت جذباتیت پسند اور تنقید کرنے والوں کی اکثریت عقل پسند ہے۔ روسو پر ہونے والی تنقید کا اختصار ذیل میں دیا جاتا ہے:

۱۔ عقل کی مخالفت میں روسو بہت آگے نکل گیا ہے اور دل کو انسان کا رہبر بناتا ہے لیکن دل کا کہنا موضوعی ہے جب کہ انسانی مسائل معروضی حقائق کی روشنی میں ہی حل ہو سکتے ہیں۔ افریقہ کے وحشی قبائل آدم خور ہیں اور انسان کا گوشت کھانے کے لیے ان کا دل للچاتا ہے۔ ''والٹیر کے پسندیدہ انسان کا دل چاہتا ہے کہ صرف عیسائی پادریوں کا گوشت کھانے کی اجازت ہو۔ بدھ مذہب والوں کا دل خدا کے وجود کو تسلیم نہیں کرتا اور وہ ہر قسم کے تشدد کو ناپسند کرتے ہیں۔''[1]

۲۔ روسو نے اپنے فطری اور وحشی قبیلے کا ذکر بار بار اور شدت کے ساتھ کیا ہے۔ اس کی ساری رومانیت اور عدم مساوات کا فلسفہ ان وحشیوں پر مشتمل ہے لیکن وہ وحشی مگر نیک اور پُرسکون قبیلے ہیں کہاں؟ تاریخ اور جغرافیے کی حدود میں کہیں بھی ان کا نام ونشان نہیں ملتا۔ یہ محض روسو کی ذہنی اختراع ہے۔

1-History of Western Philosophy, By:B. Russel Page:668.

۳۔ روسو کے دور، خواہ جدید دور میں بڑی بڑی ریاستیں چھوٹے چھوٹے حصوں میں تقسیم کرنا ممکن ہی نہیں ہے۔ روسو کے پاس اس بات کا کوئی خاطر خواہ جواب نہیں ہے کہ یہ چھوٹی چھوٹی ریاستیں اپنا دفاع کیسے کریں گی؟

۴۔ روسو جہاں جمہوریت کا خوب صورت نعرہ دیتا ہے وہیں وہ مساوات کو لازم قرار دیتا ہے۔ فطری طور پر انسانوں میں یکساں صلاحیتیں نہیں ہوتی ہیں۔ کوئی طاقت ور تو کوئی عقل مند، کوئی زیادہ اور کوئی کم ذہین ہے۔ کسی کو محنت کر کے تسکین ملتی ہے تو کوئی بالکل سست ہوتا ہے، جب ان تمام صلاحیتوں کو آزاد چھوڑا جائے گا تو یقیناً جو زیادہ باصلاحیت، زیادہ عقل مند اور طاقت ور ہوں گے وہ آگے نکل جائیں گے اور وسائل پر قابض ہو جائیں گے اور کم صلاحیتوں کے مالک پیچھے رہ جائیں گے۔ روسو کی مساوات کا مطلب یہ ہے کہ عقل مند اور بیوقوف، ہنر مند اور جاہل، محنتی اور کاہل، باصلاحیت اور بے صلاحیت کو برابری کی سطح پر لایا جائے۔ یعنی ریاست کا یہ فرض ہے کہ باصلاحیت فرد کی صلاحیت پر کنٹرول رکھے اور اس کی آزادی کو کم کر کے دیگر کے برابر کیا جائے۔ وہ گرج دار آواز میں کہتا ہے: ''انسان آزاد پیدا ہوا ہے مگر ہر جگہ زنجیروں میں جکڑا ہوا ہے۔'' مگر خود ہی اپنی نفی کر کے آزادی کے بجائے مساوات کی پُر زور وکالت کرتا ہے۔

۵۔ روسو ریاست میں اقتدارِ اعلیٰ کا مالک ''ارادے'' کو قرار دیتا ہے لیکن ضروری نہیں ہے کہ ہر کسی کا عام ارادہ وہی ہو۔ ریاست میں کئی گروہ ایک دوسرے سے ٹکرا سکتے ہیں۔ اس صورتِ حال میں کیا کیا جائے؟ روسو کے پاس اس کا حل یہ ہے کہ گروہی مفادات پر ریاستی بندشیں لگائی جائیں۔ ذرا سوچیں کہ عملی حالت میں یہ صورتِ حال کہاں جا پہنچے گی۔ ریاست کو تمام مذہبی اداروں (ماسوائے سرکاری مذہب کے) پر بندش لگانی پڑے گی۔ سیاسی جماعتوں، مزدور یونینوں اور دیگر تنظیموں پر پابندی عائد کرنا پڑے گی، جس کا لازمی نتیجہ ایک مطلق العنان ریاست کی صورت میں سامنے آئے گا جس میں ہر فرد کی حیثیت ایک کمزور شہری کی ہو کر رہ جائے گی۔ [1]

روسو کے ایسے خیالات نے ہی آگے چل کر ہٹلر اور اسٹالن جیسے جابر حکمرانوں کو جنم دیا۔

۶۔ روسو نے عقل کے ساتھ ساتھ سائنس اور تہذیب کی مخالفت کر کے نسلِ انسانی کو پیچھے دھکیلنے کی کوشش کی۔

1-History of Western Philosophy By:Bertrand Russal, Page:673.

فرانسیسی روشن خیالی اور والٹیر

عقلی دَور کا جو پودا لاک اور ہیوم نے لگایا تھا۔ وہ فرانس میں ''روشن خیالی'' کے نام سے بڑھ کر تناور درخت بن گیا۔

قرونِ وسطیٰ کے تاریک دَور کو روشن کرنے کے لیے عقلیت پسندی کا چراغ جلایا گیا کیوں کہ اس تاریک دَور میں پادریوں نے عقل کو دبا کر رکھنے کے لیے عقل کو انتہائی ناقص شے بنا کر پیش کیا گیا۔ عقل کا یہ مطلب لیا جاتا تھا کہ گویا عقل استعمال کرنے والا شخص کافر ہو' جہاں پادریوں اور بادشاہوں کی لوٹ مار کو روکنے والا کوئی نہ رہے تو وہاں یقیناً ہر ظلم کو مقدر، بیماری کو قہر الٰہی اور پادری کو خدا کا مقرب وغیرہ سمجھنا ایک فطری بات تھی۔

فرانسیسی روشن خیالی نے عقل دشمنی اور توہم پرستی کے خلاف اپنا قلمی جہاد جاری رکھا۔ روشن خیالی ہے کیا؟

''ایک خود ساختہ بچکانہ سوچ سے باہر نکلنے کا نام روشن خیالی ہے۔''[1]

جس طرح چھوٹا بچہ کسی بڑے کی راہنمائی کے بغیر اپنی عقل استعمال نہیں کر سکتا ہے اسی طرح قرونِ وسطیٰ کے لوگوں نے خود پر ایک بچپنا یا طفولیت طاری کر رکھی تھی اور ان کے لیے پادریوں اور حکمرانوں کا کہا ہی حرفِ آخر تھا۔ ضرورت اس اَمر کی تھی کہ لوگوں کو اپنی عقل استعمال کرنے کی

1-History of Western Philosophy By:Bertrand Russat, Page:673.

ترغیب دلائی جائے۔لوگوں کے پاس عقل تو موجود تھی مگر ہمت کی کمی تھی۔لوگوں کو عقلی استدلال استعمال استعمال کرنے کے لیے راغب کرنے کا سہرا، روشن خیالی کے راہنماؤں بیل، والٹیر، دیدرو اور دیگر جامع نگاروں☆ کے سَر ہے جنھوں نے اپنی زندگیاں اور قلم لوگوں کو ان کی عقل استعمال کرانے کے لیے وقف کر ڈالے تھے۔روشن خیالی کوئی نیا فلسفہ تو نہیں ہے مگر فلسفے کو استعمال کرنے کے لیے ایک لائحہ عمل یا پروگرام ہے جس کے اہم نکات یہ ہیں☆☆۔

i۔ عقل انسان کی میراث ہے جس کے ذریعے درست سوچ اور درست عمل کیا جا سکتا ہے۔

ii۔ انسان فطری طور پر نیک اور عقلی مخلوق ہے۔

iii۔انسان انفرادی حتیٰ کہ مجموعی طور پر عقل کے ذریعے عروج پر پہنچ سکتا ہے۔

iv۔عقلی طور پر تمام انسان برابر ہیں لہٰذا سب کو یکساں حقوق اور انفرادی آزادی ملنی چاہیے۔

v۔ رواداری تمام مکاتیب فکر کے لیے۔

vi۔ایمان کا دارومدار پادریوں کے احکامات، حکمرانوں کے فیصلوں یا آسمانی کتابوں کے بجائے عقل پر ہونا چاہیے یعنی خدا کو سمجھنے کے لیے آسمانی کتابوں کے بجائے عقل استعمال کریں۔

vii۔انسانوں میں دکھائی دینے والے اختلافات مصنوعی اور معمولی ہیں جو ختم کر کے محبت کی بنیاد پر نئے سرے سے تعلقات قائم کیے جائیں جن میں کوئی بھی لسانی، نسلی اور جغرافیائی تصادم نہ ہو۔

☆ جامع نامہ Encyclopaedia۔

☆☆Companion to Philosophy.

والٹیر

(1694ءتا1778ء)

فرانسکوس میری اروییٹ جو آگے چل کر والٹیر کے قلمی نام سے مشہور ہوا۔فرانس کے ایک متوسط امیر گھرانے میں پیدا ہوا اور مستقبل میں قلم کے وہ جوہر دکھائے کہ تاریخ دانوں نے پوری اٹھارویں صدی کو والٹیر کا نام دے دیا۔یعنی والٹیر اور اٹھارویں صدی کی سوچ ایک دوسرے کے نعم البدل ہیں۔والٹیر نے فلسفے کا کوئی باقاعدہ نظام تو نہیں دیا لیکن فلسفے رعقلیت کی ایسی زوردار تشہیر کی کہ پورے یورپ کے دانش ور اور فلسفی اس کے دوست اور معتقد بن گئے۔قلم کے ذریعے اتنی بڑی جنگ غالباً کسی اور نے نہیں لڑی۔اس کی زندگی کا احوال بھی بہت دلچسپ ہے۔

وہ پیدائش کے وقت بہت کمزور تھا۔اس کی ماں اسے جنم دے کر مرگئی اور والٹیر کی کمزوری کو دیکھتے ہوئے دایہ نے کہا کہ ''مرا ہی چاہتا ہے، ایک دن بھی زندہ رہ گیا تو بڑی بات ہے۔'' والٹیر کی جسمانی کمزوری تو عمر بھر رہی اور کبھی کبھار تو ایسا بیمار ہو جاتا کہ دایہ کے الفاظ دُہرانے لگتا ''بس ابھی مرجاؤں گا!'' مگر والٹیر مرتے مرتے بھی 84 سال زندہ رہا، جب اسے لکھنے پڑھنے کے لیے بٹھایا گیا تو وہ شاعری کرنے لگا ''میرا بیٹا بگڑ چکا ہے اور بہت نکما ہوگا، جب وہ بڑا ہوا تو اس کے والد نے کوئی کام کاج کرنے کا کہا تو والٹیر نے جواب دیا ''میں تو ادیب بنوں گا، کوئی دوسرا کام مجھ سے نہ ہوگا۔''

نوجوانی کے جوش میں بھی پڑھنے لکھنے سے دست بردار نہ ہوا۔البتہ اس کی راتیں شہر کے امیر اور رنگین مزاج دوستوں کی صحبت میں گزرتی تھیں، جو والٹیر کی ظرافت اور فقرہ بازی کے مداح

تھے۔ والٹیر کے والد نے اس کی حرکتوں سے تنگ آ کر اسے فرانسیسی سفیر کے پاس ہیگ بھیج دیا کہ شاید سدھر جائے، مگر یہاں بھی ایک لڑکی سے معاشقہ کر ڈالا۔ وہ اس لڑکی کو بھگا لے جانے کے چکر میں ہی تھا کہ سفیر کو پتا چل گیا اور والٹیر کو واپس فرانس بھیج دیا گیا۔

اس زمانے میں فرانس کے بادشاہ لوئی چودہم (Lous xiv) کی وفات کے بعد اس کے نوعمر بیٹے کو تخت نشین کیا گیا لیکن درحقیقت اقتدار ایک نائب کے ہاتھ میں آ گیا۔ اس زمانے میں پیرس میں بے راہ روی اور عیاشی بڑھ گئی اور والٹیر بھی اس میں خوب خوب شامل ہو گیا۔ لعل چاہے گدڑی میں ہی کیوں نہ ہو، اس کی روشنی چھپ نہیں سکتی۔ سو والٹیر کی ذہانت اور ظرافت کلب کی رنگین روشنیوں سے نکل کر اخباری دنیا سے ہوتی ہوئی قصرِ سلطانی تک پہنچ گئی۔ اقتدار پر قابض نائب نے اخراجات کم کرنے کی خاطر شاہی اصطبل کے آدھے گھوڑے بیچ ڈالے تو والٹیر نے لکھا ''بہتر ہے کہ بادشاہ کے دربار میں موجود گدھوں کی تعداد گھٹائی جائے۔'' یہ بات نائب سلطان کو بہت بُری لگی اور اس نے والٹیر سے کہا: ''مَیں یقین سے کہہ سکتا ہوں کہ مَیں تمہیں ایسی جگہ کی سیر کرا سکتا ہوں جو تم نے کبھی بھی نہیں دیکھی ہو گی۔''

''ایسی کون سی جگہ ہے؟'' والٹیر نے پوچھا۔

''باسٹل جیل'' نائب سلطان نے جواب دیا۔ [1]

ہوا بھی یہی اگلے روز 16 اپریل سن 1717ء کے دن والٹیر کو ایک سال کے لیے جیل بھیج دیا گیا۔ والٹیر کی عمر صرف 23 سال تھی۔ اس نے جیل میں داروغے کو ایسے ایسے لطیفے سنائے کہ وہ والٹیر سے بہت خوش ہوا اور اس کو لکھنے پڑھنے کی کھلی آزادی دے دی۔ ایک سال کے عرصے میں والٹیر نے سانحاتی ڈرامہ ''اوڈیپ'' لکھ ڈالا۔ نائب سلطان کو محسوس ہوا کہ اس نے والٹیر کو قید کر کے شاید زیادتی کی ہے۔ لہٰذا اس نے والٹیر کو رہا کر کے اس کے لیے وظیفہ مقرر کر دیا۔ والٹیر نے شکریہ ادا کرتے ہوئے لکھا: ''آپ کی مہربانی کہ آپ نے میرے قیام و طعام کا بندوبست کیا مگر برائے کرم آئندہ کے لیے میرے صرف طعام کا بندوبست کریں، قیام کا بندوبست مَیں خود کر لوں گا۔''

سن 1718ء میں اس کا ڈرامہ ''اوڈیپ'' اسٹیج پر پیش کیا گیا جو بہت مقبول ہوا اور والٹیر کو معقول آمدنی بھی ہوئی۔ اس نے یہ رقم نفع بخش کاروبار میں لگا دی۔

1-Story of Philosophy by: W.D, Page:204.

والٹیر کی شہرت میں بے پناہ اضافہ ہونے لگا لیکن اس نے پھر بھی کسی کا لحاظ نہ کیا، جو جی میں آتا وہ ہر کسی کے منہ پر کہہ دیتا، مگر انداز ایسا فنکارانہ ہوتا تھا کہ سننے والے داد دیئے بغیر نہ رہ سکتے۔ لیکن اسے یہ شہرت اور عزت مہنگی پڑی۔ ایک لارڈ اس پر خفا ہو گیا اور اسے دوبارہ باسٹل جیل کا منہ دیکھنا پڑا لیکن اس دفعہ اسے یہ موقعہ فراہم کیا گیا کہ ''وہ جیل میں رہے یا جلاوطنی قبول کرے۔'' والٹیر نے جلاوطنی قبول کی اور انگلستان پہنچ گیا۔

انگلستان میں والٹیر نے انگریزی زبان سیکھ لی اور انگریزی ادب و فلسفے کا خوب مطالعہ کیا۔ وہ انگلستان کی جس بات سے سب سے زیادہ متاثر ہوا وہ ''اظہار کی آزادی'' تھی۔ ہر کوئی آزاد تھا، جسے جو جی چاہے کہہ دے مگر ردِعمل میں کوئی جیل یا سزا نہیں تھی۔ وہ انگلستان کی ہر بات سے اس قدر متاثر ہوا کہ اس کی شان میں ایک کتاب ''Letters on the English'' لکھ ڈالی۔

کچھ عرصہ بعد والٹیر کو فرانس واپس آنے کی اجازت مل گئی اور وہ آ کر دوبارہ فرانس کے رومان پرور ماحول کی رنگینیوں میں کھو گیا۔ پانچ سال سکون سے گزر گئے۔ آخر کار اس کی کتاب "Letter on the English" کا مسودہ ایک پبلشر کے ہاتھ لگ گیا، جس نے والٹیر کی اجازت کے بغیر ہی چھاپ دیا۔ اس کتاب میں انگریزوں کے نظام کی بہت زیادہ تعریف کی گئی تھی، جس پر فرانس کی حکومت خفا ہو گئی۔ کتاب کو سرِعام جلایا گیا اور والٹیر کو دوبارہ فرار ہونا پڑا، مگر وہ جاتے جاتے کسی کی بیوی کو بھی بھگا کر ہمراہ لے گیا اور جا کر سرے میں رہائش پذیر ہوا، جہاں دونوں کافی عرصہ مقیم رہے۔

برلن کا شہزادہ فریڈرک جو مستقبل میں فریڈرک اعظم کے نام سے مشہور ہوا۔ وہ والٹیر سے اس قدر متاثر ہوا کہ اسے خط لکھ کر اپنے پاس بلا لیا، جہاں والٹیر دو سال تک رہا اور آخر میں فریڈرک سے اختلاف کی وجہ سے برلن کو الوداع کہا۔ پیرس آتے ہوئے اسے خبر ملی کہ اسے ایک مرتبہ پھر ملک بدر کر دیا گیا ہے۔ والٹیر اب کافی تھک چکا تھا اور اس کی عمر بھی 60 سال ہو چکی تھی۔ آخر ایک سرحدی جاگیر ''لی ڈیلی سیس'' خرید کر وہاں رہنے لگا لیکن کچھ ہی عرصے کے بعد وہ ''فیرنے'' نامی جاگیر پر منتقل ہو گیا، جہاں وہ آخری دم تک رہا۔

والٹیر نے بے شمار مضامین، کتابیں اور ڈرامے لکھے۔ یہاں تمام کی تفصیلات لکھنا ممکن نہیں۔ لہٰذا اس کے خیالات کا صرف خلاصہ پیش کیا جاتا ہے۔

والٹیر اور خدا

مذاہب عام طور پر اور عیسائیت خاص طور پر ''عقل'' کو کند اور ایمان کو مضبوط کرنے پر زور دیتے ہیں، مگر خاموشی والٹیر کے مزاج میں ہی نہیں تھی۔ مذہب سے اس کا ٹکراؤ ہونا ہی تھا لیکن اس کا ٹکراؤ مذہبی کٹرپن اور بنیاد پرستی سے بھی تھا۔ وہ خدا کے وجود کا منکر نہیں تھا، کہتا ہے ''اگر ہم ایک گھڑی کو دیکھتے ہیں تو یقیناً اس گھڑی کے بنانے والے کو بھی تسلیم کرتے ہیں۔ آخر یہ کس طرح ہوسکتا ہے کہ اتنی بڑی کائنات اور اس کے نظام کا کوئی خالق نہیں ہوگا؟''[1]

والٹیر صرف خدا کے وجود کا قائل تھا، لیکن وہ کسی بھی مذہب، وحی اور معجزے وغیرہ کا قائل نہیں تھا۔ اس کا خیال تھا کہ خدا نے اس دنیا کو ایک گھڑی (Watch) کی طرح بنایا ہے، جو خدائی قوانین کے تحت چلتی ہے اور اس میں خدا کوئی مداخلت نہیں کرتا۔ بہتر طرزِ عمل یہ ہے کہ زندگی ان آفاقی قوانین کے مطابق گزاری جائے، یہی بہترین عبادت ہے۔ دُعا کو والٹیر فضول قرار دیتا ہے اور اس کے خیال میں دُعا کا مطلب یہ ہے کہ خدا خود اپنے قانون کی خلاف ورزی کرے۔ والٹیر روح کا کسی حد تک قائل ہے مگر روح کی ابدیت کا نہیں۔ وہ آخرت کا بھی منکر ہے لیکن آگے چل کر وہ اپنی سوچ تبدیل کر لیتا ہے اور کہتا ہے کہ خدا اور آخرت کے بغیر انسان ''نیک'' نہیں ہوگا۔ لہٰذا وہ اس بات پر اصرار کرتا ہے کہ عام انسان کے لیے ضروری ہے کہ وہ خدا اور آخرت پر ایمان رکھے۔ اس صورت میں اگر وہ بے ایمانی کرے گا تو بھی قدرے کم۔

والٹیر کے نظریے کو واحدیت (Deism) کا نام دیا گیا جس کا مطلب ہے صرف ایک خدا پر یقین اور مذہب سے انکار۔

لزبن کا زلزلہ اور والٹیر کا ردِ عمل

یکم نومبر سن 1755ء کو پورچوگال کے شہر لزبن میں ایک بڑا اور تباہ کن زلزلہ آیا جس نے چھ منٹوں میں پندرہ ہزار انسانوں کو موت کی نیند سلا دیا۔ یہ عیسائیوں کا ''All Saints day'' یعنی ان کے بزرگوں کا دن تھا۔ گرجا گھر پادریوں سے بھرے ہوئے تھے اور ایک ہی جھٹکے سے سب بزرگ اجل کا شکار ہو گئے۔ زندہ بچ رہنے والے پادریوں نے یہ کہا کہ زلزلہ خدا کا عذاب تھا جو کہ

1-Age of voltaire by:W. D, Page:715.

گناہ گاروں کے لیے سزا تھا۔" لیکن اس زلزلے میں اتنے سارے بے گناہ اور راہب پادری کیوں ہلاک ہو گئے؟" اس سوال کا جواب پادریوں کے پاس بھی نہ تھا۔ اس کے علاوہ رباط میں زلزلے کی تباہ کاری جامع مسجد پر نازل ہوئی جو منٹوں میں مسمار ہو گئی۔

والٹیر تڑپ اُٹھا۔

اب لائبنز کہاں ہے جس نے کہا تھا کہ "یہ بہترین ممکن دنیا ہے؟" پوپ کہاں ہے جو کہتا پھرتا پھرتا تھا کہ "جو ہوتا ہے بہتر ہی ہوتا ہے۔" یا اس کے خیال کی اب کیا حیثیت تھی کہ "جزوی بُرائی کُل کے لیے نیکی ہے۔" غصے میں آ کر والٹیر نے ایک عظیم نظم لکھی جو ایک اعلیٰ شاہکار ہے۔

یہ نظم دراصل مرنے والوں اور عذاب بھگتنے والوں کے لیے نوحہ تھی، جس سے والٹیر کی انسان دوستی اور حساس طبیعت کا پتا چلتا ہے۔ ایک جگہ لکھتا ہے:

> "لیکن آخر ان معصوم اور صغیر بچوں نے کیا جرم کیا تھا جو اپنی ماؤں کی چھاتیوں سے چمٹے، خون میں لت پت ہوئے، ملبے میں دبے پڑے ہیں؟ کیا لندن اور پیرس میں لزبن سے کم گناہ گار ہیں؟ پھر بھی لزبن چور چور ہے اور پیرس رقص کر رہا ہے۔ کیا خدا اس عذاب ناک دنیا کے بجائے بہتر دنیا تخلیق نہیں کر سکتا تھا، مَیں اپنے خدا کی عزت کرتا ہوں البتہ مجھے انسان ذات سے محبت ہے۔"
>
> والٹیر کا ردِعمل پڑھ کر روسو نے اسے خط لکھا کہ لزبن میں انسان کو مہذب ہونے کی سزا ملی ہے۔ اگر انسان جنگلات میں رہتا تو اس پر زلزلے کا کوئی اثر نہ ہوتا۔ لائبنز نے جو کچھ کہا ہے، وہ سچ ہے کہ ہر بات کا کوئی نہ کوئی مقصد ہوتا ہے اور گہری نظر سے دیکھا جائے تو ہر شے اور عمل درست لگے گا۔"(1)

روسو کے جواب نے والٹیر کو انگاروں پر لٹا دیا اور اس نے تین دنوں میں ایک بہترین ناول لکھا، جس میں والٹیر کا قلم ناگ کی طرح پھنکارتا ہے اور اس کے جملے زہر بھری تنقید کے تیر ہیں۔ کینڈائیڈ آج بھی ایک اعلیٰ شاہکار ہے۔

کینڈائیڈ

یہ مختصر ناول بیک وقت لائبنز، روسو اور کئی دوسرے پادری مفکرین کی دھجیاں اُڑاتا ہے

1-Age of voltaire by: W.D, Page:721.

اوران کے نظریات کواس طرح پیش کرتا ہے کہ یہ مضحکہ خیز بن جاتے ہیں۔ کینڈ ایڈ ایک امیر زادہ اور ایمان دار لڑکا ہے اور پروفیسر پنگلاس کا شاگرد ہے جو مابعدالطبیعاتی دینیات کا استاد ہے اور ہر شے کی عجیب وغریب توجیح پیش کرتا ہے۔ مثلاً کہتا ہے کہ ''دنیا میں کوئی بھی شے بے مقصد نہیں ہے، ناک اس لیے ہے کہ عینک آسانی سے لگائی جا سکے۔ پاؤں اس لیے ہیں کہ موزے پہنے جاسکیں۔ جانوراس لیے ہیں کہ ان کا گوشت کھایا جاسکے، جو یہ کہتے ہیں کہ جو کچھ ہوتا ہے، اچھا ہوتا ہے تو وہ غلط ہیں۔ انھیں کہنا چاہیے کہ جو کچھ ہوتا ہے اس سے بہتر ہو نہیں سکتا۔

پنگلاس کی تقریر کے دوران بلغاریہ کی فوج حملہ کر دیتی ہے اور کینڈ ایڈ گرفتار ہو جاتا ہے۔ کینڈ ایڈ اپنے استاد سے بہت زیادہ متاثر ہے۔ لہٰذا وہ سمجھتا ہے کہ اس کی گرفتاری میں بھی کوئی بہتری ہو گی۔ بلغاریہ کی فوج اسے فوجی تربیت دیتی ہے۔ ایک دن اسے چار افراد گھیر لیتے ہیں اور باندھ کر پوچھتے ہیں۔ ''36 کوڑے کھاؤ گے یا دو گولیاں؟'' کینڈ ایڈ کہتا ہے ''انسان خودمختار ہے اور مَیں یہ خودمختاری استعمال کرتے ہوئے کوڑے کھانے کو ترجیح دوں گا'' اور پھر کہتا ہے ''جو کچھ ہوتا ہے اس میں بھی کوئی بہتری ہو گی۔ انفرادی تکلیف سے اجتماعی خیر پیدا ہوتی ہے۔'' کینڈ ایڈ وہاں سے فرار ہو کر ایک جہاز میں سوار ہو جاتا ہے۔ جہاں اس کی پنگلاس سے دوبارہ ملاقات ہوتی ہے، جو اسے بتاتا ہے کہ تمہارے والدین قتل کر دیے گئے ہیں، ان کا قلعہ گرا دیا گیا ہے، مگر کوئی بات نہیں کیوں کہ انفرادی تکلیف، اجتماعی رحمت کی باعث ہے۔ اس پر کینڈ ایڈ خوش ہو جاتا ہے۔

کینڈ ایڈ مختلف مصائب برداشت کرتا ہے اور پنگلاس پھر ان کی عجیب وغریب تاویلیں دیتا ہے۔ آخر کار وہ ترکی میں پہنچ کر مزارعے بن جاتے ہیں اور ان کی اس قسم کی گفتگو سے ناول ختم ہو جاتا ہے۔

پنگلاس کہتا ہے ''اس دنیا سے بہتر دنیا تصور میں آ ہی نہیں سکتی۔ لہٰذا واقعات ایک سلسلے کے پابند ہوتے ہیں۔ مثال کے طور پر اگر تمہیں تمہارے محل سے نہ نکالا جاتا تو عدالت کے کٹہرے میں کھڑے نہ ہوتے، امریکہ کا سفر نہ کرتے، اپنا پایا ہوا سونا نہ لٹواتے تو پھر آج یہاں بیٹھ کر یہ مربہ کس طرح کھا سکتے تھے۔''

والٹیر اور یورپ کا ضمیر

والٹیر نے قلم ہاتھ میں لے کر محض کاغذ سیاہ نہیں کیے۔ اس نے قلم سے تلوار کا کام لیا اور

یورپ کا ضمیر بیدار کرنے کے لیے عملی جدوجہد بھی خوب کی۔ مذہبی تعصب اپنے عروج پر تھا۔ کیتھولک اور پروٹسٹنٹ ایک دوسرے کے خون کے پیاسے تھے مگر جیسا کہ کیتھولک عیسائیوں کی اکثریت تھی۔ اس لیے پروٹسٹنٹ ہمیشہ مصیبت میں رہتے۔ فرانس کا قانون پروٹسٹنٹ طبقے کے لیے بے رحم تھا۔ وہ نہ تو کوئی سرکاری ملازمت کر سکتے تھے اور نہ ہی ڈاکٹر، وکیل یا کوئی دوسرا باعزت پیشہ اختیار کر سکتے تھے۔ ان کے کوئی سماجی حقوق نہیں تھے۔ اگر ان کی شادی کسی کیتھولک پادری نے نہ کرائی ہوتو ان کی عورتوں کو ''کنیز'' بنایا جاتا تھا۔

ٹولاؤز میں جین کالاز نامی ایک پروٹسٹنٹ اپنے کنبے کے ساتھ رہتا تھا۔ اس کی ایک دُکان تھی۔ ایک دن کالاز کا بیٹا مایوسی کے عالم میں دُکان میں گیا اور چھت سے رسہ باندھ کر خودکشی کر لی۔ اہلِ خانہ کو جب پتا چلا تو انھوں نے اسے فوراً نیچے اُتارا اور ڈاکٹر کو بلایا لیکن لڑکا ختم ہو چکا تھا۔ اس وقت خودکشی کرنے والوں کے لیے فرانس کا قانون بہت سخت تھا۔ خودکشی کرنے والے کی لاش کو ننگا کر کے گلیوں میں گھسیٹا جاتا تھا اور آخر میں لاش کو پھانسی دی جاتی تھی۔ بیٹے کی لاش کو بے حرمتی سے بچانے کے لیے جین کالاز نے اس کو قدرتی موت بتا کر دفن کرنے کی کوشش کی، لیکن معاملہ کھل گیا اور پولیس پہنچ گئی۔ کسی کیتھولک نے یہ افواہ پھیلا دی کہ لڑکا کیتھولک عقیدہ قبول کر چکا تھا لہٰذا اسے اس کے پروٹسٹنٹ گھرانے نے قتل کر دیا۔ بغیر کچھ سوچے سمجھے جین کالاز اور اس کے اہلِ خانہ کو گرفتار کر لیا گیا اور ان پر مقدمہ چلایا گیا۔ اس کے بیٹے کو کیتھولک سمجھتے ہوئے نہایت عزت کے ساتھ دفنایا گیا۔

عدالت کے لیے کالاز کا پروٹسٹنٹ ہونا ہی کافی تھا۔ سارے گھرانے کو پھانسی کی سزا سنائی گئی۔ اپیل کی گئی جس میں صرف جین کالاز کی پھانسی کی سزا برقرار رکھی گئی لیکن مکمل ثبوت نہ ملنے کی وجہ سے یہ حکم دیا گیا کہ تشدد کے ذریعے کالاز سے اقبالِ جرم کرایا جائے۔

کالاز پر انسانیت سوز بھیانک تشدد کیا گیا۔ اس کے بازوؤں اور ٹانگوں میں رسے باندھ کر اس قدر کھینچا گیا کہ ہڈیوں کے سارے جوڑ ٹوٹ گئے، پھر پانی کا مشکیزہ زبردستی اس کے حلق میں اُتارا گیا لیکن کالاز یہ کہتا رہا کہ وہ بے قصور ہے، پھر اسے عوام کے سامنے گرجا گھر کے آگے صلیب پر چڑھایا گیا اور اس کے ہر ہر جوڑ میں لوہے کی میخیں ٹھونکی گئیں۔ کالاز حضرت عیسیٰؑ کو پکارتا رہا اور عدالت کے نمائندے قہقہے لگاتے رہے، پھر اس کی لاش کو پھانسی دی گئی اور آخر میں اسے جلا دیا گیا۔

کالاز کی جملہ جائیداد ضبط کر لی گئی۔ اس کا خاندان منتشر ہو گیا لیکن کالاز کی ایک بیٹی کسی

طرح والٹیر تک پہنچ گئی۔

سارا قصہ سننے کے بعد والٹیر تڑپ اُٹھا۔ اس کی ساری ظرافت ہوا بن کر اُڑ گئی۔ مسکرانا بھی ترک کر دیا۔ مذہب کی آڑ میں بربریت کی انتہا اور لوگوں کی خاموش تماش بینی دیکھ کر پختہ تہیہ کیا کہ وہ یورپ کے سوئے ہوئے ضمیر کو جگائے گا اور کالاز کو ''بے گناہ'' قرار دلوائے گا۔

وہ اپنے قلم کی ساری توانائیاں استعمال کرتے ہوئے پمفلٹ لکھنے لگا اور تمام باضمیر لکھاریوں سے اپیل کی کہ وہ اس کا ساتھ دیں۔ پوری دنیا سے چندے کی اپیل بھی کی، جس کا اسے بھرپور ردِعمل ملا۔ انگلستان کی رانی، روس کی شہزادی، پولینڈ کے بادشاہ وغیرہ نے بھی چندہ بھیجا اور بڑے بڑے وکیل بلا معاوضہ والٹیر کا ساتھ دینے لگے۔

والٹیر کے پمفلٹ آج بھی انسانی آزادی اور رواداری کی بہترین دستاویز ہیں۔ وہ لکھتا ہے:

> ''ہر انسان کو حق حاصل ہونا چاہیے کہ وہ اپنی عقل کے مطابق زندگی گزارے اور عقل کے مطابق ایمان اختیار کرے۔ اگر آپ اقلیتی فرقے رمذہب کو غلط سمجھ کر مٹا دینا چاہتے ہیں تو پھر آپ اپنے آباؤ اجداد اور ابتدائی عیسائیوں کی بے حرمتی کرتے ہیں۔ کیوں کہ اس وقت یہ عیسائی بھی اقلیت میں تھے۔۔۔ مذہبی تعصب ایک جرم ہے اور اس کا علاج رواداری ہے۔''[1]

تین سال کی مسلسل اور اَن تھک جدوجہد کے بعد اعلیٰ عدالت نے کالاز کو بے گناہ قرار دیا اور اس کی جائیداد لوٹا دی۔ والٹیر خوشی سے رو دیا۔ اس کے بعد والٹیر نے مذہبی جنونیت کے خلاف مسلسل جنگ جاری رکھی۔

والٹیر کے آخری ایام

آخر اس کی دایہ کے کہے گئے لفظوں کو حقیقت کا جامہ پہنانے کا وقت آ ہی گیا ''مر اہی چاہتا ہوں، مرا ہی چاہتا ہوں'' کرتے کرتے والٹیر اپنی زندگی کے 83 سال پورے کر چکا تھا۔ اس کی طبیعت تو پہلے بھی خراب رہتی تھی مگر اب انتہائی کمزور ہو چکا تھا لیکن اس کے چہرے پر معصومیت اور مسکراہٹ بدستور موجود رہی۔ اس کے مداحوں کی تعداد لاکھوں تک پہنچ چکی تھی، جنھوں نے اس کی

1-Age of woltaire by: W.D, Page:731.

زندگی میں ہی اس کا مجسمہ بنوا کر نصب کر ڈالا۔

اپنی عمر کے آخری حصے میں اس کا جی چاہا کہ پیرس میں مرنا چاہیے۔ معالجین نے اسے طویل سفر سے روکا، لیکن پیرس کی حسین یادیں اسے تڑپانے لگیں۔ طویل سفر کے بعد جب وہ پیرس میں اپنے دوست کے گھر پہنچا تو اس کی سانس ٹوٹ رہی تھی۔ بے شمار لوگ اسے ملنے آئے جن میں بنجامن فرینکلن بھی اپنی پوتی کے ساتھ ملنے پہنچا اور والٹیر سے کہا کہ اس کی پوتی کو دُعا دے۔ والٹیر نے اس کے سر پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا "بیٹا! خدا اور آزادی کی راہ میں اپنے آپ کو وقف کر ڈالو۔"

والٹیر نے اپنے ہاتھوں سے مندرجہ ذیل آخری تحریر لکھی:

> "میں اس حالت میں مَر رہا ہوں کہ دل میں خدا بسا ہوا ہے، دوستوں کی محبت سے سرشار ہوں، دشمنوں سے نہ شکایت ہے نہ نفرت، ہاں البتہ توہم پرستی سے سخت نفرت ہے۔" (دستخط والٹیر، 7 فروری سن 1778)

23 مئی سن 1778ء کے دن والٹیر نے یہ جہاں چھوڑا، لیکن پادریوں نے اس کو اب بھی معاف نہ کیا اور اس کی میت کو پیرس میں دفنانے کی اجازت نہ دی۔ مجبوراً اس کے دوستوں نے اس کی میت کو پیرس سے باہر دفن کیا۔ آگے چل کر انقلابِ فرانس کے بعد سن 1791ء میں والٹیر کی خاک کو بڑی شان و شوکت اور شاہی اعزاز کے ساتھ پیرس لایا گیا۔ اس کے تابوت پر لکھا ہوا تھا "وہ انسانی ذہن کا سب سے بڑا محرک تھا اس نے ہمیں آزادی حاصل کرنے کے قابل بنایا۔"

والٹیر کی قبر پر اس روز سے لے کر آج تک صرف ایک مختصر جملہ لکھا ہوا ہے: "یہاں والٹیر سویا ہوا ہے۔"

ایمانیوئل کانٹ

(1724ء تا 1804ء)

ایمانیول کانٹ سن 1724ء میں پروشیا کے ایک چھوٹے شہر کونگز برگ میں پیدا ہوا اور قریباً اپنی ساری ہی زندگی اسی پُرسکون شہر میں گزاری۔ کونگز برگ سے باہر جا کر دنیا دیکھنے، گھومنے، پھرنے، لوگوں سے ملنے وغیرہ جیسا اسے کبھی کوئی شوق ہوا اور نہ ہی کبھی اس نے کوشش کی لیکن اس چھوٹے سے شہر میں رہتے ہوئے کانٹ نے فلسفے کی دنیا میں ایک بڑا دھماکہ کیا، جس کی بازگشت ابھی تک سنائی دے رہی ہے۔ اس کی زندگی کے معمولات بالکل ایک مشین کی طرح تھے۔ مخصوص وقت پر ناشتہ کر کے گھر سے نکلتا ہے، یونی ورسٹی میں فلسفہ پڑھا کر واپس لوٹتا ہے۔ دوپہر کا کھانا کھا کر شام ساڑھے تین بجے گھر سے چہل قدمی کے لیے نکلتا اور پھر واپس گھر جاتا ہے۔ یہی اس کی زندگی تھی، نہ شادی، نہ بیوی، نہ بچے۔ گھر میں ایک خود، ایک ملازم اور باقی صرف کتابیں۔ وہ وقت کا اس قدر پابند تھا کہ جب وہ چہل قدمی کے لیے گھر سے نکلتا تو لوگ اپنی گھڑیاں درست کر لیتے تھے۔ وہ بنیادی طور پر ایک غریب، مسکین مگر قناعت پسند اور صابر و شاکر انسان تھا۔ اس کی زندگی نہایت پُرسکون گزر رہی تھی، لیکن اچانک اس کی زندگی میں زلزلہ آ گیا، جس نے اسے گہری نیند سے جگا دیا۔

یہ زلزلہ تھا ڈیوڈ ہیوم کا تجربیت پسند فلسفہ اور روسو کی کتاب ایمل۔ کانٹ بنیادی طور پر ایک مذہبی آدمی تھا، لیکن اس کا مذہب کسی روایتی طور طریقے سے بالاتر تھا۔ اس کے سامنے فلسفے کی دو

بڑی تحریکیں تھیں، جن کے حملے سے اسے اپنا دِین ایمان بچانا تھا۔ ان تحریکوں میں ایک عقلیت پسندی(Rationalism) تھی اور دوسری تجربیت پسندی(Empricism) تھی۔

کانٹ کا دور فرانسیسی روشن خیالی کا دَور بھی ہے، جب والٹیر کا قلم پورے یورپ میں تیز دھار تلوار کی طرح رواں تھا۔ والٹیر کے پاس عقلی استدلال کا انتہائی زوداثر ہتھیار تھا، جس کی مدد سے وہ مذہبی نظریات اور توہمات کو گاجر مولی کی طرح کاٹ رہا تھا۔ عقل پرستی کی اس تحریک میں کانٹ کے سامنے خدائی وجود کے منکر اور اس کے حامی تھے، جو دونوں عقلی استدلال کو استعمال کر رہے تھے۔ سینٹ تھامس، اکیناس وِدیگر نے عقلی استدلال کو استعمال کرتے ہوئے خدا کے وجود کو ثابت کرنے کی کوشش کی تھی تو دوسری طرف کئی لوگوں نے خدا کے وجود کا انکار کیا تھا۔ کانٹ کو عقل کی تلوار سے اپنے ایمان کو بچانا تھا۔ اس کے ایمان کو دوسرا خطرہ لاک اور ہیوم کی تجربیت پسندی سے تھا، جس کا مطلب مادہ پرستی تھا۔ تجربیت پسندی میں خدا، مذہب اور ایمان کا کوئی وجود نہیں تھا اور اس کے ساتھ تجربیت پسندی کا براہِ راست حملہ عقل پرستی پر تھا۔ کانٹ کو عقلیت کا دفاع بھی کرنا تھا لیکن اپنے انداز سے اور عقلیت کو کچھ زیادہ اور جامع معانی دینے تھے۔

روسو نے کانٹ پر ایسا اثر ڈالا کہ وہ اپنی زندگی کے روزمرہ کے معمولات بھی بھلا بیٹھا۔ کانٹ کے پڑوسیوں نے زندگی میں پہلی دفعہ دیکھا کہ وہ چہل قدمی کے لیے گھر سے نہیں نکلا ہے۔

کانٹ نے اپنی سوچ کو کتابی شکل دینے کے لیے پندرہ سال لگا دیئے لیکن جب سن 1781ء میں اس کی کتاب(Critique of pure reason) ''تنقیدِ عقلِ محض'' منظرِ عام پر آئی تو فلسفے کی دنیا میں بڑی ہلچل مچ گئی۔

تنقیدِ عقلِ محض

کتاب کے عنوان سے ظاہر ہوتا ہے کہ کانٹ نے عقل پر حملہ کر کے اس کے بخیے اُدھیڑ ڈالے ہوں گے، مگر ایسا نہیں ہے۔ یہاں تنقید کا مطلب عام تنقید نہیں ہے۔ کانٹ نے عقل کی چھان بین کر کے اسے ایک نیا مقام دیا۔ فرانسیسی روشن خیالی کے فلسفی اور ادیب خصوصاً والٹیر ودیگر عقل کے ہتھیار سے مذہب، خصوصاً عیسائی مذہب پر حملے کرتے رہتے تھے۔ ان کے پاس ہر نظریے اور ایمان کو پرکھنے کا ذریعہ عقل تھی۔

کانٹ نے اپنے ایمان پر حملہ کرنے والے ہتھیار کو کند کرنے کا سوچا۔ آخر یہ عقل مذہب اور ایمان کو برباد کرنے والی کون ہوتی ہے؟ کیا عقل کے فیصلے ہمیشہ درست ہوتے ہیں؟ عقل ایک معروضی حقیقت ہے یا یہ ہر انسان کے پاس اپنی ہوتی ہے؟ خالص عقل کیا ہے؟

کانٹ نے ہیوم اور روسو کو پڑھنے کے بعد عقل کی اصلیت، طریقہ کار اور حدود کو سمجھنے کے لیے کمر کس لی۔

کانٹ کے بقول اسے ہیوم نے گہری نیند سے جگا ڈالا، ہیوم کا فلسفہ یہ بتاتا ہے کہ ہر قسم کا علم تصورات (Ideas) پر مشتمل ہے، جو حواس کے ذریعے ذہن میں جمع شدہ تجربات کے عکس یا ان کی یادداشتیں ہیں۔ ذہن ایک کورا کاغذ ہے جس پر صرف تجربے کے ذریعے ہی لکھا جاسکتا ہے یا اس پر عکس چھوڑے جاسکتے ہیں۔ پیدائشی طور پر ذہن میں صرف جبلتیں ہیں۔ ذہن میں پیدائشی طور پر کسی بھی قسم کی کوئی بھی آگاہی یا علم بالکل نہیں ہے۔

لیکن کانٹ کا خیال کچھ اور تھا ''انھوں نے علم یا آگاہی کو دو حصوں میں تقسیم کیا:

۱۔ تجربی علم، جس کا دارومدار صرف حواس اور تجربے پر ہے۔

۲۔ ماورائی علم، جو کہ ہر قسم کے تجربے سے آزاد ہے (جو تجربے سے پہلے (Apriori) یا اس سے بالاتر ہے یہ آگاہی نہ تو تجربے سے حاصل ہوتی ہے اور نہ ہی اسے حواس یا تجربے کے ذریعے ثابت کیا جاسکتا ہے۔''[1]

کانٹ نے تجربیت پسندوں کی اس بات سے اتفاق کیا کہ ہر قسم کی آگاہی کی شروعات حواس اور تجربے کے ذریعے موصول ہونے والی یہ اطلاعات ہی آخر کار حتمی تصور یا آگاہی بنتی ہیں۔ کانٹ نے اس بات سے بھی اختلاف کیا کہ دماغ ایک کورا کاغذ ہے۔

آگاہی اور دماغ کے متعلق کانٹ کے نظریے کا اختصار کچھ یوں ہے:

حواس کے ذریعے دماغ کو اطلاعات ملتی ہیں یعنی اشیاء حالات اور واقعات کے عکس مسلسل دماغ کو ملتے رہتے ہیں لیکن یہ عکس جوں کے توں تصور کی شکل اختیار نہیں کرتے اور نہ ہی ذہن کوئی کورا کاغذ ہے کہ اس پر جوں کے توں نقش ہوتے جائیں۔ دراصل جب یہ عکس یا معلومات یا اطلاعات دماغ تک پہنچتی ہیں تو وہاں مخصوص سانچوں میں ڈھل جاتی ہیں۔ انسان کا ذہن پیدائشی طور

1-Rousseau and Revolution by:Will Durrant Page:537.

پر مختلف سانچے رکھتا ہے اور یہ سانچے ہر انسان کے اپنے ماحول اور زمان و مکان کے مطابق ہوتے ہیں۔ حواس کے ذریعے حاصل ہونے والے عکس یا تجربات مخصوص زمان اور مکان میں وقوع پذیر ہوتے ہیں۔ لہٰذا یہ ہمیشہ ایک جیسے معلوم نہیں ہوتے۔ دماغی سانچوں کی مثال بیکری کے ان سانچوں کی طرح ہے۔

جن میں جب بیکری کا کاریگر گندھا ہوا آٹا ڈال کر پکاتا ہے تو ان سے مختلف اقسام کے بسکٹ ملتے ہیں۔ آٹا اگرچہ وہی تھا لیکن سانچے مختلف ہونے کی وجہ سے بسکٹوں کی بناوٹ مختلف نکلی۔ اسی طرح جب دماغ حواس کے ذریعے عکس موصول کرتا ہے تو ان کو مخصوص بناوٹ میں ڈھال دیتا ہے جو اگر یادداشت میں جاتے ہیں تو پہلے تصور اور پھر آگاہی میں تبدیل ہو جاتے ہیں۔ یہ سانچے کون سے ہیں؟ کانٹ اپنی تصنیف میں ان سانچوں کو اس طرح ترتیب دیتا ہے۔

سانچوں کا چارٹ (Table of Categories)[1]

۱۔ مقدار کے بابت	۲۔ معیار کے بابت	۳۔ تعلق کے بابت	۴۔ ہیئت کے بابت
وحدت	حقیقت	ذاتی اور شخصی بقاء کے بابت	امکان۔ ناممکن
کثرت	نفی	علت اور دار و مدار کے بابت	موجودیت۔ غیر موجودیت
کلیت	محدودیت	گروہ کے بابت	ضرورت۔ احتمال

اُوپر دیئے گئے تمام مقولے، درجے یا ذہنی سانچے دماغی ساخت کا حصہ ہیں جو کہ تجربے سے ماورا (A priori) ہیں۔ اب جب کہ کوئی بھی عکس حواس کے ذریعے دماغ میں داخل ہوتا ہے تو وہاں موجود بالا سانچے اس کے استقبال کے لیے تیار ہوتے ہیں اور عکس کی مناسبت سے اسے کسی مخصوص سانچے میں ڈھال لیتے ہیں یہی وجہ ہے کہ اگر ایک ہی وقت میں ایک ہی واقعے کو دیکھنے والے مختلف لوگ، جب اس واقعے کو بیان کرتے ہیں تو ان کا نکتہ نظر ایک دوسرے سے مختلف ہوتا ہے۔ حالاں کہ حسی تجربہ سب کا وہی ہے۔

مثلاً آسمان پر کالی گھٹا دیکھ کر مختلف لوگوں کا ردِعمل اور احساس مختلف ہوتا ہے۔ صحرا کا آدمی گھٹا دیکھ کر خوش ہوتا ہے کہ شاید بارش ہو، سیلاب سے متاثر آدمی دُعا مانگے گا کہ بارش نہ ہو۔ ایک افریقی کالی گھٹا دیکھ کر اسے اپنے دیوتا کے قہر کی نشانی سمجھتا ہے۔ شاعر اسے محبوب کی زلفوں سے

1-Critique of Pure Reason by:Immanual Kant, Page:113.

تنبیہ دیتا ہے وغیرہ وغیرہ

گھٹا کے متعلق حسی تجربہ تو سب کا ایک ہی ہوتا ہے مگر اس کا ردِعمل سب کے ہاں مختلف ہے کیوں کہ ان سب کے دماغ کی ساخت ایک دوسرے سے مختلف ہے۔ اس کے علاوہ ان کے تجربے مخصوص زمان و مکان میں ہونے کی وجہ سے حالات کو ہمیشہ مختلف زاویوں سے دیکھتے ہیں۔ کہنا یہ چاہیے کہ ہر انسان پیدائشی طور پر کوئی مخصوص عینک پہنے چلا آ رہا ہے، جس کی وجہ سے اشیاء مخصوص رنگ میں دکھائی دیتی ہیں۔

ایسا کرنے سے ''کانٹ نے فلسفے کی سب سے بڑی خدمت یہ کی کہ اس نے اشیاء بذاتِ خود (Thing-in-itself) اور 'اشیاء جیسی ہمیں نظر آتی ہیں' (Appearance) میں فرق کو واضح کیا ہے۔ اشیاء بذاتِ خود کیا ہیں، ان کے بابت حتمی علم ہمیں کبھی بھی حاصل نہیں ہو سکتا۔ ہم صرف یہ جان سکتے ہیں کہ اشیاء ہمیں کس طرح دکھائی دیتی ہیں۔''(۱)

کانٹ نے ''حقیقت اور مظہر'' (Appearance and Reality) میں واضح فرق کر کے یہ بتایا ہے کہ ہم صرف اشیاء کے ظاہر (Phenomenon) کو تو سمجھ سکتے ہیں لیکن ان کی حقیقت یا اصلیت (Noumenon) تک نہیں پہنچ سکتے۔ بالفاظِ دیگر گویا کانٹ یہ کہتا ہے کہ حقیقت یا سچائی معروضی نہیں ہے بلکہ یہ موضوعی ہونے کی وجہ سے ہر کسی کے پاس اپنی ہے۔

سائنس صرف اشیاء کے ظاہر اور ان کی خاصیتوں یا خارجی دنیا (Phenonmenon) کو سمجھ سکتی ہے۔ یہ کبھی بھی ان اشیاء کی اصلیت تک نہیں پہنچ سکتی ہے کیوں کہ یہ اصلیت انسانی تجربات سے ماورا ہے اور سائنس تو ہے ہی تجربے کا علم۔

اسی طرح روح بھی حقیقی ہے لیکن یہ ظاہری خصوصیات نہ رکھنے کی وجہ سے تجربے سے ماورا ہے۔ اس طرح سے روح، آزاد ارادہ (Free Will) اور خدا تجربے سے ماورا ہونے کی وجہ سے عقلی استدلال سے ثابت نہیں ہو سکتے۔ اس کا ثبوت یہ ہے کہ جس نے بھی خدا اور روح کو عقل کے ذریعے ثابت یا رد کرنے کی کوشش کی ہے وہ ''تضادات'' کا شکار ہوا ہے۔

کانٹ نے اپنی کتاب میں کئی دلائل اور ان کے ردِ دلیل دینے کے بعد یہ ثابت کیا ہے کہ خدا کے بارے میں ہر قسم کے مثبت و منفی دلائل موجود ہیں اور یہ دلائل خود 'اپنے آپ میں بھی تضاد'

(۱)۔ سوفی کی دنیا۔ صفحہ نمبر 458۔

(Parodox) رکھتے ہیں۔

لہٰذا بہتر یہی ہے کہ خدا کے وجود کو عقل اور سائنس کے ذریعے ثابت کرنے کے بجائے اس پر ایمان لایا جائے (اور آخر کار کانٹ نے مذہب کو بچا لیا؟)

تنقید عقل محض میں کانٹ نے تجربیت پسندی اور عقلیت پسندی کو جزوی طور پر صحیح قرار دیتے ہوئے آگاہی یا علم میں ان دونوں کا حصہ بتایا ہے۔ یعنی تجربے کے بغیر محض عقل کے پاس کوئی عملی آگاہی نہیں ہے اور نہ ہی عقل کے بغیر تجربے کی کوئی اہمیت ہے۔

تنقیدِ عقلِ عملی (Critique of Practical Reason)

کانٹ نے خالص عقل پر تنقید کر کے مذہب اور ایمان کو تو بچا لیا مگر نیکی اور اخلاقیات کی ضرورت کا سامنا کرنے کے لیے "تنقیدِ عقلِ عملی" لکھی۔

نیکی کیا ہے؟ اور اخلاقی طرزِ عمل کا ماخذ کیا ہے؟ ہیوم کے مطابق تو ہم جو ہمدردی دکھاتے ہیں اور نیکی کرتے ہیں۔ یہ عقل نہیں بلکہ جذبے (Emotion) کے طابع ہے۔ یعنی اخلاقیات کا ماخذ "عقل" نہیں بلکہ "جذبہ" ہے۔ کانٹ ڈیوڈ ہیوم سے متفق نہ ہوا اور عقلیت پسندوں کی بات کو آگے بڑھایا، کیوں کہ (اس کے خیال میں) نیکی کسی ہمدردی کے جذبے کا نتیجہ نہیں ہے بلکہ اس کا فیصلہ عقل کرتی ہے کہ صحیح کیا ہے اور غلط کیا ہے۔ یہ عقل انسان کے اندر پیدائشی (Innate) ہے۔

کانٹ نے اس پیدائشی عنصر کو ضمیر کا نام دیا ہے جو اپنا فیصلہ چیزوں کے صحیح یا غلط ہونے کی بنیاد پر دیتا ہے، جب ہم کوئی بھی عمل کرنے کا سوچتے ہیں تو ضمیر ہمیں یہ عمل کرنے کے لیے حوصلہ افزائی یا حوصلہ شکنی کرتا ہے۔ ضمیر کے فیصلے اٹل ہوتے ہیں اور ان کی بنیاد پہلے سے طے شدہ نیکی اور بدی کے اصولوں پر ہوتی ہے۔ ضمیر کے فیصلے کسی مقصد یا مزے یا خوشی کے لیے نہیں ہوتے ہیں۔ صحیح کام یا نیکی اس لیے نہ کی جائے کہ یہ فائدہ مند ہے بلکہ نیکی اس لیے کی جائے کہ یہ نیکی ہے، یعنی نیکی برائے نیکی۔ ضمیر کا حکم حتمی یا حکمِ مطلق ہے، جس کے سامنے کوئی حیلہ یا بہانہ نہیں چل سکتا۔

ضمیر کے اسی حکمِ مطلق کو سمجھانے کے لیے کانٹ جو اہم باتیں یا طریقے سمجھاتا ہے۔

"(ا)۔ صرف اس کلیے (جامع اصول) کے مطابق عمل کریں کہ جو کچھ آپ کرتے ہیں، یہ ایک آفاقی اور عالمی قانون بن جائے اور

(۲)۔ ہمیشہ اس طریقے سے عمل کریں کہ آپ انسان ذات کو، خواہ آپ خود ہی کیوں نہ ہوں، کسی مقصد کے حصول کا ذریعہ (Means) سمجھنے کے بجائے خود اس کو مقصد سمجھیں۔"[۱]

کانٹ کی اخلاقیات "واجباتی اخلاقیات" (Deontological Ethics) ہے، جس کے مطابق اخلاقی قانون یا نیکی پر ہر حال میں عمل کرنا "واجب" یا فرض ہے، خواہ بعد میں اس سے فائدہ ہو یا نقصان، آسمان گرتا ہے تو گرنے دیں مگر آپ ضمیر کے فیصلے کو لبیک ضرور کہیں۔ کانٹ نے اپنی زندگی کو ایک مختصر جملے میں سمجھاتے ہوئے کہا تھا۔

"میرے اوپر تاروں بھرا آسمان اور میرے اندر اخلاقی قانون"[۲]

کانٹ اخلاقیات کو علت و معلول نہیں سمجھتا۔ یعنی ہمارے اعمال کسی مادی جبریت (Determinsim) کا نتیجہ نہیں ہیں بلکہ یہ ہماری آزاد رائے (Free Will) کا نتیجہ ہیں۔ ہم اپنے اعمال کے لیے علت و معلول کی زنجیروں میں جکڑے مجبورِ محض نہیں ہیں بلکہ اپنی آزاد رائے رکھنے والے اور اس کے تحت اخلاقی عمل میں خود مختار ہیں۔ ہم اپنی خود مختاری کو بروئے کار لا کر وقتی طور پر حواس کی مرضی (خواہشات کی غلامی) پر چل کر کوئی مزایا مفاد حاصل کرنے کے لیے اخلاقیات کے برعکس کام یا بدی کرتے ہیں، مگر اس وقت فوراً ضمیر ہمیں ملامت کرتا ہے اور ہم سمجھ جاتے ہیں کہ ہم نے کوئی نیکی کا کام نہیں کیا ہے۔

اس طرح کانٹ ارادے (Will) کو عقل و دانش (Intellect) پر ترجیح دیتا ہے کیوں کہ ارادہ آزاد ہے۔ وہ عقل کے ماتحت نہیں بلکہ عقل ارادے کے ماتحت اور اس کے اشارے کی غلام ہے کیوں کہ "آزاد ارادے کے بغیر شخصیت بے معانی ہے تو زندگی بھی بے معانی ہے اور جب زندگی بے معانی ہے تو پھر ساری کائنات بے معانی ہے۔"[۳]

کانٹ ارادے کی آزادی کے ذریعے انسان کی شخصیت، زندگی اور پوری کائنات کو معانی بخشتا ہے، انسان اگر ایک آفاقی مشین کا پُرزہ ہو تو پھر اس پر کوئی اخلاقی ذمہ داری بھی عائد نہیں ہوتی اور نہ ہی وہ اپنے اعمال کا ذمہ دار ہے۔ نہ صرف یہ بلکہ "کانٹ نے عام طریقہ کار کو اُلٹ ڈالا یعنی اخلاقیات کو خدا کے وجود سے اخذ کرنے کے بجائے (جیسے مذہبی لوگ کرتے ہیں) اس نے خدا کے

1-Rousseau and Revolution, Page:451.
2-Rousseau and Revoluttion, Page:451.
3-Rousseau and Revoluttion, Page:541.

وجود کو اخلاقیات کے ذریعے ثابت کیا۔ ہم اپنے فرائض اس لیے نہ ادا کریں کہ یہ کسی خارجی ارادے کا احکام ہیں بلکہ اس لیے کہ یہ فرائض خود ہمارے اپنے آزاد ارادے کا فیصلہ ہیں۔''(۱)

کانٹ کی ماورائی جمالیات

کانٹ نے سن 1790ء میں تنقید فیصلہ (Critique of Judgement) نامی مقالہ لکھ کر جمالیات کو بھی اپنے رنگ میں رنگ لیا۔ ہم اشیاء کی خوب صورتی اور بدصورتی کے متعلق اپنی آراء کن بنیادوں پر دیتے ہیں؟ خوب صورتی اشیاء میں ہے یا دیکھنے والے کی آنکھ میں؟ یہ معروضی ہے یا موضوعی۔

کانٹ نے یہ خیال ظاہر کیا کہ یہاں موضوعی عنصر زیادہ غالب ہے۔ کوئی شے بذاتِ خود خوب صورت ہے نہ بدصورت، بلکہ یہ ہماری سوچیں یا محسوسات ہی ہیں جو ان کو خوب صورت یا بدصورت قرار دیتے ہیں۔ دوسرے لفظوں میں کانٹ کے نزدیک خوب صورتی یا بدصورتی ذاتی پسند اور ناپسند پر مشتمل ہے، جس کی بنیاد کسی عقل، علم یا نظریے کے بجائے صرف ''جذبے'' پر ہے۔

ذاتی پسند کیا ہے؟ ذاتی پسند وہ قوتِ فیصلہ ہے جو کسی شے کو مکمل طور پر بے غرض (Dis-interested) بنیاد پر پرکھے، اس سے حظ رمزا حاصل کرتی ہے۔ ہر وہ شے جس سے بے غرض مزالیا جاسکے، وہ خوب صورت ہے۔(۲)

کانٹ کے نزدیک ہر وہ شے خوب صورت ہے جس میں دیکھنے والے کی کوئی غرض پوشیدہ نہ ہو۔ اس سلسلے میں کانٹ خود غروب ہوتے ہوئے سورج کا منظر، موسیقی اور پھولوں وغیرہ کی مثال دیتا ہے، جن میں دیکھنے والے کی کوئی غرض پوشیدہ نہیں ہے مگر پھر بھی اسے ان چیزوں سے مزا ملتا ہے۔ لہٰذا یہ خوب صورت ہیں۔ بالالفاظ دیگر خوب صورتی اور حسن کا لازمی نتیجہ خوشی اور مزا ہے۔

یہاں سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ آخر وہ کون سی بنیادیں ہیں جن پر خوب صورتی و بدصورتی کا دارومدار ہے؟ وہ کون سی بنیادیں ہیں جن پر ایک سے زیادہ دیکھنے والے متفق ہو کر کسی شے کو خوب صورت کہہ سکیں؟

کانٹ ایسی کوئی بھی واضح بنیاد نہیں بتاتا کیوں کہ اس کے خیال میں حسن دماغ کا نہیں

1-Rousseau and Revoluttion, Page:5421.
2-Fourn the French Enlightenment to Kant, Page:357.

بلکہ دل کا معاملہ ہے، اسے صرف محسوس کیا جا سکتا ہے، اس سے مزا لیا جا سکتا ہے، مگر اسے منطقی بنیادوں پر ثابت نہیں کیا جا سکتا۔

کانٹ کی جمالیات اور خوب صورتی کا دوسرا اہم پہلو جاہ وجلال (Sublimity) ہے۔ انسان کو سمندر، آسمان، تیز بہتا دریا، برفانی پہاڑوں کی چوٹیاں وغیرہ کیوں خوب صورت لگتی ہیں؟ اس لیے کہ انسان ایک تو ان کی مخفی طاقت سے متاثر ہے، دوسرا ان کو دیکھ کر انسان حیرت میں پڑ جاتا ہے۔ جاہ وجلال، متحیر کرنے والی شے، رُعب و دبدبہ پیدا کرنے والی ڈراونی اشیا بھی انسان کو خوف کے ساتھ ساتھ خوشی اور مزا مہیا کرتی ہیں۔ شرط یہی ہے کہ انسان ان سے کوئی خطرہ محسوس نہ کرے۔

مذہب اور عقل

سن 1793ء میں قریباً 69 سال کی عمر میں کانٹ نے مذہب اور عقل کے متعلق کافی مقالے لکھے، جن میں اس بات پر زور دیا گیا کہ اخلاقیات کو کسی بھی مذہب کی ضرورت نہیں ہے۔ کیوں کہ انسان میں نیکی کے جذبات بھی قدرتی ہیں۔ صرف ان کو منظم کرنے کی ضرورت ہے۔ کانٹ نے بہترین مذہب وہ قرار دیا ہے جس میں ''فرض کی ادائیگی'' کو قانونِ الٰہی سمجھا جائے اور اس پر سختی سے عمل کیا جائے۔

کانٹ بھی ہیوم کی طرح معجزوں کو بالکل نہیں مانتا ہے اور وہ ''دُعا مانگنے'' کو توہم پرستی کہتا ہے۔ اس کے خیال میں دُعا مانگنے اور معجزوں پر یقین رکھنے کا مطلب یہ ہے کہ خدا، انسان کے لیے اپنے آفاقی اور اٹل قوانین میں ترمیم کرتا ہے۔

وِل ڈیورنٹ، کانٹ کے مذہبی فلسفے کا حوالہ دیتے ہوئے لکھتا ہے ''اگر کلیسا (اور دیگر مذہبی ادارے) مذہب کے ٹھیکے دار بن جائیں اور یہ زبردستی عقیدے رمذہب کو نافذ کریں اور یہ صرف اپنے آپ کو ہی مذہبی کتابوں کے مفسر سمجھیں اور خود ہی اخلاقی قوانین کی تشریح کریں اور وہ یہ دعویٰ کریں کہ خدا تک رسائی صرف ان کے توسط سے ہی ممکن ہے اور وہ عبادت کو معجزوں اور کرامتوں کا ذریعہ سمجھیں اور وہ حکومت اور استحصالی قوتوں کے معاون بن کر اقتدار پر قابض ہونے کی کوشش کریں اور سیکولر لوگوں کو اپنے مفاد کے لیے استعمال کریں، تب آزاد اذہان ان مذہبی اداروں کے خلاف اُٹھ کھڑے ہوں گے، اور ان اداروں سے باہر ''خالص عقلی مذہب'' کی تلاش کریں گے۔ صرف یہی اخلاقی زندگی کی جستجو ہے۔

دائمی امن

کانٹ نے اپنی زندگی کے آخری سالوں میں ایک ایسا نظریہ دیا جو موجودہ اقوامِ متحدہ سے ملتا جلتا ہے۔ اس نے ایسے ادارے کے قیام پر اس لیے زور دیا کہ ریاستوں کے درمیان ہونے والے لڑائی جھگڑوں کا کوئی قانونی تصفیہ کیا جا سکے اور جنگ کے امکانات کو روکا جا سکے۔ کانٹ نے کہا کہ ریاستوں کے درمیان جمہوری تعلقات ہونے چاہئیں، جن سے جنگ کو کافی حد تک روکا جا سکتا ہے کیوں کہ غیر جمہوری حکومتیں جن میں بادشاہت اور مطلق العنانیت شامل ہیں۔ ہر وقت جنگ کے لیے آمادہ رہتی ہیں۔

کانٹ اب بوڑھا ہو چکا تھا۔ اس کے جسمانی اعضاء رفتہ رفتہ کمزور پڑنے لگے، مگر اس کا دل جوان تھا۔ اس نے نہ ساری زندگی شادی کی اور نہ ہی کسی عورت کو اپنے قریب آنے دیا۔ وہ کبھی کبھار گھر میں اپنے شاگردوں کی دعوت کیا کرتا مگر ان میں بھی کسی عورت کو مدعو نہ کرتا۔

خدا کے وجود پر کامل ایمان رکھنے والا کانٹ عبادت سے قریباً لاتعلق ہی تھا۔ وہ گرجا گھر میں بھی تب ہی جاتا جب اس کی یونی ورسٹی گرجا گھر میں کسی تقریب کا اہتمام کرتی۔ وہ اپنے آپ میں مگن، سوائے چہل قدمی کے گھومنے پھرنے سے بے نیاز تھا۔ کسی شہر کا تو ذکر ہی کیا، اس نے ساری زندگی کوئی پہاڑ یا سمندر تک نہیں دیکھا۔

آخر یہ نیک دل اور فرض شناس بوڑھا فلسفی 12 فروری سن 1804ء کو اس دنیا سے چپ چاپ کوچ کر گیا۔ اس کے انتقال کے بعد بھی اس کی کافی تحریریں Opus Postumun کے عنوان سے سن 1882ء میں شائع کی گئیں۔

کانٹ کے فلسفے نے اپنے گہرے اثرات چھوڑے اور اس سے متاثر ہونے والوں کی تعداد اچھی خاصی ہے جن میں سرفہرست فشٹی (Fishte)، شوپنہار، شیلنگ، ہیگل، الرج، کارلائل، ایمرسن اور تھوریو وغیرہ شامل ہیں۔

رومانیت

رومانیت کسی مکتبۂ فکر کا کوئی باقاعدہ فلسفہ تو نہیں ہے مگر یہ بڑی حدتک روسو اور کانٹ کے فلسفے کی پیداوار ہے۔ رومانوی تحریک نے نہ صرف یورپ، بلکہ ساری دنیا کے ادب، فن، موسیقی، مصوری، ڈرامہ نویسی اور شاعری وغیرہ پر گہرے اثرات مرتب کیے ہیں۔ یہ تحریک پہلے جرمنی سے شروع ہوئی اور دیکھتے ہی دیکھتے پوری دنیا میں پھیل گئی۔

روسو نے نعرہ دیا کہ ''فطرت کی طرف واپس چلو'' یعنی صنعتی ترقی اور شہروں سے نکل کر گاؤں، قصبے، بستیاں اور جنگل بسائیں۔ باالفاظِ دیگر ترقی جو سائنس کی پیداوار ہے، اس سے دُور بھاگیں۔ روسو بنیادی طور پر فرانس کے عقل پرست اور روشن خیال فلسفیوں کے سخت خلاف تھا اور اس نے ہمیشہ عقل پر احساس کو ترجیح دی۔

کانٹ نے جب خالص عقل اور عملی عقل پر تنقید لکھی تو اس نے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی کہ عقل کی مدد سے نہ تو خدا اور روح کو ثابت کیا جاسکتا ہے اور نہ ہی جمالیات میں عقل کا کوئی مقام ہے۔ یہ دل کے معاملے ہیں۔ کوئی شے حسین ہے یا قبیح، اس کا فیصلہ عقل کے بجائے دل کو کرنے دیں۔

کانٹ کے فلسفے کو شیلنگ (سن 1775ء تا 1854ء) نے آگے بڑھایا اور اس نے فطرت میں روحِ عالم کو دیکھا، جو کہ فطرت کے ساتھ ساتھ انسان کے ذہن اور جسم میں بھی جاری و ساری ہے۔

رومانیت یورپ کے قریباً ہر نوجوان کی زندگی کا طرزِ عمل بن گئی۔ عقل کی مخالفت نے رومانوی نوجوانوں کو جہاں کیف وسرور سے مدہوش کیا وہیں ان کو زندگی اور معاشرے سے بھی دُور کر ڈالا۔ فطرت کی محبت میں وہ زندگی کے تلخ تجربات اور حقائق سے منہ موڑنے لگے۔

خوابوں کو حقیقی زندگی پر ترجیح ملنے لگی۔ حال کی حقیقتوں سے فرار ہوکر، ماضی پرستی کے مزے لوٹے جانے لگے۔ احساس اور جذبات سب کچھ ہو گئے اور علم وفہم کچھ بھی نہ رہے۔ شہری زندگی سے نفرت اور دیہاتوں، پہاڑوں، دریاؤں اور گھنے جنگلات سے محبت عام ہوگئی۔

ہر قسم کی روایت، قانون اور رسم ورواج کے خلاف بغاوت کا علم بلند ہونے لگا۔ روایتی لباس، روایتی طور طریقے، فن کی روایتی بندشیں نفرت کی نگاہ سے دیکھی جانے لگیں۔ اخلاقی اصولوں سے بغاوت، امن وسکون سے بغاوت، معاشرے کی سیاسی سماجی اور ثقافتی پابندیون سے بغاوت، جوش وجذبے، ولولے اور پُر خطر زندگی سے محبت، انفرادی زندگی سے محبت، اجتماعی زندگی سے نفرت، قوم پرستی عروج پر، انقلاب زندہ آباد، اشیاء کی افادیت کے بجائے ان کے حُسن کی اہمیت، حسین چیز خواہ نقصان دہ ہی ہو مگر اس کے لیے دیوانگی، طوفانی ہوائیں، بادلوں کی گھن گرج، برق رفتار پہاڑی ندیاں، طوفانی بارشیں، سمندر کی دہشت وغیرہ وغیرہ یہ سب باتیں رومانوی دَور کی محبوب باتیں تھیں۔ ادب، شاعری، موسیقی اور مصوری میں ہر جگہ ان کے چرچے عام ہوگئے۔

تحیر رومانوی دَور کی دوسری خاص خوبی ہے۔ جنوں، پریوں، دیووں کے قصے اور کارنامے، لوک گیت اور دُھنیں، جادو اور ٹونہ، قدیم عمارتیں اور کوٹ قلعے رومانیت پسندوں کے لیے خاص کشش کے باعث تھے۔ غیر اہم اور فضول، تباہ کُن اور پُر تشدد اشیاء میں حُسن کی تلاش رومانیت پسندوں کا دل پسند مشغلہ تھا۔ برٹرینڈ رسل تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں ''رومانیت پسند شدید جذباتیت کے قائل ہوتے ہیں۔ خواہ ان کا نتیجہ کچھ بھی نکلے۔ رومانوی محبت، خاص طور پر جب یہ ناکام ہوجائے، رومانیت پسندوں کو بہت پسند آتی ہے۔ شدید جذبات اکثر تباہ کُن ہوتے ہیں۔ نفرت، حسد اور جلن، غم واندوہ، فخر اور بڑائی، فوجی قسم کی بہادری، غلامانہ اور بزدلانہ سوچ سے نفرت، وہ جذبات ہیں جن کی شدت انسان کو پُرسکون کے بجائے تشدد پسند بنا ڈالتے ہیں۔ (روسو کا) رومانیت پسند آخر کار ایک بدنظم باغی یا جابر فاتح بن جاتا ہے۔''[1]

1-History of Western Philosophy, By:Bertrand Russel, Page:656.

رومانیت پسندوں نے فن اور فلسفے کے بجائے تصوف اور معرفت کو اوّلیت دی۔ ان کے نزدیک تحقیق و دانش کے بجائے تخیل اہم تھا۔ لہٰذا رومانوی شاعر اور فن کار اپنی تخلیقات کے ذریعے خدا سے ملاقاتیں کرنے لگے۔ بلکہ اکثر کو تو یہ غلط فہمی بھی ہوگئی کہ وہ خود خدا ہیں۔

کالرج، ورڈزورتھ، شیلے، ساوتھے، بائرن اور کیٹس وغیرہ رومانیت پسندی کے بڑے شاعر تھے، جنھوں نے فطرت کی زبردست منظر کشی اور تعریف و توصیف کی۔ جیسا کہ رومانیت حقیقت سے فرار کا ایک مزیدار راستہ تھا۔ لہٰذا ہر کوئی اس راستے پر چلنے لگا۔ سورج کی تیز تپش میں کام کرنے کے بجائے رات کو چاند کی ٹھنڈی چاندنی میں محبوب کی تعریف کرنا آسان تھا اور پُر لطف بھی۔ بیلوں کا جوڑا پال کران سے ہل چلانا اور کھیتی باڑی کرنا ایک دُشوار کام تھا، مگر ندی کے کنارے، درختوں کی گھنی چھاؤں میں بیٹھ کر ہرنیوں، موروں اور تیتروں کو دیکھنا، انتہائی مزیدار تھا۔

نتیجہ یہ نکلا کہ یہ تحریک ناکام ہوگئی۔ رومانیت پسندی کا تعلق نوجوانی سے ہے۔ یہ زیادہ سے زیادہ 30 سال کی عمر تک حاوی رہتی ہے اور پھر ختم ہو جاتی ہے۔ کل کے یہ رومانیت پسند آج کے پکے مذہبی انسان اور بال بچے دار ہو کر بیٹھ رہے۔ فطرت کے جمال کے بجائے پیٹ کی بھوک مٹانے کے لیے ہاتھ پاؤں مارنے لگے۔ حقائق سے دُوری انسان کو انسانیت سے دُور ہونے پر مجبور کر دیتی ہے جو رومانیت کے خواب سے نکل کر حقیقت کی دنیا کی طرف لوٹ آئے وہ بچ گئے اور جو نہ پلٹے وہ یا تو پاگل ہو گئے یا خودکشی کر لی یا غیر منظم باغی بن گئے۔

روسو کے پرستاران غیر منظم باغیوں نے خود کو یا دوسروں کو تباہ و برباد کر ڈالا یا فاتح بن کر ظالم حکمران بن گئے۔ روسو کے مداح ایسپیری نے جب فرینچ انقلاب کو حقیقت میں تبدیل کیا تو اس نے پہلا وار اپنے ساتھیوں پر کیا اور ان کے سَر قلم کروا ڈالے۔ خود بادشاہ سے بھی بدترین حکمران بن کر بیٹھ گیا۔

آج بھی رومانوی شاعری اور ادب تخلیق ہو رہا ہے مگر یہ زیادہ تر تیسری دنیا کے ملکوں میں ہے، جہاں لوگوں میں تلخ حقائق کا سامنا کرنے کا حوصلہ نہیں ہے۔ رومانوی ادب کو آج بھی فراریت کے لیے ایک کارگر گولی (Tablet) کے طور پر استعمال کیا جا رہا ہے، جس کا مقصد محض لمحاتی خوشی ہے۔

ہیگل

(1770ءتا1831ء)

جارج ولیم فریڈرک ہیگل (Hegel) 27راگست سن 1770ء کو جرمنی کے شہر اسٹٹ گارٹ میں پیدا ہوا، جیسا کہ اس کا گھرانہ پروٹسٹنٹ عیسائی تھا۔ اس لیے اسے بچپن سے ہی مذہبی تعلیم دی گئی۔ اس کے ساتھ ساتھ ہیگل کو یونانی اور رومی علوم اور فلسفہ بھی پڑھایا گیا۔ اس کا والد ایک ریونیو آفیسر تھا، جس کی خواہش تھی کہ ہیگل پادری بنے۔ لہٰذا اسے سن 1780ء میں اعلیٰ مذہبی تعلیم حاصل کرنے کے لیے ٹوبجن یونی ورسٹی بھیجا گیا، جہاں ہیگل کی شیلنگ سے دوستی ہوگئی۔

مذہبی تعلیم مکمل کرنے کے بعد ہیگل نے اپنے والد کا کہا بالکل نہ مانا اور پادری بننے سے انکار کردیا۔ گزر بسر کے لیے وہ ٹیوشن پڑھانے لگا۔ قریباً دوسال بعد سن 1799ء میں ہیگل کے والد کا انتقال ہوگیا جو ہیگل کے لیے ترکے میں کچھ رقم بھی چھوڑ گیا۔ رقم ملتے ہی ہیگل نے ٹیوشن پڑھانا بند کردی اور شیلنگ کو خط لکھا کہ مجھے کوئی ایسا شہر بتاؤ جس کا ماحول پُرسکون ہو اور وہاں ایک اچھی لائبریری ہو، جہاں میں پڑھ لکھ سکوں۔

شیلنگ نے ہیگل کے لیے ''جینا'' نامی شہر تجویز کیا، جہاں ''جینا یونی ورسٹی'' میں شیلنگ خود فلسفے کا استاد تھا۔

جینا شہر میں ہیگل نے پڑھنے لکھنے اور پڑھانے کی شروعات کی۔ اسے بھی جینا یونی ورسٹی

میں فلسفے کا استاد مقرر کیا گیا۔ اس شہر کے پُر سکون ماحول میں ہیگل نے فلسفے پر اپنی اہم ترین کتاب "The Phenomenology of mind/spirit" لکھی، جو فلسفے اور ادب کی ایک انتہائی مشکل اور اہم کتاب سمجھی جاتی ہے۔

سن 1806ء میں جینا شہر، فرانسیسی جنرل اور حملہ آور نپولین کے قبضے میں آ گیا، جہاں سے ہیگل کو مجبوراً راہ فرار اختیار کرنا پڑی۔

ہیگل کے پاس اپنے والد کی طرف سے چھوڑی گئی رقم بھی ختم ہو چکی تھی۔ لہٰذا اس نے گزر بسر کے لیے صحافت کا پیشہ اختیار کیا اور اخبار ''زیتونگ'' کا ایڈیٹر بنا لیکن اسے اخباری دنیا پسند نہ آئی اور وہ نورمبرگ شہر جا کر ایک اسکول میں ہیڈ ماسٹر بن گیا، جہاں وہ تقریباً آٹھ سال مقیم رہا۔

ہیگل نے نورمبرگ میں قیام کے دوران شادی بھی کی جس سے اس کی اولاد بھی ہوئی۔

سن 1812ء سے سن 1816ء تک ہیگل نے Science of Logic کے عنوان سے کئی مضامین لکھ کر شائع کرائے۔

سن 1816ء میں ہیگل، ہائڈل برگ یونی ورسٹی میں پروفیسر مقرر ہوا، جہاں اس نے اپنے فلسفے کو یکجا کر کے "Encyclopaedia of the Philosophical Sciences our Lives" کے عنوان سے چھپوایا۔

سن 1818ء سے اپنی زندگی کے آخری حصے تک وہ برلن یونی ورسٹی میں فلسفہ پڑھاتا رہا، جہاں اس نے مندرجہ ذیل کتابیں اور مضمون لکھے:

1-"The Philosophy of right."

2-"The Philosophy of Fine art."

3-"Lectures on Philosophy of History."

4-"Lectures on Philosophy of Religion."

ہیگل اپنی زندگی میں روسو، کانٹ، اسپائنوزا، فشتی اور شیلنگ سے متاثر رہا۔ ان سے وہ متفق تھا اور اختلاف بھی رکھتا تھا لیکن وہ سب سے زیادہ متاثر کانٹ کے فلسفے سے ہوا، جس کا اثر ہیگل کے فلسفے میں ہر جگہ نمایاں ہے۔ کہنے والے تو یہاں تک کہتے ہیں کہ ''اگر کانٹ نہ ہوتا تو ہیگل بھی نہ ہوتا۔''

ہیگل کی جدلیات

ہیگل کے فلسفے کی عمارت اس کے جدلیاتی (Dialectic) فلسفے پر کھڑی ہے۔ جدلیات نہ صرف تاریخ کا فلسفہ ہے بلکہ یہ ایک مابعد الطبیعات کا نظام بھی ہے۔

جدلیات حقیقت کو پہچاننے اور سچ تک پہنچنے کا ایک طریقہ کار ہے، یہ سچ یا حقیقت خواہ زندگی کے کسی نظریے کے متعلق ہو یا وہ حقیقتِ کبریٰ کے متعلق ان کو جدلیات کے ذریعے ہی سمجھا جا سکتا ہے۔

ہیگل کے نزدیک کوئی بھی سچ مکمل سچ نہیں ہے اور اس سچ میں ہی اس کا تضاد سمایا ہوا ہے، دوسرے لفظوں میں ہر اثبات کی نفی موجود ہے۔ یہ نفی کبھی اس اثبات کے اندر تو کبھی اس کے باہر ہے۔ ہر نظریہ، ہر سوچ، ہر فکر کسی نہ کسی نظریے کا ہی نتیجہ ہے اور اکثر پہلے کا رد ہی ہے۔ یہ نظریہ نہ صرف گزشتہ نظریات کو رد کرتا ہے۔ بلکہ خود بھی کسی دوسرے نظریے کے ٹکراؤ میں آ جاتا ہے۔

یوں دعوے (Thesis) اور تضاد (Anti-Thesis) کا آپس میں ٹکراؤ ہو جاتا ہے۔ یعنی اثبات کی نفی ہوتی ہے۔ اس ٹکراؤ کے نتیجے میں دونوں نظریوں کے بہترین نکات آپس میں مل کر ترکیب (Synthesis) پیدا کرتے ہیں اور نیا نظریہ قائم ہوتا ہے۔ یہ ترکیب اکثر نفی کی نفی ہوتی ہے مگر مکمل طور پر نہ تو اثبات رد ہوتا ہے اور نہ ہی نفی۔ یہ نئی ترکیب (Synthesis) کچھ وقت کے بعد خود دعویٰ بن جاتی ہے اور پھر اس کا تضاد جنم لیتا ہے۔ یوں یہ سلسلہ جاری رہتا ہے۔ ہر دفعہ جب یہ چکر پورا ہوتا ہے تو ہر نئی ترکیب پرانی ترکیب سے زیادہ بہتر اور زیادہ سچائی اور حقیقت پر مبنی ہوتی ہے۔ یہ چکر مسلسل جاری رہتا ہے اور آخر کار مکمل طور پر سچائی تک رسائی حاصل کر لیتا ہے۔ مکمل یا خالص حقیقت کی زیادہ نفی نہیں ہوتی اور وہ مکمل سچ یا حقیقت ''حقیقتِ مطلق'' (Absolute Reality) بن جاتی ہے۔

ہیگل اپنے جدلیاتی معاملے کو زندگی کے ہر شعبے میں دیکھتا ہے۔ یہ جدلیاتی چکر سیاست، معیشت اور معاشرے کے علاوہ فطرت میں بھی جاری و ساری ہے اور دو مخالف قوتیں ہر وقت برسرِ پیکار رہتی ہیں۔

منطق کی سائنس (Science of Logic)

ہیگل نے اپنی اس کتاب میں تحریری موشگافیاں بالکل نہیں کی ہیں اور یہاں منطق (Logic)

سے اس کی مراد Logos ہے جس کے معانی آگاہی یا علم کے ہیں۔ ہیگل نے منطق کی سائنس میں اپنا جدلیاتی طریقۂ کار استعمال کرتے ہوئے حقیقتِ کبریٰ یا خیالِ مطلق کو سمجھنے کے لیے تفصیلی بحث کی ہے جس کا اختصار ذیل میں دیا جاتا ہے۔

وجود کیا ہے؟ (Being) چھوٹے سے چھوٹا لفظ اگر وجود کے لیے استعمال کیا جائے تو یہ ''ہونا'' ہوگا مگر محض ہونا کافی نہیں ہے، جب تک اس کی چند صفات یا اوصاف بیان نہیں کی جائیں گی تو ''ہونا'' اور ''نہ ہونا'' (Nothingness) دونوں برابر ہیں۔ یوں ''ہونا'' کی ضد ''نہ ہونا'' پیدا ہوتی ہے (Being versus nothingness) خالص عقل میں ''صرف ہونا'' اور ''نہ ہونا'' دونوں برابر ہیں۔ یوں ہونا اور نہ ہونا یا موجود اور غیر موجود کا ٹکراؤ ہوتا ہے، جس کے نتیجے میں ''ہوتے رہنا'' (Becoming) پیدا ہوتا ہے۔[1]

اس کا مطلب یہ ہوا کہ ہونا Thesis دعویٰ ہے، نہ ہونا اس کی ضد Anti-Thesis اور دونوں کی ترکیب Synthesis ''ہوتے رہنا'' ہے۔

ہوتے رہنا مسلسل بے سکونی کی کیفیت میں ہے۔ ہر وقت متحرک اور تب تک متحرک رہتا ہے اور جدلیات سے گزرتا رہتا ہے، جب تک یہ خیال مطلق (Absolute Idea) نہیں بن جاتا ہے۔ یہ خیال مطلق، حقیقی، لامحدود، مکمل طور پر خود ارادہ اور ہر طرح سے آزاد ہے۔

ہیگل کے نزدیک ہر قسم کی حقیقت، فکر اور اشیاء ساری تاریخ، مذہب اور فلسفہ سب کے سب ارتقائی منازل طے کر رہے ہیں اور روز بروز زیادہ یا حقیقت اور سچ کے نزدیک تر ہوتے جاتے ہیں اور یہ سب کچھ جدلیاتی جدوجہد کے تحت ہو رہا ہے۔[2]

ذہن/روح کا فلسفہ (Phenomenology of Mind/Spirit)

ہیگل نے جرمن زبان میں لفظ Geist استعمال کیا ہے، جس سے ذہن اور روح دونوں معانی بنتے ہیں۔

خیالِ مطلق اپنی نوعیت میں ایک تجریدی خیال ہے جو کہ حقیقی روپ، روحِ مطلق یا ذہنِ مطلق یا ذہنِ مطلق کی صورت میں لیتا ہے۔ روحِ مطلق (یا روحِ عالم) اپنے آپ کو پہچاننے

1-History of Eastern & Western Philosophy, Compiled by: Radha Krishanan, Page:271.

2-The age of Napolean by: Will Durrant, Page:649.

کے لیے یا اپنے آپ کو ''منکشف'' کرنے کے لیے مختلف ادوار یا درجات سے گزرتی ہے۔

روحِ عالم کا خود کو پہچاننے کا عمل روز بروز ترقی کرتا رہتا ہے۔ ہیگل اس نکتے کو ثابت کرنے کے لیے تاریخ کا سہارا لیتا ہے۔ اس کی نظر میں تاریخ، قصے، کہانیوں کی کتاب نہیں ہے، نہ ہی شترِ بے مہار ہے کہ حالات کے تحت کہیں سے کہیں جا پہنچے۔ تاریخ میں ہر جگہ عقل کارفرما ہے، جو کہ جدلیاتی طریقہ کار کے مطابق ترقی کرتی رہتی ہے اور آگے بڑھتی رہتی ہے۔

تاریخِ عالم اپنے آپ کو سمجھنے کے لیے تین مرحلوں سے گزرتی ہے، جن کا مختصر احوال ذیل میں دیا جاتا ہے:

ا۔ موضوعی روح

داخلی یا موضوعی روح (Subjective Spirit) ابتدأ فطرت میں گہری نیند میں ہوتی ہے، جہاں سے آہستہ آہستہ بیدار ہوتی ہے (بالفاظِ دیگر فطرت روحِ عالم کا خوابیدہ یا خاموش روپ ہے) ''یہ فطری روح پہلے حسیات (Sensation) اور پھر محسوسات (Feeling) کے مرحلے سے گزرتی ہے اور شعور کی حالت میں پہنچتی ہے۔ اس حالت میں وہ خود کو صرف داخلی طور پر پہچانتی ہے۔''[1]

وہ جب داخلی طور پر خود کو پہچان لیتی ہے اور اپنی آزادی و خود اختیاری کا شعور حاصل کر لیتی ہے تو یہ موضوعی سے بدل کر معروضی بن جاتی ہے۔

۲۔ معروضی روح (Objective Spirit)

معروضی روح اپنے آپ کو خاندان، معاشرے اور ریاست میں منکشف کرتی ہے۔ خاندان کے حقوق اور فرائض معاشرے میں محفوظ رہ سکتے ہیں۔ اس لیے معاشرہ خاندان سے اعلیٰ اور بلند تر ہے۔ معاشرے پر ریاست کو فوقیت حاصل ہے اور معاشرے کے حقوق سے زیادہ ریاست کے حقوق اہم ہیں۔ اس لیے فرد اور معاشرے کو اپنے حقوق ریاست پر قربان کر دینے چاہئیں۔ بشرطِ کہ ریاست حقیقی ریاست ہو جو کہ اپنے شہریوں کے حقوق اور خود ان کو بھی ایک اعلیٰ اور بلند تر فرد سمجھتی ہے جو کہ مختلف افراد کا مجموعہ ہے۔ اس لیے ریاست کے معانی ہر فرد کی نمائندگی اور اس کے تحفظ کے ہیں۔ اگر کوئی ریاست محض چند افراد اور طبقوں کے حقوق کی حفاظت کرتی ہے اور دیگر کو نظر انداز کرتی

1-Eastern & Western Philosophy compiled by:Radha Kirshanan, Page:277.

ہے تو وہ حقیقی ریاست نہیں ہے۔ لہٰذا افراد کا یہ فرض ہے کہ وہ ریاست سے وفادار رہیں۔ اس طرح معروضی روح اپنے آپ کو عالمی تاریخ میں مکمل کرتی ہے اور پھر یہ عالمی روح بن جاتی ہے۔

۳۔ رُوحِ مطلق (Absolute Spirit)

روحِ عالم خودشناسی کی آخری اور بلندترین منزل پر پہنچ کر روحِ مطلق بن جاتی ہے۔ روحِ مطلق جو کہ عقلِ کُل بھی ہے۔ یہاں پہنچ کر مکمل طور پر خودشناسی کے عمل تک پہنچ جاتی ہے اور اپنے آپ کو مرحلہ وار ذیل میں دیئے گئے تین طریقوں سے منکشف کرتی ہے:

الف۔ فن (Art)☆

روحِ مطلق، جس میں معروضی اور موضوعی روح، دونوں کے اوصاف شامل ہیں۔ یہ اپنے آپ کو پہلے فن میں منکشف کرتی ہے۔ حُسن جو کہ فن کی اہم شرط ہے، خوشی اور سکون پہنچاتا ہے۔ اس کا عروج یہ ہے کہ اس میں خیال یا تصور کو مرکزی حیثیت حاصل ہو (کیوں کہ اس میں ہی خیالِ مطلق (Absolute Idea) ہے) دوسرے لفظوں میں فن کا شہہ پارہ اسے کہا جا سکتا ہے جو کہ خیالِ مطلق کی عکاسی کرتا ہو اور لطف اور سکون کا باعث بنے۔ اس بات کو یوں بھی بیان کیا جا سکتا ہے کہ "فن بھی خیالِ مطلق کو پہچاننے کا ذریعہ ہے۔"

> "فن یہ نہیں ہے کہ اس میں صرف فطرت کی عکاسی کی جائے اور نہ ہی فن کی یہ افادیت ہے کہ اس کے ذریعے اخلاقیات کا پرچار کیا جائے۔ فن کا مقصد یہ ہے کہ اس کے ذریعے "سچ" کو فنکارانہ طریقے سے آشکار کیا جائے۔"[1]

عمارت سازی کے فن سے لے کر سنگ تراشی، مصوری، موسیقی اور شاعری اظہارِ فن کے ذرائع اور مختلف قالب ہیں۔ بہترین فن وہ ہے جس میں خیال کو قالب پر فوقیت حاصل ہو۔☆☆

☆ Philosophy of Art.

1-Eastern and Western Philosophy, Page:281.

☆☆ ہیگل کے فلسفے کے مطابق تین اہم اجزا ہیں:

۱۔ مقصد

۲۔ ہیئت۔ قالب

۳۔ مرکزی خیال

ب۔ مذہب

روحِ مطلق دوسرے مرحلے میں اپنے آپ کو مذہب کے ذریعے منکشف کرتی ہے۔ یہاں پہنچ کر روحِ مطلق اپنے آپ کو 'خدا'' کے تصور میں ظاہر کرتی ہے۔ (ہیگل کا تصورِ خدا، عام مذہبی خدائی تصور سے مختلف ہے۔ مذہبی خدا کے تصور کے معانی شخصی خدا کے ہیں)

مذہب میں ''خدا'' بنیادی تصور/خیال ہے اور اس کے ساتھ یہ تصور بھی کہ خدا اور انسان دو الگ حقیقتیں ہیں جن کے درمیان عبد اور معبود کا رشتہ ہے، یہ دونوں حقیقتیں عبادت کے ذریعے ایک (Unified) ہوسکتی ہیں۔

ہیگل کے نزدیک یہ سوچ صرف علامتی (Symblic) ہے کہ خدا نے کائنات اور انسان کو تخلیق کیا ہے یا محدود کو لامحدود نے تخلیق کیا ہے، جب ایک لامحدود وجود یا حقیقت موجود ہے تو محدود حقیقت اپنا وجود کس طرح برقرار رکھ سکتی ہے۔ یعنی یہ کائنات اور انسان خدا کے وجود میں ہی اپنے وجود رکھتے ہیں☆۔

خدا اپنے وجود سے باہر سوچے یہ ممکن نہیں ہے کیوں کہ خدا کے وجود کی کوئی سرحد تو ہے ہی نہیں☆☆۔

ت۔ فلسفہ

فن کی بنیاد وجدان (Intuition) اور مذہب کی بنیاد نمائندگی (Representation) پر ہے۔ فلسفہ دونوں کی ترکیب (Synthesis) ہے اور اپنے آپ میں دونوں اجزاء رکھتا ہے۔ فن اور مذہب روحِ مطلق کے شعور کے دو الگ اسلوب ہیں اور فلسفہ روحِ مطلق کا ''اسلوبِ مطلق'' (Absolute Mode) ہے۔ یہاں پہنچ کر روحِ مطلق اپنے آپ کو ہی سوچتی ہے یعنی خیال صرف خیال کے متعلق سوچتا ہے☆☆☆۔

یہاں تک کا سفر جدلیات کے ذریعے طے ہوتا ہے جس میں سچ بتدریج کامل سچ بن جاتا ہے اور جدلیات کا چکر بھی اختتام پذیر ہوجاتا ہے۔ سچ، دائمی، سچ میں اور خیال، دائمی خیال میں بدل جاتا ہے، جو اگر موجود ہے تو صرف اپنے آپ کے لیے، سوچتا ہے تو صرف اپنے آپ کو اور اپنے آپ

☆وہی برکلے والی بات۔ ☆☆قریباً ارسطو والی بات۔
☆☆☆Philosophy of Philosophy.

میں ہی دائمی سکون میں ہے۔اپنے جدلیاتی فلسفے میں ہیگل نے جدلیات کے علاوہ سماجیات، سیاسیات، اخلاقیات، تاریخ اور فلسفے کے فلسفے، تاریخ کے فلسفے اور فلسفے کی تاریخ پر بھی ٹھوس بحث کی ہے۔بہتر ہوگا کہ اس کا بھی خلاصہ پیش کر دیا جائے۔

ریاست☆

معروضی روح اپنے آپ کو خاندان، معاشرے اور ریاست میں منکشف کرتی ہے، ہیگل ریاست کو ایک ''نامی جسم'' (Organic Body) کی طرح سمجھتا ہے جو اپنی ذات کا شعور رکھتی ہے۔ریاست کو فرد اور معاشرے پر فوقیت حاصل ہے۔فرد اپنی آزادی سے تب ہی لطف اندوز ہو سکتا ہے جب وہ ریاست کے قوانین کی پابندی کرے۔

ہیگل کی ریاست بھی جدلیاتی مراحل سے گزرنے کے بعد ریاست کی منزل پر پہنچتی ہے۔ انسانی معاشرے اور تاریخ نے یہ ثابت کیا ہے کہ ایک طرف مطلق العنانیت یعنی بادشاہت، شہنشاہیت (Thesis) وغیرہ رہی ہے تو دوسری طرف مکمل آزادی یا طوائف الملوکی (Anarchy) اور انتشار (Anti-Thesis) رہی ہے۔ یہ دونوں متضاد قوتیں ایک دوسرے کے خلاف برسرِ پیکار رہتی ہیں۔ ان کے ٹکراؤ کے نتیجے میں جو امتزاج (Synthesis) بنتا ہے، وہ آئینی بادشاہت (Constitutional monachy) ہے۔

ہیگل آئینی بادشاہت کا حامی اور جمہوریت کا مخالف ہے۔اس کے خیال میں ایک عام انسان کی سوچ اتنی ہو ہی نہیں سکتی کہ وہ صحیح حکمران منتخب کر سکے۔لہٰذا بہتر یہ ہوگا کہ آئینی بادشاہت کے ماتحت دو ایوان ہوں، جو صرف ووٹ کے ذریعے ان ایوانوں میں پہنچ سکیں۔ان دو ایوانوں میں ایک قانون ساز ادارہ (Assembly) ہو اور دوسرا انتظامیہ (Executive) ہو، جس میں عدلیہ (Judiciary) ہو۔آئینی بادشاہت موروثی ہونی چاہیے۔ (اس سے ملتا جلتا نظام فرانس میں انقلاب کے بعد نافذ کیا گیا تھا)

ہیگل کی ریاست کا مقصد انسان کی آزادی ہے لیکن یہ آزادی محض شخصی یا انفرادی آزادی تک محدود نہیں ہے۔کیوں کہ اگر ہر فرد کو ہر قسم کی آزادی میسر ہو گی تو پھر نظم و نظم نہیں رہ سکے گا اور انتشار پھیل جائے گا۔یہاں آزادی کا مطلب نظم وضبط اور قانون پر عمل کے دائرے میں آزادی

☆Political Philosophy.

ہے۔قانون پر عمل کرنے سے ہی انسان صحیح معنوں میں آزاد رہ سکتا ہے۔اس کے علاوہ فرد اور معاشرے کا ارتقاء ریاست کے ذریعے ہی ممکن ہے جو مادی اور اخلاقی ارتقاء کے ساتھ ساتھ روحانی ارتقاء کا باعث بھی ہے۔اس کے ساتھ خود ریاست کا بھی ارتقاء ہوتا ہے اور معروضی روح، روحِ مطلق کی طرف سفر اختیار کرتی ہے۔

ہیگل کے نزدیک ریاست کا سب سے اعلیٰ اور بلند مقصد یہ ہے کہ ریاست علم اور فن کو ترقی دلائے اور قوم کے ذہنی ارتقاء کو عروج کی بلندیوں پر پہنچائے۔

کانٹ عالمی امن کے لیے سوچتا رہا اور ریاست کو جنگ کرنے سے روکتا رہا لیکن ہیگل کانٹ کی مخالفت کرتا ہے۔اس کا خیال ہے کہ جنگ اتنی بُری نہیں ہے جتنی دِکھائی دیتی ہے۔جنگ سے ریاست کے اندر پھیلا ہوا انتشار ختم ہو جاتا ہے اور اتحاد، یگانگیت اور وطن سے محبت پیدا ہوتی ہے۔

تاریخ کا فلسفہ

معروضی روح، روحِ مطلق بننے سے پہلے اور ریاست کے بعد اپنے آپ کو عالمی تاریخ میں منکشف کرتی ہے۔یہاں بھی ہیگل کی جدلیات اپنی لہر میں ہے اور بادشاہوں میں انتشار اور تضادات کا سلسلہ دیکھ رہی ہے۔''کیا تاریخ کے عمل کے پسِ پردہ کوئی مکمل منصوبہ بندی ہے؟''اس کا جواب ہاں میں بھی ہے اور ناں میں بھی۔

۱۔ نہیں، اگر اس کا مقصد یہ ہے کہ کوئی اعلیٰ ترین قوت، علت اور معلول کے قانون کی رہنمائی کر کے اسے کسی مقرر کردہ منزل کی طرف لے جا رہی ہے۔

۲۔ہاں، اگر اس کا مطلب یہ ہے کہ عقل (یا روح) حالات کو اس رُخ کی طرف لے جا رہی ہے، جہاں انسان تہذیب کے ذریعے اپنے نصب العین کی طرف بڑھ رہا ہے۔[1]

ہیگل کہنا یہ چاہتا ہے کہ تاریخ کے ہر عمل کے پس پردہ عقل کارفرما ہے۔بڑے بڑے جنرل اور بے حد ذہین (Genius) انسان اپنے اپنے دَور کی پیداوار ہوتے ہیں۔یہ وہ سب کچھ کرتے ہیں جس کی متقاضی روحِ عصر (Spirit of the age) ہوتی ہے۔

عقل کسی بھی تاریخی ڈرامے کے لیے اسٹیج تیار رکھتی ہے اور انسان اپنی بے خبری میں اس پر اپنا کردار ادا کرتا ہے اور سمجھتا ہے کہ وہ یہ سب کچھ اپنے ذاتی اور قومی مفاد میں کر رہا ہے، لیکن یہ

سب کچھ ایک عظیم عقلی منصوبے کے عمل کا حصہ ہوتا ہے۔ سکندرِ اعظم سمجھتا ہے کہ وہ یونانی قوم کو دنیا پر فاتح بنا رہا ہے لیکن درحقیقت وہ عقل کے منصوبے پر کام کر رہا ہے۔ اسی طرح نپولین سے روحِ عصر یورپ کے اتحاد کا کام لے رہی ہے اور یوں تاریخ اپنی منزلیں طے کرتی رہتی ہے۔

ہیگل انسانی تہذیب کو تین حصوں میں تقسیم کرتا ہے:

الف۔ مشرقی تہذیب The oriental

ب۔ یونانی۔ رومی

ت۔ عیسائی دنیا

ابتدائی دَور میں چین، بھارت، ایران، ترکی، فلسطین اور مصر آتے ہیں۔ تاریخ کے اس دَور میں لوگوں کے نزدیک انسانوں کی آزادی کا تصور واضح نہیں ہوا تھا اور ان کے نزدیک کامل آزادی صرف اور صرف بادشاہ، شہنشاہ یا فرعون کے پاس تھی۔ باقی سب رعایا اور غلام تھے۔ تاریخ کے دوسرے دَور میں شعور کی ترقی ہوتی ہے یعنی عقل، تاریخ کو ایک قدم آگے بڑھاتی ہے۔ اس دَور میں اکثریت غلاموں کی ہے مگر ان کے آقا آزاد ہیں۔ اس دَور میں طبقاتی آزادی کا شعور پیدا ہوا۔ یہاں تک کہ ارسطو جیسے دانش ور کے ہاں بھی غلامی کے خاتمے کا تصور پیدا نہیں ہوا تھا۔ تاریخ کے تیسرے دَور یعنی عیسائی دَور میں خصوصاً جرمن قوم کے ہاں افراد کی آزادی کا شعور پیدا ہوتا ہے۔ یعنی ہر شہری، ہر فرد مکمل طور پر آزاد ہے۔ افراد مل کر معاشرہ اور معاشرے مل کر ریاست بناتے ہیں۔ اس لیے ریاست افراد کی آزادی کا مجموعہ ہے۔ یہ ایک قوم ہیں اور ہیگل قومی ریاست کو ضروری اور افرادِ انسانوں کی آزادی کا اعلیٰ مظہر سمجھتا ہے۔ روحِ عالم کسی ریاست اور کسی قوم کو پسندیدہ بنا کر اسے اپنی منشاء کے مطابق استعمال کرتی ہے اور یوں وہ اپنے آپ کو مثالی ریاست کی شکل میں منکشف کر کے عروج تک پہنچتی ہے۔ ہیگل کے خیال میں روحِ عالم نے جرمن قوم کو اپنی منشاء کے مطابق ''پسندیدہ قوم'' (Favourite Nation) قرار دے کر اسے منتخب کر لیا ہے۔☆

جمالیات / فن کا فلسفہ

ہیگل کی روحِ مطلق موضوعی اور معروضی روح کا امتزاج رکھتی ہے اور اپنے آپ کو آخری تین مرحلوں یعنی فن، مذہب اور فلسفے میں منکشف کرتی ہے۔ ویسے تو حُسن فطرت میں بھی بہت ہے مگر

☆ یہ خوش فہمی تقریباً ہر مذہب کے لوگوں کو ہے کہ وہ اور صرف وہ ہی خدا کی پسندیدہ قوم / اُمت ہیں۔

فن کے ذریعے حُسن کا اظہار ایک اعلیٰ حُسن ہے کیوں کہ اس میں روحِ مطلق (خدا) خود اپنا جلوہ دیکھتا ہے۔ جیسا کہ روحِ مطلق، موضوع اور معروض کا امتزاج ہے۔ اس لیے فن بھی روح اور مادے کا امتزاج ہے۔ بالالفاظ دیگر بہترین فن وہ ہے، جس میں خیال رتصور اور روپ کے درمیان مکمل ہم آہنگی اور خوب صورتی ہو مگر ہمیشہ ایسا نہیں ہوتا ہے۔ فن کار ایک قسم کا وسیلہ ہے فن کے اظہار کا۔ فن کار کو خود بھی علم نہیں ہوتا ہے کہ روحِ مطلق اس سے کوئی کام لے رہی ہے۔ فن کار پر ایک وجدانی کیفیت طاری ہوتی ہے اور فن تخلیق ہو جاتا ہے، جیسا کہ روحِ مطلق اپنے آپ کو تین ادوار میں منکشف کر چکی ہے۔ اس لیے فن میں بھی تین ادوار میں منکشف ہوتی ہے۔

الف۔ اُوپر ذِکر ہو چکا ہے کہ بہترین فن وہ ہے جس میں خیال اور روپ میں ہم آہنگی ہو مگر فن کے ابتدائی دَور میں ایسا نہیں تھا۔ خیال ابھی واضح نہیں ہوا تھا اور محض دُھندلا تھا، اس لیے قالب (Form) زیادہ واضح اور حادی رہا۔ مثال کے طور پر مصر کے اہرام، نیپال اور بھارت کے اسٹوپا پُرانے زمانے کے کئی مندر یا عبادت گاہیں اس کی مثالیں ہیں۔

ب۔ فن کا دوسرا دَور یا دوسری قسم کلاسیکی فن (Classical Art) ہے، جس میں خیال اور قالب میں مکمل ہم آہنگی ہے۔ اس قسم کے فن میں روح اپنے آپ کو مجسمہ سازی کے فن میں انکشاف کرتی ہے۔ پہلے خیال صرف مجرد تھا اور اب ٹھوس دِکھائی دیتا ہے اور خیال پُراسرار بھی نہیں ہے بلکہ قابلِ فہم ہے۔ ''یہ یونانی دَور ہے اور یونانی فن کو ہیگل کلاسیکیت کا درجہ دیتا ہے، جہاں خیال اور قالب یا روح اور مادے میں مکمل ہم آہنگی ہے۔ یہاں فن کار فن میں خیال کو سمجھانے کے بجائے اسے ظاہر کرتا ہے۔''[1]

ت۔ رومانوی فن: پہلے دونوں ادوار میں روح نے اپنے آپ کو منکشف کیا تھا، مگر رومانوی فن میں وہ لامحدود ہو جاتا ہے (جس کی وجہ سے خیال، قالب پر حادی ہو جاتا ہے) ہیگل کے نزدیک مصوری، موسیقی اور شاعری رومانوی فن ہیں۔ رومانوی فن میں شاعری اظہار کا سب سے طاقت ور ذریعہ ہے، جس میں لفظوں کے ذریعے خیال رتصور کو ظاہر کیا جاتا ہے مگر جیسا کہ روحِ مطلق لامحدود ہے اور فن اس کا احاطہ نہیں کر سکتا۔ اس لیے فن کار کو وجدانی طور پر اپنی کم مائیگی، محدودیت اور بے چارگی کا احساس ہوتا ہے۔ ہیگل کہتا ہے کہ پھر روح اپنے آپ کو دوسرے مرحلے یعنی

1-Frederich Copleston S.J, Vol:VII, Page:232.

مذہب میں منکشف کرتی ہے۔

ہیگل کے اثرات

ہیگل پر بے تحاشا تنقید ہوئی لیکن اس کے فلسفے کا اثر بھی بے پناہ ہوا۔ برٹرینڈ رسل تو ہیگل پر سخت تنقید کرتے ہوئے لکھتا ہے کہ روحِ مطلق نے تاریخ میں اپنے آپ کو منکشف کرنے کے لیے صرف Mediteranean سمندر کے قریبی علاقے ہی کیوں منتخب کیے۔ دوسرا یہ کہ ہیگل کے فلسفے میں یہ واضح ہے کہ خدا نے صرف اس زمین کو اہمیت دی اور اس کائنات میں زمین کی اہمیت اور حیثیت ایک نکتے جتنی بھی نہیں ہے۔ اس کے فلسفے کے حامی اور مخالفین دو واضح گروپوں میں تقسیم ہو گئے۔ ایک گروپ دایاں اور دوسرا بایاں کہلاتا ہے۔

ہیگل کے فلسفے کی مخالفت میں دو الگ الگ مکتبۂ فکر وجود میں آئے، جنھوں نے آج تک دنیا کی سیاست، معیشت اور ادب پر بے انتہا اثرات مرتب کیے ہیں۔ ان مخالفین میں ایک کیئر کیگارڈ تھا، جو کہ وجودیت (Existentialism) کا بانی تھا اور دوسرا کارل مارکس جس نے ہیگل کی مابعد الطبیعاتی جدلیات کو سائنسی جدلیت یا مادی جدلیت (Dialectial Materialism) میں بدل ڈالا۔

کارل مارکس

(1818ءتا1883ء)

کارل مارکس جرمنی کے شہر ٹریویز میں پیدا ہوا۔اس کا والد عیسائیت قبول کرنے سے قبل یہودی بیرسٹر تھا۔اسی وجہ سے مارکس کو قانون کی تعلیم دلائی گئی۔ برلن اور بون میں سن 1836ء قانون کی ڈگری حاصل کرنے کے بعد مارکس فلسفے کی طرف راغب ہوا اور سن 1841ء میں اپیکیورس پر مقالہ لکھ کر ڈاکٹریٹ کی۔

سن 1843ء میں اپنی دوست جینی سے شادی کی جو ایک لارڈ کی بیٹی تھی۔جینی نے پوری زندگی مارکس سے وفا کی اور ہر کٹھن مرحلے میں مارکس کی بہترین جیون ساتھی ثابت ہوئی۔روزگار کی خاطر مارکس ایک اخبار کا ایڈیٹر بنا اور اس نے ایسے مضامین لکھے کہ حکمرانِ وقت اس پر بپھر گئے۔ مارکس ابتدا سے ہی جاگیرداری نظام کے خلاف تھا اور اس مخالفت میں دُھواں دار مضامین لکھنے کے نتیجے میں اسے بے انتہا شہرت ملی تو دوسری جانب حکومت نے اخبار بند کر دیا اور مارکس کو فرانس میں پناہ لینا پڑی۔

فرانس میں مارکس کی دوستی اینجلس سے ہوئی جو ایک کارخانے دار کا بیٹا تھا۔وہ زبردست انقلابی تھا اور اس نے مارکس سے ساری عمر ساتھ نبھانے میں کوئی کسر نہ اُٹھا رکھی۔

فرانس کے بعد مارکس لندن چلا گیا جہاں وہ ساری عمر مقیم رہا اور وہیں فوت ہوا۔اس ساری بھاگ دوڑ، سرکاری جبر اور غریب الوطنی کی وجہ سے مارکس اور جینی انتہائی مفلس ہو گئے اور

نوبت فاقوں تک جا پہنچی لیکن مارکس نے اس حالت میں بھی ہمت نہ ہاری اور گزراوقات کے لیے یارک ہیرالڈ ٹریبون کے نمائندے کی حیثیت سے کام کرنے لگا۔ اس کے پاس کپڑوں کا صرف ایک جوڑا ہوتا، جس کو دھونے کے بعد وہ کمرے میں بند ہو کر بیٹھ جاتا جب تک کہ کپڑے سوکھ نہ جاتے۔

پورے یورپ کے انقلابیوں نے جیسے مارکس کا گھر دیکھ لیا تھا۔ جاگیردارانہ اور سرمایہ دارانہ نظام کے مخالف انقلابی لندن میں مارکس کے گھر ضرور آتے، جہاں مارکس اور جینی ان کی خاطر مدارت کرتے۔ اس دوران جینی کے سارے زیورات بک گئے اور گھر کے سارے برتن گروی رکھوا دیے گئے اور وہ قرضہ لے کر گزر بسر کرنے لگے۔ انتہائی مفلسی کے عالم میں مارکس اور جینی کو ابھی کئی زخم سہنا تھے۔ جینی کے خط سے یہ دل خراش اقتباس ان کی بے بسی کی پوری طرح سے عکاسی کرتا ہے۔

سن 1852ء کے ایسٹر پر ہماری ننھی فرانسکا شدید نزلے کا شکار ہو گئی۔ وہ تین دن اور راتیں زندگی اور موت کی کشمکش میں تڑپتی رہی۔ اس کی تکلیف دیکھی نہ جاتی تھی، آخر کار وہ انتقال کر گئی۔ ہم نے اس کی لاش کو پچھلے کمرے میں رکھا اور خود سامنے والے کمرے میں لیٹ گئے۔ تینوں بچے ہمارے ساتھ تھے اور ہم سب اس معصوم فرشتے کی جدائی پر رو رہے تھے، جس کا بے جان جسم پچھلے کمرے میں پڑا تھا۔ بے چاری کی موت بھی ایسے وقت پر واقع ہوئی تھی جب ہم فاقے کاٹ رہے تھے اور کوئی جرمن دوست بھی ہماری مدد نہ کر سکا۔ ارنیسٹ جونز نے بھی صرف مدد کا وعدہ کیا لیکن اس نے بھی عملی طور پر کچھ نہ کیا۔ مَیں اپنے دل میں درد کی دنیا سمیٹے ایک فرانسیسی پناہ گزیں کے پاس گئی جو کبھی کبھار ہمارے ہاں آیا کرتا تھا۔ اس نے مجھے دو پاؤنڈ دیے جن سے ہم نے چھوٹا تابوت خریدا جس میں فرانسکا ابدی نیند سوئی پڑی ہے، جب وہ پیدا ہوئی تھی۔ تو ہم اس کے لیے جھولا نہیں خرید سکے تھے اور جب اس کی بے وقت موت واقع ہوئی تو اس کے لیے تابوت بھی کتنی مشکل سے حاصل کر سکے تھے۔ محلے دار اس کی لاش لے کر قبرستان چلے گئے اور ہمارے دلوں پر جانے کیا کیا قیامتیں گزر گئیں۔[1]

مارکس ہر وقت مطالعے میں غرق رہتا، وہ دن کو برٹش میوزیم میں اور رات کو اپنے کمرے میں پڑھتا رہتا اس سے پہلے وہ اینگلس کے ساتھ مل کر سن 1848ء میں ''اشتراکی منشور'' (Communist Menifesto) لکھ چکا تھا۔ لندن میں دس سالہ محنت اور مطالعے کے بعد اس

ا۔ روایاتِ فلسفہ از علی عباس جلالپوری۔

نے اپنی شہرہ آفاق کتاب سرمایہ (The Capitall) لکھ کر مکمل کی۔ اس کی زندگی میں مذکورہ کتاب کی جلد اوّل شائع ہوئی۔ جلد دوئم اور جلد سوئم اس کی وفات کے بعد اینجلس نے شائع کرائیں۔

اینجلس اور مارکس دونوں دوست ہفت زبان تھے۔ مارکس کو لاطینی، یونانی، فرانسیسی، انگریزی، ہسپانوی اور رومانی زبانوں پر دسترس حاصل تھی اور آخر میں روسی زبان بھی سیکھ لی۔

سن 1881ء میں مارکس کی باوفا اور ہمدرد جان نثار جینی نے اپنی زندگی کا سفر اختتام کیا اور مارکس کو غموں کے سمندر میں غرقاں کر کے راہِ عدم پر روانہ ہوگئی لیکن مارکس تو شاید پیدا ہی درد جھیلنے کے لیے ہوا تھا۔ تھوڑے ہی عرصے کے بعد اس کی بڑی بیٹی بھی اپنی ماں سے جا ملی اور مارکس اتنے صدمے سہہ نہ سکا۔

اینجلس، مارکس کی مزاج پُرسی کے لیے آیا تو اس نے دیکھا کہ وہ آرام کُرسی پر آرام کر رہا تھا لیکن جب اس نے قریب آ کر دیکھا تو مارکس ابدی نیند سو چکا تھا۔ ساری دنیا کے دُکھ درد اپنے سینے میں سمونے والا مارکس اپنے دریا جیسے دل سمیت جینی اور فرانسکا سے جا ملا۔

مارکس نے "سرمایہ" کے علاوہ مندرجہ ذیل کتابیں اور مقالے لکھے:

1-Communist Menifesto (With Engels)
2-The German Ideology (With Engels)
3-Poverty of Philosophy.
4-Contribution to a critique of Political Economy.

جدلیاتی مادیت

مارکس ابتداء سے ہی مادیت پرست فلسفے سے متاثر تھا، اس کی ڈاکٹریٹ بھی اسی سلسلے کی کڑی تھی۔ اس کے علاوہ وہ فرانس کے روشن خیال فلسفے سے بھی متاثر تھا، جنھوں نے منظم مذہب اور توہم پرستی کے خلاف بہت کچھ کیا تھا۔ ان کے نظریات بھی مادہ پرستی سے تعلق رکھتے تھے۔

مارکس نے ہیگل کے جدلیاتی نظام میں زبردست تبدیلی کرتے ہوئے اپنے فلسفیانہ نظام کی بنیاد رکھی۔ ہیگل کا نظریہ تھا کہ روحِ مطلق اپنے آپ کو مادے کی مختلف صورتوں میں منکشف کرتی ہے۔ مادی دنیا کی ہر تبدیلی، روحِ مطلق کی منشاء کو پورا کرتی ہے۔ بالفاظِ دیگر ہیگل نے یہ کہا کہ ذہن مادے سے مقدم ہے اور ذہن ہی مادے میں تغیرات کا باعث ہے۔ ہیگل نے ذہن کو مادے کا پیش رو کہا۔ مارکس نے ہیگل سے شدید اختلاف کرتے ہوئے یہ نظریہ پیش کیا کہ "مادہ ذہن کی پیداوار نہیں

ہے بلکہ ذہن مادے کی پیداوار ہے۔'' یعنی مادے کی تبدیلیوں اور تغیرات کا باعث ذہن نہیں ہے مگر ذہن یا سوچ یا فکر، مادی حالات سے جنم لیتی ہے۔ دوسرے لفظوں میں پہلے مادہ ہے پھر ذہن۔

مارکس، ہیگل کی اس بات سے متفق تھا کہ ہر شے میں جدلیاتی عمل جاری وساری ہے اور تضادات کے ذریعے ہر شے ارتقائی مراحل طے کرتی ہے لیکن یہ تضاد یا جدلیاتی عمل کسی مافوق الفطرت ہستی کی منشا کے مطابق نہیں ہیں بلکہ ان تضادات کے نتیجے میں فکر جنم لیتی ہے اور ترقی کرتی ہے، یعنی فکر حالات کی پیداوار ہے۔

مادہ اپنے وجود کے لیے کسی بھی ذہن کا محتاج نہیں ہے بلکہ ذہن مادے کا محتاج ہے۔ ذہن کے سوا مادہ تو ممکن ہے مگر مادے کے بغیر ذہن ممکن نہیں ہے۔ مثلاً پتھر مادہ ہے اور اس میں ذہن نہیں ہے لیکن پھر بھی پتھر موجود ہے اور انسان میں ذہن ہے لیکن ہر ذہن انسانی جسم کا محتاج ہے، جب ننھا بچہ پیدا ہوتا ہے تو اس کی شخصیت کی تعمیر اس کا ذہن نہیں بلکہ معروضی حالات کرتے ہیں اور ان حالات کے مطابق اس کی ''فکر'' پروان چڑھتی ہے۔

ہیگل کی جدلیات جو کہ مابعد الطبیعاتی تھی اس کو مارکس نے مادی جدلیات میں بدل ڈالا اور کہا ''میں نے ہیگل کی جدلیات کو پیروں پر کھڑا کر دیا ہے جو کہ پہلے سر کے بل کھڑی تھی۔''

جدلیاتی مادیت کا اہم نکتہ یہ ہے کہ ''ہر اثبات میں اس کی نفی موجود ہوتی ہے اور پھر اس نفی کی بھی نفی ہو جاتی ہے۔ یہ نفی کی نفی بھی ایک اثبات ہے۔ اس اصول کا اطلاق معاشرے پر اس طرح کیا گیا ہے کہ زرعی انقلاب کے بعد جاگیردارانہ معاشرے کا رواج شروع ہوا۔ جاگیرداروں کو اپنی جاگیریں چلانے کے لیے روپوں کی ضرورت پڑی تو وہ بیوپاریوں نے فراہم کیے۔ محنت ومشقت کا کام مزارعوں اور غلاموں کے سپرد تھا۔ یہ اس معاشرے کا اثباتی پہلو تھا، لیکن اس اثبات کی نفی بھی اثبات کے اندر ہی پوشیدہ تھی، یعنی وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ تاجر طاقتور بن گئے، جنھوں نے جاگیرداروں کو کچل ڈالا اور ساری طاقت ان کے پاس آ گئی۔ انھوں نے سائنسی ترقی کی مدد سے کارخانے لگائے جن کے لیے مزدوروں کی ضرورت پیش آئی۔ اس سرمایہ دارانہ نظام میں مزدوروں کی حالت وہی تھی جو کہ مزارعے اور غلام کی زرعی سماج میں تھی۔ جاگیردار کی نفی سرمایہ دار (بورژوا) نے کی اور سرمایہ دار کی نفی مزدور کریں گے۔ یوں نفی کی نفی ہو گی اور انسانی معاشرہ مزید ایک قدم ترقی کرے گا۔

ہیگل نے اپنی مابعد الطبیعاتی جدلیات میں بتایا تھا کہ روحِ مطلق ریاست، مذہب اور فن میں اپنے آپ کو منکشف کرتی ہے۔ بالفاظِ دیگر ریاست، مذہب، فن اور فکر سب سوچ اور ذہن کے سوچے سمجھے منصوبے ہیں اور حالات ان کے مطابق تبدیل ہوتے ہیں۔ مارکس نے جدلیاتی مادیت میں یہ بتایا کہ بورژوا طبقہ ریاست اور مذہب کو ہتھیار کے طور پر استعمال کرتا ہے اور وہ اس کے ذریعے مزدوروں کا استحصال کرتا ہے۔ وہ ایسے قوانین بناتا ہے جن سے مزدوروں کو اَن دیکھی زنجیروں میں قید کیا جا سکے۔ وہ فکر، فن اور اخلاقی اقدار کو بھی اپنے پاس یرغمال بنا کر، ان کو مزدوروں اور غریبوں کے خلاف استعمال کرتا ہے۔ وہ ایسے قوانین بناتا ہے جن سے اس کے اپنے مفادات کا تحفظ ہو۔

تاریخی مادیت

مارکسی تاریخی مادیت بھی ہیگل کی مابعد الطبیعاتی تاریخ کے برعکس ہے۔ ہیگل کے نزدیک تاریخ ایک سوچے سمجھے منصوبے کا نتیجہ ہے اور ایک آفاقی ذہن تاریخ کے عمل میں اپنے آپ کو منکشف کرتا ہے۔ مارکس اس تصور کو غلط قرار دیتا ہے کہ حالات سوچے سمجھے منصوبے کا حصہ ہیں۔ یعنی حالات کی تبدیلی کا سبب کوئی ذہن نہیں بلکہ مادی اسباب ہیں۔

مارکس کے مطابق شکار والے عہد میں انسان قبیلوں کی شکل میں رہتے تھے اور مل جل کر شکار کرتے تھے۔ وہ ہر اعتبار سے برابر تھے اور ہر انسان کا کام یعنی شکار کرتا تھا۔ وہ معاشرہ ہر قسم کے استحصال سے پاک اور ابتدائی اشتراک (Socialism) کی ایک مثال تھا، جس میں محنت کے اوزار، عورت اور پیداوار یعنی شکار مشترک تھا۔

زرعی دَور کے ساتھ ہی حالات تبدیل ہو گئے اور پیداوار کے نئے آلات ایجاد کیے گئے۔ تیر کی جگہ کدال اور کمان کی جگہ ہل کے پھل نے لے لی۔ ذاتی ملکیت کا رواج شروع ہوا اور زمین کے زرخیز علاقے طاقتور لوگوں کے تسلط میں آ گئے، جنھوں نے نئے معاشرے اور نئی سوچ کو جنم دیا۔ آقا اور غلام، دو الگ الگ طبقے وجود میں آ گئے۔ مذہب اور اخلاقیات نے آقا کی مدد کی اور غلام کے فرائض میں ''وفادارانہ اطاعت'' کو ایک اعلیٰ وصف کے طور پر سراہا گیا۔☆

اس طرح وسائل پر قبضہ ایک اعلیٰ حرفت بن گئی جس کے لیے طاقت کا استعمال، ظلم اور

☆دنیا کے کسی بھی مذہب میں واضح الفاظ میں غلامی کی ممانعت نہیں کی گئی ہے۔

بربریت جائز قرار دیے گئے۔ پیداواری وسائل پر قبضے کے لیے ریاست، مذہب اور اخلاقیات کو استعمال کیا گیا اور بدترین جنگوں کا آغاز ہوا۔ مارکس تقریباً ہر نوع کی جنگ کا محرک معیشت کو سمجھتا ہے۔ بظاہر یہ جنگیں، مذہبی یا سیاسی اسباب کی وجہ سے لڑی جاتی ہیں لیکن دراصل ان کے پسِ پردہ معاشی مفادات ہی پوشیدہ ہوتے ہیں۔

مختصراً یہ کہ تاریخ کے عمل کی پشت پر معاشی محرک ہوتے ہیں جو کہ انسان کو دوسروں کے وسائل پر قبضہ کرنے کے لیے آمادہ کرتے ہیں۔ وِل ڈیورانٹ لکھتا ہے ''انسان سمجھتا ہے کہ اس نے اپنے خیالات کو فلسفے، اخلاقی اصولوں، مذہبی عقائد، جماعتی تعصبات اور فنی ذوق کو منطقی و غیر جانب دار اور عقلی بنیادوں پر ارتقا بخشا ہے لیکن یہ اس کی بھول ہے۔ وہ یہ نہیں سمجھتا ہے کہ بنیادی معاشی عمل اس کے خیالات کا رُخ اور رجحان متعین کرتے ہیں۔''[1]

سوشلزم اور معاشی فلسفہ

سوشلزم بیک وقت سیاسی، معاشی اور سماجی نظام ہے کیوں کہ استحصال کے خاتمے کے لیے ایک نئے سیاسی نظام اور معیشت کی ضرورت ہے۔

مارکس نے اپنی زندگی کے دس سال، اپنی صحت اور گھریلو زندگی کی قربانی دی اور Das Capital وجود میں آ گیا۔ مارکس نے اپنی اس شہرۂ آفاق تخلیق میں معیشت اور پیداواری ذرائع پر طویل بحث کی ہے جس کا اختصار ذیل میں دیا جاتا ہے۔

جنس کیا ہے؟ جنس وہ شے ہے جو کسی انسانی ضرورت کو پورا کرے اور اس کا لین دین ہو سکے، اس جنس کی ایک مخصوص قیمت ہوتی ہے جسے قدر (Value) بھی کہا جاسکتا ہے۔ یہ قیمت دراصل منجمد شدہ محنت کے برابر ہے۔ کوئی بھی جنس انسانی محنت کے بغیر وجود میں نہیں آ سکتی۔ گندم کی ایک بوری اُگانے کے لیے مزارعے کو مخصوص حد تک محنت کرنی پڑتی ہے۔ یوں گندم کی بوری میں مزارعے کی منجمد شدہ محنت تصور کریں۔ گندم کی بوری کی قدر (Value) مزارعے کی محنت کے برابر ہونی چاہیے، مگر مزارعے کو بہت کم قیمت ملتی ہے اور باقی زمین دار کو ملتی ہے، جو کہ کچھ محنت نہیں کرتا۔ اسی طرح کارخانے میں کام کرنے والے مزدور کو جنس کی قیمت کے مقابلے میں کم معاوضہ ملتا ہے۔ مثال کے طور پر ایک مزدور آٹھ گھنٹوں میں ایک قالین تیار کرتا ہے لیکن اسے معاوضہ قالین کی قیمت سے

1-Mansion of Philosophy.

بہت کم ملتا ہے، اگر وہ قالین 400 روپے میں فروخت ہوتا ہے تو مزدور کو صرف 100 روپے ملتے ہیں۔ حالاں کہ مزدور نے ایک گھنٹے میں 50 روپے کے برابر محنت کی تھی لیکن مزدور کو صرف دو گھنٹوں کا معاوضہ یعنی 100 روپے ملا۔ باقی 300 روپے مالک/سرمایہ دار کو کسی محنت کے بغیر مل گئے۔ کیوں کہ اس نے صرف سرمایہ لگایا تھا۔ ان اضافی 300 روپوں کو مارکس ''اضافی قدر'' (Surplus Value) کہتا ہے۔ یہ اضافی قیمت جو مالک کی جیب میں چلی جاتی ہے۔ سرمائے میں تبدیل ہو جاتی ہے۔

مزدور کو جو 100 روپے ملے تھے، وہ اس کی محض دو گھنٹوں کی محنت کا معاوضہ تھا، باقی چھ گھنٹے اس نے مفت میں کام کیا، جس کا اسے کوئی معاوضہ نہیں ملا۔ مالک نے اس سے چھ گھنٹے مفت کام لے کر دراصل اسے چھ گھنٹے غلام رکھا اور اس طرح مالک نے مزدور کا استحصال کیا۔

استحصال کے ذریعے جمع شدہ اضافی قیمت مالک کے پاس سرمائے کی صورت میں جمع ہوتی رہتی ہے اور اسے امیر ترین بناتی جاتی ہے۔ وہ یہ سرمایہ لگا کر مزید کارخانے اور نئی مشینیں خرید لیتا ہے، جن کی وجہ سے اس میں زبردست اضافہ ہوتا ہے۔ پیداوار میں اضافے کی وجہ سے پیداوار کی قیمت کم ہو جاتی ہے۔ نتیجے میں مالک اپنا منافع یا استحصالی اضافی قدر کم کرنے کے بجائے مزدوروں کو اجرت کم دیتا ہے یا ان کی چھانٹی کرتا ہے۔ اس طرح سرمایہ داروں کے پاس زیادہ سرمایہ اور مزدوروں کے پاس زیادہ غربت آ جاتی ہے، جب مزدوروں میں اپنے حقوق کا شعور پیدا ہوتا ہے اور وہ اضافی قدر کے استحصال کو سمجھتے ہیں تو وہ آپس میں اتحاد کر کے کارخانوں اور دیگر پیداواری ذرائع پر قبضہ کر لیتے ہیں۔ ایسا ہونے پر ریاستی طاقت سرمایہ دار کا ساتھ دیتی ہے۔ کیوں کہ یہ ریاست سرمایہ داروں ہی کی کٹھ پتلی ہے۔ اس مقام پر پہنچ کر جدلیات اپنا کام دکھاتی ہے اور مزدور کی طاقت اور سرمایہ دار کا ٹکراؤ ہوتا ہے اور ایک زوردار/سرخ انقلاب آتا ہے، جس کے نتیجے میں مزدور سرمایہ دار کے سرمائے، کارخانے پیداواری ذرائع اور ریاست پر قبضہ کر لیتا ہے۔

مارکس نے اپنی ابتدائی تحریروں میں کہا تھا کہ ''فلسفے کا صرف یہی کام نہیں ہے کہ وہ محض دنیا کی تشریح کرتا رہے بلکہ اس کا یہ کام بھی ہے کہ وہ اس دنیا کو تبدیل بھی کرے۔'' یعنی علم اور عمل میں یک جہتی ہو۔

محنت کش طبقہ (جسے مارکس پرولتاریہ بھی کہتا ہے) ریاست پر قبضہ کرنے کے بعد ریاست کا استحصالی تشخص ختم کر ڈالتا ہے۔ عبوری طور پر پرولتاری طبقے کی ڈکٹیٹرشپ قائم ہو جاتی ہے اور وہ

اضافی قدر ختم کر کے ''مزدور کو صلاحیت کے مطابق معاوضہ دیتا ہے'' ریاست کا نظام پرولتاریوں کے ہاتھ آتے ہی ہر قسم کی عدم مساوات کا خاتمہ ہو جاتا ہے اور ہر فرد کو اپنا پیٹ بھرنے کے لیے محنت کرنا پڑتی ہے۔ سرمایہ دارانہ نظام میں صرف مزدور کام کرتے ہیں اور سرمایہ دار منافع پر عیش کرتے ہیں، مگر سوشلسٹ ریاست میں سب لوگ کام کرتے ہیں اور کوئی بھی استحصال نہیں کرتا۔ کوئی کسی کو ملازم نہیں رکھتا اور ذاتی اور محدود حد تک اثاثے رکھ سکتا ہے۔

مارکس ریاست کو صرف عبوری حد تک سلامت رکھنا چاہتا ہے لیکن جب عبوری دور پورا ہو گا، معاشرے میں انصاف قائم ہو گا اور استحصال کی جڑ اُکھڑ جائے گی تو ریاست کی بھی ضرورت باقی نہیں رہے گی۔ سوشلزم کے بعد آخری مرحلہ کمیونزم کا آئے گا، جس میں ریاست خود بخود ختم ہو جائے گی اور ''ہر آدمی سے کام اس کی صلاحیت کے مطابق لیا جائے گا اور معاوضہ اس کی ضرورت کے مطابق دیا جائے گا۔''

مذہب۔ اخلاقیات اور فن

مارکس مذہب کے روایتی تصور کو رد کرتا ہے اور مذہب کو استحصال کا ذریعہ سمجھتا ہے۔ اس کے خیال میں اقتدار پر قبضہ کرنے والوں نے مذہب کو ہمیشہ عوام کو غلام بنانے کے لیے استعمال کیا ہے۔ پچھلے زمانوں کے حکمران یا تو خود مذہبی رہنما، پروہت، ظلِ الٰہی وغیرہ بن جاتے تھے یا مذہبی پیشواؤں کو اپنے ساتھ ملا کر مذہب کو ہتھیار کے طور پر استعمال کرتے تھے۔ مزدور و محنت کش کو جنت کے خواب اور مظلوم کو آخرت میں انصاف کا لالچ دے کر انھیں کام کرتے اور ظلم سہتے رہنے کو آمادہ کیا جاتا تھا۔

مارکس مذہب کو غریبوں کے لیے افیم کا درجہ دیتا ہے، جس میں وہ حوروں، خدمت گاروں اور شہد کی نہروں کے تصور میں مدہوش رہتا ہے اور اپنے دَور میں ظلم اور استحصال کے خلاف جدوجہد نہیں کرتا ہے۔

مارکس اور دیگر جدلیاتی مادیت پسند مذہب اور خدا کو انسانی ذہن کی پیداوار سمجھتے ہیں۔ غاروں میں رہنے والے اوائلی انسان کو ہر وقت خوف رہتا تھا اور اس خوف نے کئی مافوق الفطرت ہستیوں کو جنم دیا، جن، بھوت، روح، پریاں، دیوتا سب انسانی خوف کی پیداوار ہیں جس طرح انسان نے ترقی کی تو اس کے دیوتاؤں اور روحوں نے بھی ترقی کی اور آخر خدا کا روپ دھارا۔

عام طور پر اخلاق کو مذہب سے منسلک کیا جاتا ہے لیکن مارکس نے اس تصور کو رد کرتے ہوئے اخلاقی اصولوں کو مذہب سے علاحدہ رکھا۔ نیکی اس لیے نہ کی جائے کہ یہ کسی آسمانی کتاب کا حکم ہے بلکہ نیکی اس لیے کی جاتی ہے کہ اس میں انسانی معاشرے اور نسلِ انسانی کے لیے بھلائی مضمر ہوئی ہے۔ دوسرے الفاظ میں نیکی ثواب کمانے کے لیے نہیں بلکہ انصاف کے قیام کے لیے کرنی چاہیے۔ مارکس کے نزدیک اخلاقی اقدار آفاقی نہیں ہیں۔ یہ معاشرے کی پیداوار ہیں اور معاشرے کے ساتھ ساتھ یہ بھی تبدیل ہوتی رہتی ہیں، جب معاشرے میں انصاف قائم ہوتا ہے تو لوگوں کو معاشی تحفظ ملتا ہے اور بدی کی قوتیں خود بخود ختم ہو جاتی ہیں کیوں کہ یہ معاشی ناانصافی ہی کی پیداوار ہوتی ہیں۔

فن اور جمالیات کے بارے میں بھی مارکس استحصالی معاشرے پر نکتہ چینی کرتا ہے، جس کے فن کار، شاعر اور ادیب معروضی حقائق سے منہ موڑ کر ہر وقت اپنے اندر کی قنوطیت اور الجھاؤں کو فن کا نام دے کر اُگلتے رہتے ہیں۔ فن صرف زندگی کے لیے ہو، زندگی کے غموں اور خوشیوں کے لیے ہو نہ کہ فن کار کے ذاتی مصائب کا اعلان ہو۔ فن میں فن کار جس قدر کم ہوگا اتنا ہی بہتر ہوگا۔

فن صرف وہ صحت مند ہے جو کہ عوامی مسائل اور اُمنگوں کی ترجمانی کرے۔ فن کار کی ذاتی پریشانیاں تجریدی آرٹ کا روپ دھار کر برآمد ہوں گی تو کسی کو خوشی دینے کے بجائے اُلجھنوں میں اضافہ کریں گی۔

مارکس نے فلسفے کی دنیا میں بہت سی تبدیلیاں کیں۔ روس، چین، ویت نام، کوریا، مشرقی یورپ، افریقہ اور جنوبی افریقہ کے کئی ممالک سوشلسٹ بن گئے اور یورپ، امریکہ اور ایشیا کے کئی ملکوں میں سوشلسٹ تحریکیں اور مسلح انقلابی بغاوتیں سامنے آئیں۔ دنیا واضح طور پر دو گروپوں میں تقسیم ہوگئی اور امریکہ اور روس کے مابین طویل سرد جنگ شروع ہوئی، جو سوویت یونین کے ٹوٹنے اور سوشلزم کے خاتمے تک جاری رہی۔ چین کے سوا دیگر تمام ممالک جو سوشلسٹ بن چکے تھے، دوبارہ سرمایہ دار ملک بن گئے۔

کیا سوویت یونین کا ٹوٹنا سوشلزم کی ناکامی تھی یا اس کی کوئی اور وجوہات تھیں؟ اس موضوع پر گہری تحقیق کی ضرورت ہے۔

اِرادِیت
(Voluntarism)

روسو اور کانٹ کے فلسفے نے جس رومانیت کو جنم دیا۔ وہ نہ صرف ادب اور سیاست پر چھا گئی بلکہ فلسفے پر بھی گہرے اثرات ڈالے اور ایک نیا مکتبۂ فکر ''فلسفیانہ رومانیت'' (Philosophical Romanticism) وجود میں آ گیا، جس کو ارادیت کہا جاتا ہے۔ رومانیت کا مرکزی نکتہ ''خرد دشمنی'' یعنی عقل کی دشمنی پر مبنی تھا۔

کانٹ کے فلسفے پر ہیگل نے اپنی جدلیات کی بنیاد رکھی اور یہ بات ثابت کرنے کی بھرپور کوشش کی کہ ''ذہن یا شعور ہی حقیقتِ کبریٰ یا حقیقتِ مطلق ہے اور جو کچھ بھی ہوتا ہے۔ یہ حقیقتِ مطلق کی منشاء کے مطابق ہوتا ہے۔ لہٰذا جو کچھ ہوتا ہے وہ سب صحیح اور ٹھیک ہے، اس کے نتیجے میں رجائیت یا خوش بین فکر نے جنم لیا، جس کا مطلب ہے کہ حالات و واقعات کو اُمید افزا اور دل خوش کن نکتۂ نظر سے دیکھا جائے۔ مثلاً حادثے میں کسی کا پیر ضائع ہو جائے تو شکر کیا جائے کہ ٹانگ بچ گئی یا پیر کا ضائع ہونا تو بہتر ہے کیوں کہ ہو سکتا ہے پیر کے ہوتے ہوئے وہ کوئی گناہ یا جرم کرتا جو وہ اب نہیں کر سکے گا۔

اس کے ساتھ ساتھ ہیگل کے فلسفے میں ذہن اور عقل کو ہر شے پر برتری حاصل ہے اور عقل کا مقام افضل ہے۔ اس کے برعکس ارادیت عقل کی شدید مخالف اور قنوطی (Pessimist) سوچ کی مالک ہے، جس کا مطلب ہے کہ زندگی دُکھ، تکلیف، رنج والم کا مجموعہ ہے۔ لہٰذا ہر واقعہ اور

حالات میں تغیر انسان کے لیے بدتری لے کر آتا ہے۔ قنوطی فکر میں ہمیشہ اشیاء کے منفی اور تاریک پہلو کو مدِ نظر رکھا جاتا ہے۔ مثلاً اگر کسی آدمی کو کوئی بڑی کامیابی ملی ہے تو یہ اس کے لیے نقصان دہ ہے کیوں کہ اس کے بعد ملنے والی ناکامیاں زیادہ عذاب دیں گی۔

شوپن ہار اور نٹشے ارادیت کے دو بڑے مفکر تھے، جن کی زندگی اور فلسفے کا نچوڑ ذیل میں دیا جاتا ہے۔

آرتھر شوپنہار

آرتھر شوپنہار سن 1788ء میں جرمنی کے شہر ڈانزگ میں پیدا ہوا۔ اس کا والد ایک مال دار تاجر تھا جس کی بدولت شوپن ہار کو بچپن سے ہی کاروباری معاملات کے متعلق اچھی خاصی آگاہی حاصل ہو گئی۔ سن 1807ء میں شوپن ہار کے والد کے خودکشی کرنے کے بعد ماں اس کی پرورش کرنے لگی۔

شوپن ہار کی ماں ایک ذہین خوب صورت اور عاشق مزاج عورت تھی اور اپنے وقت کی بڑی ادیبہ اور مضمون نگار تھی۔ شوپن ہار کے والد کے انتقال کے بعد اس کی ماں کو گویا کھلی چھٹی مِل گئی اور وہ دِل کھول کر معاشقے کرنے لگی۔

ان باتوں کا شوپن ہار پر نہایت بُرا اثر پڑا اور وہ اکثر اپنی ماں سے جھگڑتا رہتا۔ ماں نے اس کے طنز اور نکتہ چینی سے تنگ آ کر اس کے لیے الگ رہائش کا بندوبست کر دیا۔ اب وہ دونوں محض دنیاداری کے لیے کبھی کبھار مِلا کرتے۔ اس طرح شوپن ہار باپ اور ماں دونوں کی محبت سے محروم رہا۔

ڈانزگ کے بعد جب شوپن ہار اور اس کی والدہ نے ویمر میں رہائش اختیار کی تو وہاں کی ادبی محفلوں میں شوپن ہار کی گوئٹے سے ملاقات ہوتی رہتی تھی۔ گوئٹے نے شوپن ہار میں ذہانت کے جوہر دیکھ لیے تھے اور وہ اس کی تربیت کرنے لگا۔

شوپن ہار نے گوئٹے سے بہت کچھ سیکھا لیکن اسے اپنے استاد کی رجائیت اور خوش بینی (Optimism) سے سخت اختلاف تھا۔

یونی ورسٹی میں تعلیم حاصل کرنے کے دوران اس نے فشٹے کے فلسفیانہ لیکچر سنے اور افلاطون، کانٹ اور اپنشدوں کا بغور مطالعہ کرنے لگا۔

شوپن ہار کی طبیعت میں سخت بیزاری اور قنوطیت تھی جو پوری عمر اس کے ساتھ رہی، عشق

کیا تو وہ بھی ناکام رہا اور ساری زندگی عورت کو بُرا بھلا کہتے ہوئے گزار دی۔ اس دوران جرمنی میں نپولین کے خلاف بغاوت ہوئی۔ شوپن ہار نے کسی بکھیڑے میں پڑنے کے بجائے فلسفے کے مطالعے اور کتاب لکھنے کو ترجیح دی۔ سن 1813ء میں اس نے کتاب

"On the four fold root of the Principle of sufficient reason."

لکھی جو چھپ تو گئی لیکن کوئی اسے خریدنے یا پڑھنے کے لیے تیار نہیں تھا لیکن گوئٹے نے اس کتاب کو پڑھا اور مبارکباد کا خط بھی لکھا۔ سن 1816ء میں شوپن ہار کی دوسری کتاب On vision and colours چھپی مگر اس کتاب کو پڑھنے والے بھی اُنگلیوں پر گنے جا سکتے تھے۔

یہ دور ہیگل کا دور تھا۔ جرمنی کی تمام یونی ورسٹیوں اور عام لوگوں میں ہیگل بے انتہا مقبول تھا۔ ہر جگہ اس کے فلسفے اور لیکچروں کا چرچا تھا۔ شوپن ہار نے اپنی کتابوں میں پہلا حملہ ہیگل اور اس کے فلسفے پر ہی کیا۔ ہیگل کے لیے وہ لکھتا ہے: ''گزشتہ 20 سال سے دیکھ رہا ہوں کہ دنیا کہہ رہی ہے کہ ہیگل بڑا فلسفی ہے، مگر میرے خیال میں تو وہ شیطان صفت حیوان ہے جس نے علم کا لبادہ پہن لیا ہے۔'' اس نے ہیگل کے علاوہ یونی ورسٹی میں پڑھانے والے اساتذہ پر بھی سخت تنقید کی اور انھیں سوفسطائی کہہ کر مخاطب کیا۔ نتیجے میں فلسفہ پڑھانے والے اساتذہ اور شاگرد اس کے مخالف ہو گئے اور اس کی کتاب پڑھنے کے لیے کوئی بھی تیار نہیں تھا۔ سن 1814ء سے 1818ء تک وہ ڈریسڈن میں رہا اور اپنی مشہور کتاب "The world as will and Idea" لکھ کر مکمل کی۔ اس نے برلن میں فلسفے پر لیکچر بھی دیئے لیکن اس کے لیکچر سننے والا کوئی بھی نہیں تھا۔ کیوں کہ شوپن ہار کے لیکچر کا جو وقت مقرر کیا جاتا عین اسی وقت ہیگل لیکچر دیا کرتا۔ صاف ظاہر ہے اس صورت میں نتیجہ کیا نکلتا ہو گا۔ انھوں نے سن 1836ء میں "On the will in nature" شائع کرائی، جس پر اسے ناروے میں انعام بھی دیا گیا۔ اس نے بعد میں بھی کئی مضمون اور مقالے لکھے۔

آہستہ آہستہ لوگ شوپن ہار کی طرف متوجہ ہونے لگے اور آخر کار اسے پڑھنے اور سننے بھی لگے اور شوپن ہار مشہور ہونے لگا۔ اپنی زندگی کے آخری دس سال شوپن ہار نے انتہائی خوش باش گزارے۔ کیوں کہ اس کے فلسفے کو یونی ورسٹیوں سے لے کر عام آدمی تک سے بڑی پذیرائی مل رہی تھی۔ سن 1860ء میں شوپن ہار کا انتقال ہو گیا۔

شوپن ہار ایک نڈر اور بے باک فلسفی تھا اور اپنا نکتہ نظر واضح طور پر لکھنے کا فن جانتا تھا۔

اسے اس بات کی قطعی پروانہیں تھی کہ دوسرے اس کے بارے میں کیسے خیالات رکھتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اس کے فلسفے میں دانش کے ساتھ ساتھ تنقید وطنز کے بے شمار بھالے ایستادہ ہیں۔

کانٹ نے اپنے فلسفے میں کہا تھا کہ ہم عقل اور سائنس کے ذریعے اشیاء کے صرف ظاہری یعنی Phenomenon کو سمجھ سکتے ہیں لیکن اشیاء کے جوہر یا Noumenon کو نہیں سمجھ سکتے۔

ہیگل نے کانٹ کے مظہر Phenomenon کو آگے بڑھاتے ہوئے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی کہ ذہن یا عقل ہی وہ طاقت ہے جو اس کائنات کی ہر شے پر حاوی ہے اور سب کچھ ان کی منشاء کے مطابق ہوتا ہے۔

شوپن ہار نے بھی کانٹ کی حقیقت یا اصلیت (Noumenon) کو بنیاد بنا کر اپنا فلسفہ پیش کیا اور عقل پر کڑی تنقید کی اور اس کو ارادے (Will) کا غلام کہا۔ ''کہتے ہیں کہ انسان ایک باشعور جان دار ہے اور اس کا جوہر شعور اور فکر پر مشتمل ہے۔ سب سے پہلے اس قدیم، عالمی اور بنیادی غلطی کو مٹانا مناسب ہوگا۔ یہ دعویٰ بالکل غلط ہے اور ساری غلط فہمیاں اس ایک جھوٹ سے پھوٹ نکلتی ہیں۔ اصل میں شعوری عقل کی تہہ میں شعوری یا غیر شعوری ارادہ (Will) پوشیدہ ہے جو کہ ایک جوہرِ حیات ہے اور ہمیشہ معروفِ عمل رہتا ہے اور خود بخود مصروف رہتا ہے۔ کہنا یوں چاہیے کہ جس طرح یہ ارادہ سرکش اور حکمران آرزو کا دوسرا نام ہے۔ بظاہر تو ایسا دیکھنے میں آتا ہے کہ عقل، ارادے کی رہنمائی کرتا ہے۔ لیکن حقیقت اس کے برعکس ہے۔ اصل میں ارادہ عقل پر حکمرانی کرتا ہے اور عقل ارادے کی حکم عدولی کر ہی نہیں سکتی۔ [1]

بالفاظِ دیگر عقل کا کام ارادے کی منشاء اور خواہش کے مطابق کام کرنا ہے۔ ارادے کی غیر منطقی اور فضول خواہشات کو پورا کرنے کے لیے عقل دلائل ڈھونڈتی ہے۔ مذہب، فلسفے اور اخلاقیات کو استعمال کرتے ہوئے ارادے کی منشاء کو پورا کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ بظاہر ایسا لگتا ہے کہ کوئی کام عقلی بنیادوں پر کیا جا رہا ہے مگر دراصل وہ ارادے کی تکمیل کے لیے رچایا گیا ناٹک ہوتا ہے۔ ارادہ نباتات، حیوانات اور انسانوں میں ہر جگہ کارفرما ہے اور ان کی ہر قسم کی نقل وحرکت کا محرک بنتا ہے۔ نباتات اور حیوانات میں یہ جبلت کی شکل میں ہے۔ ارادہ ہر وقت کام کرتا رہتا ہے اور یہ تھکتا بالکل نہیں ہے۔ عقل تھک جاتی ہے۔ انسان سو جاتا ہے لیکن ارادہ ہر وقت جاگتا ہے اور ہر

1-The World as will and Idea, Vol:1, Page:30.

وقت کام کرتا ہے۔ ارادہ سو جائے تو انسان کی موت واقع ہو جاتی ہے۔

شوپن ہار کے فلسفے کی تفصیل میں گئے بغیر اس کے چند مختصر اقتباسات دیئے جاتے ہیں، جن سے ارادے کی ماہیت بڑی حد تک واضح ہو جائے گی۔

☆ دیگر نے کہا ہے کہ ارادہ طاقت کی قسم ہے۔ شوپن ہار کا کہنا ہے کہ طاقت ارادے کا صرف ایک روپ ہے۔

☆ ہیوم نے سوال کیا کہ علت و معلول کا قانون کیا ہے؟ جواب ہے کہ وہ ارادہ ہے۔

☆ انکار، کشش، ترکیب، انتشار، مقناطیسیت اور بجلی وغیرہ سب ارادے کے مختلف روپ ہیں۔

☆ ارادہ زندہ رہنے، باقی رہنے اور ہمیشہ رہنے کی شدید خواہش ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ارادہ سب سے زیادہ زور نسل بڑھانے پر دیتا ہے۔ پودے بے شمار بیج پیدا کرتے ہیں۔ جانوروں اور انسانوں میں ارادہ جبلت بن جاتا ہے اور عقل کو ہتھیار کے طور پر استعمال کر کے نسل کے بڑھاوے اور بقاء کے لیے استعمال کرتا ہے۔ جنسِ مخالف کی طرف کشش اور محبت انسان میں پودوں اور جانوروں سے کہیں زیادہ ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ محبت اور میلاپ کو کسی طرح نظر انداز نہیں کر سکتا۔ جنسی قوت کا خاتمہ انسان کو موت کے قریب پہنچا دیتا ہے۔ اولاد کی خواہش اور اولاد کا تحفظ، انسان کی شدید خواہش ہے اور انتہائی خوشی بھی۔

☆ فطرت/ارادے کو یہ پروا نہیں ہے کہ شادی کے بعد میاں بیوی خوش رہتے ہیں یا نہیں، اصل مقصد بچے پیدا کرنا ہے۔ یہ مقصد حاصل کرنے کے لیے ارادہ، عشق، محبت، شادی اور خاندان وغیرہ کے چکر چلا کر عورت اور مرد کو قریب کرتا ہے۔ اکثر عشقیہ شادیاں ناکام ہو جاتی ہیں کیوں کہ عورت اور مرد کو ملانے کے بعد ارادے کی دل چسپی ختم ہو جاتی ہے اور محبت کی شادی ناکام ہو جاتی ہے۔ محبت تو ارادے کا جال ہے جس سے وہ نسل بڑھانے کے لیے عورت اور مرد کو شکار کرتا ہے۔ نسل پیدا ہونے کے بعد محبت کا فریب ختم ہو جاتا ہے۔ دنیا کے بڑے بڑے شاعر اور فن کار محض اس لیے بڑے شاعر اور فن کار رہے کہ انھیں محبوبہ نہ ملی اور جن کو محبوبائیں مل گئیں اور بچے پیدا کیے، ان سے شاعری بھول گئی یا پھر معمولی درجے کی شاعری کرنے لگے۔

ارادہ "شر" ہے

ارادہ خیر ہے یا شر، نیکی ہے یا بدی۔ شوپن ہار اس کو شر اور بدی کہتا ہے کیوں کہ ارادہ ہر

وقت اپنی خواہش اور تمنا کو پورا کرنے کے لیے کوشاں رہتا ہے لیکن اگر ایک خواہش پوری ہوتی ہے تو دوسری خواہش پیدا ہو جاتی ہے اور یوں انسان ساری زندگی سکھ کا سانس نہیں لیتا۔ ارادہ ہر وقت انسان کو بے چینی، بے قراری اور اضطراب میں مبتلا رکھتا ہے۔ انسان ساری عمر خواہشوں کے لامتناہی سمندر میں غوطے کھاتا رہتا ہے اور آخر کار مر جاتا ہے۔ اگر شدید خواہش پوری ہو جاتی ہے یا کسی طویل سفر کے بعد منزل ملتی ہے تو انسان پر وقتی خوشی کے فوراً بعد اُداسی اور پریشانی کا حملہ ہوتا ہے اور انسان پھر کسی دوسری خواہش کی تکمیل میں جت جاتا ہے۔

خواہشوں کی تکمیل ارادے کی بھوک کو محض وقتی طور پر ختم کرتی ہے اور ارادہ دوبارہ خواہش کی تکمیل کے لیے اُکساتا ہے۔ یوں یہ تکلیف دہ اور عذاب ناک صورتِ حال انسان کا مقدر ہے۔ انسان کو خواہشات کا غلام بن کر ان کی تکمیل کے لیے عذاب بھگتنے ہیں۔ اپنی زندگی کے آخری لمحے تک۔ ارادے کو کبھی بھی انسان پر رحم نہیں آتا۔ وہ کبھی بھی انسان کو سکون سے بیٹھنے نہیں دیتا۔ ایسا ارادہ انسان کے لیے نیک کس طرح ہوسکتا ہے۔ یہ تو بدی ہے، شر ہے، جس نے انسان پر مصیبتوں، پریشانیوں، تکلیفوں، عذابوں اور اذیتوں کے پہاڑ توڑ ڈالے ہیں۔

یہ مصیبتیں، عذاب اور دُکھ ان کے لیے زیادہ اور شدید ہوتے ہیں، جن کے پاس عقل زیادہ ہوتی ہے۔ پودے، عذاب محسوس نہیں کرتے ہیں کیوں کہ ان میں عقل نہیں ہے۔ چند جانور تھوڑا سا دُکھ اور پریشانی محسوس کرتے ہیں لیکن انسان سب سے زیادہ عذاب محسوس کرتا ہے، کیوں کہ اس میں شعور زیادہ ہے، جتنی عقل زیادہ اتنا دُکھ زیادہ، جتنا شعور زیادہ طاقت ور اتنا ہی شدید دُکھ۔

ارادہ ہر انسان میں انفرادی ہے۔ اس لیے افراد میں، معاشروں میں، ممالک میں ارادوں کا ٹکراؤ ہوتا رہتا ہے، جس کے نتیجے میں ہر طرف جنگ و جدل کا ماحول رہتا ہے۔ چاروں اطراف کشمکش چھائی ہوئی دکھائی دیتی ہے اور انسان عذاب کی زنجیروں میں جکڑا رہتا ہے۔ یہ سب کچھ اس شر پسند ارادے کی اندھی خواہش کا نتیجہ ہے۔ اس عذاب سے نجات کے لیے انسان مر جاتا ہے لیکن زندگی ہر موت پر مسکراتی ہے اور خودکشی پر قہقہے لگاتی ہے۔ موت بھی انسان کو نجات نہیں دِلا سکتی، عذاب انسان کا آفاقی مقدر ہے۔ ہاں البتہ ایک طریقہ ہے ارادے کو شکست دینے کا، وہ یہ ہے کہ انسان شادی نہ کرے، بچے پیدا نہ کرے اور ارادے کو ہمیشہ ہمیشہ کے لیے شکست دے ڈالے۔

کیا نجات ممکن ہے؟

کیا اس شر پسند ارادے سے کسی طرح نجات ممکن ہے یا انسان کے پاس صرف اجتماعی خودکشی ہی آخری راستہ ہے۔

نجات ممکن ہے، ویسے تو عقل ارادے کے طابع ہے لیکن اگر عقل ارتقا کے ذریعے ایک خاص مقام تک پہنچ جائے تو پھر وہ وقتی طور پر ہی سہی مگر ارادے کی طابع داری سے انکار کر دیتی ہے۔ اور آگے چل کر عقل اور شعور کی پختگی والی منزل پر عقل ارادے کو ضابطے میں بھی رکھ سکتی ہے، جب یہ منزل انسان کو حاصل ہو جائے تو پھر اس انسان کو گویا نروان مل گیا اور یہ اس ارادے کے جابرانہ تسلط سے آزادی ملتے ہی خوشی کے دروازے کھل جاتے ہیں۔

علم کی گہرائی اور عقل کی بلندی ارادے کو معتدل بنا سکتی ہیں۔ باالفاظِ دیگر نفس کو تہذیب سکھا سکتے ہیں۔ گہرے غور و فکر اور ارادے کی کارگزاریوں کو سمجھنے کے بعد اسے مطہر اور پاک بنایا جا سکتا ہے، جب عقل ارادے کے تسلط سے نکل جاتی ہے تو وہ معروضی اور خارجی طور پر اشیاء کا مطالعہ کرنے کے لائق ہوتی ہے۔ اس صورت میں اشیا کی اصل حقیقت واضح ہوتی ہے کیوں کہ اس میں ارادے کا مفاد اور مداخلت نہیں ہوتی ہے۔ اس منزل پر پہنچ کر انسان کو سکونِ قلب حاصل ہو جاتا ہے اور اسے نروان مل جاتا ہے۔

اشیاء کو مکمل طور پر معروضی کیفیت میں سمجھنے والے انسان بہت کم ہوتے ہیں۔ ان کے مشاہدے اور فکر میں ارادہ مکمل طور پر خاموش رہتا ہے۔ یہ انسان انتہائی ذہین اور عاقل ترین ہوتے ہیں ان کو Genius کہا جاتا ہے۔

جینئس دانائی کی انتہائی منزل پر پہنچے ہوئے ہوتے ہیں، جو اس بات پر قادر ہوتے ہیں کہ ارادے کو اپنی مرضی کے مطابق خاموش کرا سکتے ہیں۔ یہ ارادے کے فاتح اعظم ہوتے ہیں۔ ارادے کی مداخلت انسان کو معمولی اور فوری فوائد والے مخصوص کاموں کے لیے اُکساتی ہے۔ ارادہ کبھی بھی انسان کو جامع، عام اور دُور اندیشی والا کام کرنے نہیں دیتا لیکن انتہائی ذہین یا جینئس لوگ ارادے کے مداخلت نہ کرنے کے باعث ہمیشہ دُور اندیشی اور عالمی اہمیت والے کام اور باتیں کرتے ہیں۔ وہ عام انسان کے فوری مفاد (Immediate Interest) کی بات نہ کرنے کی وجہ سے عام انسان کے عتاب کا شکار بھی ہو جاتے ہیں۔ عام انسان جینئس کی بات سمجھ نہیں سکتا اس لیے

وہ جینئس کو پاگل قرار دے کر پاگل خانے میں بند کر دیتا ہے یا پھر اس کا جانی دشمن بن کر اسے فنا کرنے کی کوشش کرتا ہے۔

فن کا مقصد اور نصب العین یہ ہے کہ وہ انسان کو ارادے کے تسلط سے آزادی دلائے۔ فن کے سارے روپ انسان کو خوشی اور مسرت صرف اسی وقت دے سکتے ہیں جب یہ دیکھنے والے کے ارادے کے بجائے دانش اور وجدان کو چھوتے ہیں۔ ارادے یا مفاد کو چھونے والا فن انسان کو کبھی بھی خوشی نہیں دے سکتا۔

ویسے تو تمام فنون انسان کو ارادے کی کشمکش سے نجات دِلاتے ہیں، لیکن ان میں انسانی ذہن کو بلند ترین مقام پر پہنچانے کی خوبی جو موسیقی میں ہے، یہ کسی دوسرے فن میں نہیں ہے۔ کیوں کہ موسیقی براہِ راست انسان کے احساس کو متاثر کرتی ہے۔

شوپن ہار آخر میں انسان کو یہ اہم مشورہ دیتا ہے کہ وہ ارادے کی غلامی سے نجات حاصل کرنے کے لیے ارادے کو للکارے اور اس کے خلاف اعلانِ جنگ کرے۔ اس کو علم، عقل، مجاہدے، نفس کشی، رہبانیت اور دیگر طریقوں سے مطیع اور فرماں بردار بنائے۔ آخر انسان کب تک اس رنج والم کی کیفیت میں رہے گا؟ کب تک عذابوں کی اذیت میں پستا رہے گا۔ اسے ہمت کر کے ارادے کے سرکش گھوڑے کو لگام ڈالنی چاہیے۔

فریڈرک نٹشے

ارادیت کا دوسرا بڑا شارع، نٹشے جرمنی کے ایک گاؤں میں سن 1844ء میں ایک عیسائی پادری کے گھر میں پیدا ہوا۔ ابھی وہ کم سن ہی تھا کہ اس کے باپ کا انتقال ہو گیا اور اس کی پرورش خاندان کی عورتوں نے کی۔ بہت زیادہ لاڈ پیار کی وجہ سے نٹشے کی طبیعت میں نسوانی قسم کی نفسیات و نزاکت آ گئی۔

مطالعے اور موسیقی کا شوق بچپن سے ہی تھا۔ وہ انجیل اس قدر خوب صورت اور رِقت آمیز لہجے میں پڑھتا تھا کہ سننے والے کی آنکھوں میں آنسو آ جاتے تھے۔

نٹشے جب قدرے بڑا ہوا تو اس کا مذہب سے ایمان اُٹھ گیا اور خدا کے روایتی تصور کے خلاف واشگاف الفاظ میں بولنے لگا، جس کی وجہ سے اس کی والدہ سخت ناراض ہو گئی۔

اس زمانے میں جرمنی، نپولین کے خلاف صف آرا ہو چکا تھا اور نٹشے کو زبردستی فوج میں بھرتی کر لیا گیا۔ فوج میں گھڑسواری کرتے ہوئے وہ گھوڑے سے گر گیا اور اسے سینے پر ایسی چوٹیں لگیں کہ وہ پوری عمر ٹھیک نہ ہو سکیں۔

نٹشے نے یونی ورسٹی سے لسانیات میں ڈاکٹریٹ کی ڈگری حاصل کی اور وہیں لسانیات پڑھانے لگا۔ اسی دوران اسے شوپن ہار کی کتاب "The World as will and Idea" پڑھنے کا موقع ملا اور وہ شوپن ہار کے فلسفۂ ارادیت سے بے حد متاثر ہوا۔ مشہور موسیقار واگنر

سے نٹشے کی دوستی تھی، جس سے وہ کئی باتوں پر اختلاف بھی رکھتا تھا۔ اسی دوران نٹشے نے کتاب "Richard Wagner in Bayrenth" لکھی۔

واگنر بدھ مت کا پرستار یعنی عدم تشدد، امن، ہمدردی اور مساوات وغیرہ کا دلدادہ تھا۔ یہ بات نٹشے کو پسند نہ آئی اور وہ واگنر سے الگ ہو گیا۔ کیوں کہ نٹشے کو عیسائیت اور بدھ مت کے عجز و انکسار سے سخت چڑ تھی۔

جسمانی کمزوری نے نٹشے کو طاقت کا پرستار بنا ڈالا اور وہ ہر قسم کی کمزوری کی مذمت اور قوت کی مدح سرائی کرنے لگا۔

نٹشے سن 1879ء میں شدید بیمار ہو گیا اور اس نے وصیت کر دی کہ اس کے تابوت کے نزدیک کسی بھی پادری کو آنے نہ دیا جائے اور اسے ایک کافر کی حیثیت سے قبر کے اندر داخل کر دیا جائے لیکن نٹشے زندہ بچ گیا۔

نٹشے نے دونا کام عشق کیے، جن کے نتیجے میں اسے عورت ذات سے شدید نفرت ہو گئی۔ اسی وجہ سے نٹشے نے جابجا عورت کو برا بھلا کہا ہے۔ سن 1883ء میں اس کی مشہور تصنیف "Thus Spake Zarathustra" شائع ہوئی جس کی محض چالیس پچاس کا پیاں ہی فروخت ہوئیں اور کسی بھی قاری نے تعریف و توصیف بالکل نہ کی جس کا نٹشے کو بہت افسوس ہوا۔

''طاقت'' نٹشے کے فلسفے کا بنیادی نکتہ ہے، جس کے حصول کی خاطر ''ارادہ'' ہر وقت سرگرداں ہے۔

سن 1888ء میں جسمانی طور پر کمزور مگر ذہنی طور پر انتہائی طاقت ور اور جینئس فلسفی پر پاگل پن کا دورہ پڑا اور وہ اپنا ذہنی توازن کھو بیٹھا، جب اسے پاگل خانے میں داخل کرانے کے لیے لے کر جا رہے تھے تو اس کی بوڑھی ماں آ گئی اور اسے اپنے ساتھ رکھ لیا۔ وقتی طور پر ذہنی حالت ٹھیک ہوتی لیکن پھر بگڑ جاتی۔ آخر سن 1900ء میں اسی کیفیت میں انتقال کر گیا۔

نٹشے نے اپنی زندگی میں مندرجہ ذیل کتابیں اور مقالے لکھے۔

1-The birth of tragedy from the spirit of Music.
2-Untimely Meditation / Considerations.
3-Richard Wagner in Bayreuth.
4-Human all to Human.
5-The Dawn of day.

6-Joy Wisdom.
7-Thus Spake Zarathustra.
8-Beyond good and Evil.
9-A Genealogy of Morals.
10-The will to Power.

آخر الذکر کتاب نٹشے کے انتقال کے بعد شائع ہوئی۔

طاقت کی خواہش

شوپن ہار نے اپنی کتاب میں اس بات پر زور دیا تھا کہ ارادہ بقاء کے لیے شدت کے ساتھ جدوجہد کرتا ہے اور بقایا زندہ رہنے کی خواہش ہی ارادے کا نصب العین ہے، نٹشے نے اس کی بات کو آگے بڑھاتے ہوئے کہا:

''دنیا طاقت کے حصول کا ارادہ ہے اور بس'' یعنی ارادہ وجود کی بقا سے بھی زیادہ طاقت چاہتا ہے اور ہر وقت مصروفِ عمل رہتا ہے۔ علم اور عقل بے شک ارادے کے اشاروں کے غلام ہیں اور یہ ارادے کو طاقت حاصل کرنے میں مدد کرتے ہیں۔ علم اسی واسطے حاصل کیا جاتا ہے تا کہ کسی مخصوص شے پر تصرف حاصل ہو جائے۔

نٹشے اس بات کو رَد کرتا ہے کہ کوئی علم، روشنی اور لیاقت کے لیے حاصل کیا جاتا ہے لیکن وہ کہتا ہے کہ لاشعوری طور پر ذہن علم کو بھی ہتھیار کے طور پر استعمال کرتا ہے، تا کہ تسخیر کر سکے۔

نٹشے خوشی اور غم کو بھی اپنے مخصوص فلسفے کی نگاہ سے دیکھتا ہے۔ یعنی خوشی صرف اسی وقت حاصل ہوتی ہے، جب انسان کو طاقت حاصل ہوتی ہے۔ غم اس وقت ملتا ہے جب طاقت کے حصول میں ناکامی ہوتی ہے۔ طاقت نٹشے کے فلسفے کا اہم اور بنیادی نکتہ ہے۔ سیاست اور اخلاقیات کے ساتھ ساتھ وہ ہر جگہ ارادے کو طاقت کے حصول کے لیے سرگرداں دیکھتا ہے۔

فوق الانسان (Superman)

شوپن ہار کا ارادہ زندگی کی بقا کا ارادہ ہے، لیکن نٹشے کا ارادہ طاقت کا ارادہ ہے۔ زندگی کے ارادے یا بقاء کی خواہش سے عام لوگ پیدا ہوتے ہیں۔ ارادہ فطرت بن کر عام اور معمولی انسانوں کا انبوہ پیدا کرتا ہے تا کہ وجود باقی رہے۔

نٹشے کا کہنا ہے کہ نسلِ انسانی کی بھلائی اور نجات اسی میں ہے کہ وہ فوق الانسان (Superman)

پیدا کرے۔ یہ طاقت ور ترین اور ذہین ترین انسان ہوں گے جو ارادے کو شکست دیں گے اور اسے غلامی پسند انسان پیدا کرنے سے روک سکیں گے۔

ارادے کا اصل مقصد ہی فوق الانسان پیدا کرنا ہے۔ عام انسان پیدا کرنے سے کوئی مقصد حل نہیں ہوتا۔ بالفاظِ دیگر انسان منزل نہیں بلکہ راستہ ہے یا ارتقائی عمل کی ایک کڑی ہے۔ فوق الانسان پیدا کرنے کے لیے بہترین انسانوں کے گروہ پہلے سماج میں مروجہ روایتی، اخلاقی اقدار اور سماجی تنگ نظری سے بغاوت کریں گے اور نئے اخلاقی ضابطے ترتیب دیں گے۔ یہ بہترین انسان سب سے پہلے عیسائیت کے تخلیق کردہ غلامانہ قسم کے اخلاقی معیاروں کو پاش پاش کریں گے۔

نٹشے نے فوق الانسان کے اوصاف کچھ اس طرح بتائے ہیں۔ اس میں گوئٹے اور نپولین دونوں کی خصوصیات ہوں گی یعنی جنگجو، بہادر اور اعلیٰ تخلیق کار۔ وہ ایک بلند درجہ تہذیب یافتہ، ہر قسم کے جسمانی فنون کا ماہر، طاقت ور لیکن قوتِ برداشت کا مالک وغیرہ وغیرہ ہوگا۔

فوق الانسان ہر قسم کی اخلاقی پابندیوں سے مبرّا ہے کیوں کہ اخلاقی پابندیاں صرف عام انسانوں کے لیے ہوتی ہیں جو بے وقوفوں کے ٹولے ہیں۔ فوق الانسان خود ہی بھلائی اور خود ہی منصف بھی ہے۔ اسے خطرات سے محبت ہوتی ہے اور مقصد حاصل کرنے کے لیے جنگ و جدل، خوں ریزی اور تباہی پھیلانے سے گھبراتا نہیں ہے۔

اقتدار کا حق صرف فوق الانسان کو ہے کیوں کہ وہ سب کی بھلائی کا سوچتا ہے وہ جینئس ہے اور صرف اسے ہی حکمرانی کرنے کا حق ہے، جیسا کہ فوق الانسان کو عام لوگ ووٹ کے ذریعے منتخب نہیں کرتے اسی لیے نٹشے جمہوریت کا سخت مخالف ہے اور کہتا ہے کہ اکثریت کا فیصلہ غلط اور بے ہودہ ہوتا ہے۔ فوق الانسان کی غیر موجودگی میں جمہوریت کے بجائے اشرافیہ (Aristocracy) کی حکومت ہونی چاہیے۔

فوق الانسان اعلیٰ مقاصد کے حصول کی خاطر اپنے نفس پر اور بوقتِ ضرورت دوسروں پر تشدد کرنے سے بھی نہیں گھبراتا ہے۔ اس کے لیے ایسا کرنا جائز ہے کیوں کہ بڑے مقاصد کے حصول کی خاطر قربانیاں بھی بڑی ہی دینا پڑتی ہیں۔[1]

(۱)۔ نٹشے کا فوق الانسان ابھی تک تو پیدا نہیں ہوا ہے۔ البتہ اس کے فلسفے کے دو بڑے مداح پیدا ہوئے جنھوں نے دنیا کو تباہ و برباد کر ڈالا۔ یعنی مسولینی اور ہٹلر

زرتشت بولتا ہے

"Thus Spake Zarathustra" اس کی بہترین تخلیق ہے جس میں وہ فلسفی کم اور شاعر زیادہ دکھائی دیتا ہے۔ خیال کی شدت کو قلم کی روانی سے ایسا روپ دیا ہے کہ قاری حیران سے زیادہ پریشان ہو جاتا ہے:

مَیں ڈرتا ہوں

مَیں عیسیٰؑ کا دشمن ہوں

سارے خدا مر گئے ہیں، اگر وہ زندہ ہوتے

تو مَیں کیسے برداشت کرتا کہ میں خدا نہ ہوتا؟

خطرات میں جیو

آتش فشاں پہاڑوں کے،

دامن میں گھر بناؤ

مَیں اتنا چالاک کیوں ہوں،

مَیں اتنا دانش مند کیوں ہوں،

آؤ اور دانش مندی مجھ سے چھین لو،

آؤ اس ہوشیاری سے میری جان چھڑاؤ

نٹشے کی شاعری میں سرکشی، تکبر اور الحاد ہے اور وہ یہ سب کچھ دانستہ کرتا ہے۔ زرتشت، نٹشے کا پسندیدہ کردار (Ideal) ہے جو فوق الانسان ہے اور ہر قسم کی اخلاقی اقدار سے ماورا ہے۔☆

فلسفہ اخلاق

اپنے فلسفہ اخلاق میں نٹشے کہتا ہے کہ اخلاقیات کی دو قسمیں ہیں:
امراء کی اخلاقیات اور غلاموں کی اخلاقیات۔

ا۔ اخلاقیات اِمراء (Master-Morality)

اس سے مراد یہ ہے کہ اشرافیہ یا آزاد اور طاقت ور کے نزدیک وہ سب کچھ صحیح ہے جس

☆ زرتشت کا تصور نٹشے نے قدیم ایرانی مذہب اور اس کے پیغمبر زرتشت سے لیا ہے۔

سے اس کا مفاد پورا ہو۔ بہادری، طاقت، ذہانت اور آزادی وغیرہ اخلاقیاتِ امراء میں نیکی کا درجہ رکھتے ہیں۔

۲۔ غلامانہ اخلاقیات (Slave-Morality)

بے بس اور کمزور لوگوں کے نزدیک اخلاقیات وہ ہے جو کہ انھیں امیروں سے بچا سکے اور امیروں کو پابند کر سکے۔ ہمدردی، شفقت، رحم اور انکسار، مساوات وغیرہ، اس قسم کی اخلاقیات کے لیے نیکیاں ہیں، جیسا کہ امراء کی اخلاقیات غلامانہ اخلاقیات کے خلاف ہے لہٰذا ان کے نزدیک نیکی کے بجائے بدی ہے۔ غلامانہ اخلاقیات کے خلاف ہیں لہٰذا ان کے نزدیک نیکی کے بجائے بدی ہے۔ غلامانہ اخلاقیات کو نٹشے غول یا ریوڑ کی اخلاقیات (Herd-Morality) کا نام بھی دیتا ہے۔
کمزور، جیسا کہ طاقتور سے خوف زدہ ہوتے ہیں، اس لیے اس قسم کی اخلاقیات پر زور دیتے ہیں۔

اخلاقیات کا تاریخی تجزیہ کرتے ہوئے نٹشے کہتا ہے کہ تاریخ میں ہر جگہ پر اخلاقیاتِ امراء اور غلامانہ اخلاقیات کا ٹکراؤ ہوتا رہا ہے اور جیسا کہ غلام تعداد میں زیادہ ہیں لہٰذا انھوں نے اپنی غلامانہ سوچ اور اخلاقیات کو مذہب یعنی عیسائیت میں بدل ڈالا۔ نٹشے کہتا ہے کہ ''عیسائیت طاقت ور لوگوں کو برباد بنانے، ان کے جوش وخروش کو کم کرنے اور ان کے متکبرانہ اعتماد کو ضمیر کی بے چینی میں تبدیل کرنے کی کوشش کرتی رہتی ہے۔''

نٹشے عیسائیت کی اس اخلاقیات کا سخت مخالف ہے جو فوق الانسان بننے کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ ہے۔ محبت، رحم دلی، ہمدردی کا درس دینے والی خواہ عیسائیت ہو یا کوئی دوسرا مذہب یا فلسفہ نٹشے اس کا دشمن ہے۔ جنگ وجدل، جاہ وجلال، تکبر ودہشت وغیرہ نٹشے کے پسندیدہ روپ ہیں۔

جمالیات / فلسفہ فن

نٹشے نے جمالیات یا فن کے فلسفے کی ابتدا ''The birth of tragedy'' لکھ کر کی۔
یہاں بھی اس کا طاقت واخلاقیات کا فلسفہ مصروفِ عمل ہے۔
المیہ (Tragedy) دو قسم کی ہے۔

رومانوی یا دیونیسی

(Dionesis) جس میں جوش وخروش اور شدید جذبات کا اظہار کیا جاتا ہے۔

کلاسیکی یا اپولونی

(Appollonian) جس میں ضبطِ نفس اہم ہے۔ نٹشے دیونیسی قسم کے فن کو ترجیح دیتا ہے، جس میں سکون اور ٹھہراؤ کے بجائے جوش اور ولولہ ہے، جس میں امن اور شانتی کے بجائے جدل اور تباہی ہے۔ وہ ارسطو کی اس بات سے اختلاف رکھتا ہے کہ ''المیہ رحم اور خوف کے جذبات اُبھارتا ہے۔'' وہ کہتا ہے'' المیے کا مقصد رحم اور خوف پیدا کرنا نہیں بلکہ تباہی اور بربادی کی لذت سے آشنا کرنا ہے۔''

شوپن ہار کی طرح نٹشے بھی عورت کو سخت ناپسند کرتا ہے۔ وہ کہتا ہے:

''ایشیائی دانش مند ہیں کہ عورت کو پردے میں رکھتے ہیں۔ انتقام اور محبت میں عورت، مرد سے کہیں زیادہ سفاک ہے۔''

وہ عورت کی کمزوری کے سبب، عورت سے نفرت کرتا ہے اور اسے محض بچے پیدا کرنے کا ذریعہ سمجھتا ہے۔ عورت کی آزادی، عورتوں اور مردوں کے مابین مساوات کا مخالف اور عورت کو فلسفیوں کے لیے نقصان دہ سمجھتا ہے اور کہتا ہے'' اکثر یوں ہوتا ہے کہ فلسفی نے شادی کی اور بچے پیدا کیے تو اس کا فکری سلسلہ رُک گیا۔''

انگریزوں کو ناپسند کرنے کا بڑا سبب یہ ہے کہ وہ عورتوں کے حقوق اور جمہوریت کی باتیں کرتے ہیں۔ شوپن ہار اور نٹشے کی خرد دشمنی اور ارادیت نے آگے چل کر برگسان، ولیم جیمز، جیمس وارڈ اور فرائیڈ کے نظریات پر گہرے اثرات ڈالے۔

وجودیت

(Existentialism)

انیسوں اور بیسویں صدی کے فلسفے اور ادب پر گہرے اثرات مرتب کرنے والی وجودی فکر، فلسفہ ہے بھی یا کہ نہیں؟ اس موضوع پر زوردار بحث ابھی تک جاری ہے لیکن ایک بات طے ہے کہ وجودیت کا باقاعدہ فکری اور فلسفیانہ نظام نہیں ہے بلکہ وجودی مفکرین ہر قسم کے ''باقاعدہ نظام'' کے سخت مخالف ہیں۔ خواہ یہ نظام سائنسی ہو، فلسفیانہ ہو یا مذہبی۔

کسی بھی باقاعدہ نظام میں اصل اہمیت نظام اور اجتماعیت کی ہوتی ہے، جس میں فرد کی حیثیت محض ایک پُرزے کی ہوتی ہے۔ مرکزی نکتہ فرد کے بجائے ہجوم ہوتا ہے اور اکثر انفرادیت کو اجتماعیت پر قربان کیا جاتا ہے۔ اسی لیے وجودی دانش ور نظاموں کے خلاف ہیں۔

وجودیت کیا ہے؟ اگر پوچھا جائے کہ سائنس کیا ہے؟ فلسفہ کیا ہے؟ عقلیت پرستی کیا ہے؟ عینیت یا تصوریت کیا ہے؟ ارادیت اور ارتقائیت کیا ہیں؟ وغیرہ وغیرہ تو تھوڑے بہت فرق سے کوئی واضح تشریح بن جائے گی، کیوں کہ بالا تمام نظریات کے الگ الگ مکتبۂ فکر ہیں، جن میں کئی مفکر ایک دوسرے سے اتفاق کرتے ہوئے دکھائی دیں گے لیکن جب مسئلہ موجودیت کا آتا ہے تو انسان

☆ علی عباس جلالپوری Existentialism کو موجودیت کہتے ہیں اور فرماتے ہیں کہ وجودیت، دراصل Being کا ترجمہ ہے۔ اپنی کتاب ''روایاتِ فلسفہ'' میں انھوں نے ہر جگہ وجودیت کے بجائے موجودیت لکھا ہے، جو صحیح دکھائی دیتا ہے۔

اُلجھ جاتا ہے۔

کیوں کہ موجودیت کی کوئی بھی باقاعدہ تعریف نہیں ہے۔تقریباً تمام موجودی مفکر ایک دوسرے سے اختلاف رکھتے ہیں اور اپنی سوچ میں کسی نہ کسی دوسرے مکتبہ فکر سے ضرور متاثر ہیں، ان میں کچھ مذہبی، کچھ لاادریے اور کچھ دہریے ہیں۔

وجودیت کی ابتداء ہیگل کی عقلیت پرستی کے خلاف ردِعمل کے طور پر ظاہر ہوئی۔ہیگل کے فلسفیانہ نظام میں عقل، عقلِ مطلق ہے، جس میں شک شبہے کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔عقل ہی ہر مسئلے کا حل ہے اور کائنات وانسان کے سارے مسائل عقل کے ذریعے سلجھائے اور حل کیے جاسکتے ہیں۔

وجودیت کے مفکرین ہیگل کی عقلیت پرستی کو رد کرتے ہیں اور دلیل یہ دیتے ہیں کہ عقل ہر مسئلے کا حل نہیں ہے کیوں کہ یہ محدود ہے۔ نیز یہ کہ ہیگل کے فلسفے میں انفرادی حیثیت میں انسان کو کوئی اہمیت نہیں ہے۔ انسان آنے جانے والی شئے ہے، اس لیے فرد پر خاندان کو، خاندان پر معاشرے کو اور معاشرے پر ریاست کو فوقیت حاصل ہے۔وجودی کہتے ہیں کہ ہیگل کے اس نظام میں فرد کی کوئی اہمیت نہیں ہے، حالاں کہ فرد کے دم قدم سے نظام ہے۔

(وجودیت لفظ کے ساتھ ہی، ذہن میں نظریہ وحدیت الوجود آجاتا ہے لیکن وجودیت کا وحدت الوجود سے تل برابر بھی تعلق نہیں ہے)

وجودیت کا بہتر طور پر مطالعہ تو موضوعی لحاظ سے ہی کیا جاسکتا ہے لیکن چند دانش وروں نے وجودی مفکرین کے کچھ اہم نکات اخذ کیے ہیں، جن پر قریباً سارے وجودی دانش وروں کا اتفاق ہے۔وجودی فکر کے وہ اہم متفقہ نکات اس طرح ہیں۔

۱۔ سائنس، انسان کے حیاتی اور اخلاقی مسائل حل کرنے میں ناکام رہی ہے۔سائنس کی اہمیت اس کی افادیت میں ہے۔لہٰذا صداقت تک رسائی نہیں ہوسکتی۔

۲۔عقل اور منطق کی مدد سے بھی حقیقت تک رسائی ممکن نہیں ہے۔عقل ناقص، ناقابلِ اعتبار اور گمراہ کن ہے اور انسان کی کوئی رہنمائی نہیں کرتی۔

۳۔سارے اجتماعی نظریے غلط ہیں کیوں کہ وہ انفرادیت کی نفی کرتے ہیں۔ وجودی قوم پرستی، اشتراکیت اور فاشزم وغیرہ کے شدید مخالف ہیں۔

۴۔تمام وجودی روایتی مذہب کے بھی خلاف ہیں۔

۵۔سچائی اور نیکی معروضی حقائق نہیں بلکہ داخلی کیفیات ہیں۔

۶۔تقریباً تمام وجودی دانش ور، مایوس اور قنوطیت پسند ہیں۔

۷۔سارے وجودی انفرادیت پسند ہونے کی وجہ سے انسانی آزادی کے بڑے علم بردار ہیں۔

۸۔وجودیوں کی اکثریت ادیب ہے اور انھوں نے اپنے خیالات کا اظہار فلسفیانہ انداز کے بجائے ادب کے ذریعے کیا ہے۔ کافکا، سارتر، کامیو، دوستوو سکی وغیرہ بڑے وجودی ادیب ہیں جنھوں نے افسانوں اور ناولوں کو اظہار کا ذریعہ بنایا۔

وجودی دانش وروں میں بڑے نام یہ ہیں:

پاسکل، کیئر کیگارد، نٹشے، ہائیڈیگر، کارل جیسپرز، مارسل، سارتر، کامیو، کافکا، گوئٹے اور کولن ولسن۔ ان میں سے صرف چند ایک دانش وروں اور ان کے خیالات کا مختصر احوال ذیل میں دیا جاتا ہے:

سورین کیئر کیگارد (Kierkegard)

(سن 1813ء تا 1855ء) کیئر کیگارد جسے وجودیت کا بانی کہا جاتا ہے۔ سن 1813ء میں کوپن ہیگن میں پیدا ہوا۔ یہ اپنے والد کی دوسری بیوی کے بطن سے تھا، جب اس کے والد کی پہلی بیوی انتقال کر گئی تو وہ اپنی نوجوان نوکرانی کے ساتھ زنا بالجبر کا مرتکب ہوا۔ نوکرانی کے حاملہ ہو جانے پر اسے شادی کرنا پڑی۔ بعد ازاں کیئر کیگارد کی پیدائش ہوئی۔

کیئر کیگارد کا والد عیسائی تھا اور اسے ہر وقت یہ خوف دامن گیر رہتا تھا کہ خدا اس سے بدلہ لے گا، اس لیے وہ ہر وقت احساسِ گناہ اور خوف میں مبتلا رہتا۔ یہ احساسِ گناہ کیئر کیگارد کو اپنے والد کی طرف سے ملا، جس نے اس کے فلسفے پر گہرا اثر چھوڑا۔

کیئر کیگارد شکل وصورت کا اچھا نہ تھا اور چلتے وقت کبڑا ہو کر چلتا تھا لیکن وہ انتہائی ذہین اور حساس تھا۔ اس نے ریجنا نامی ایک لڑکی سے محبت کی، منگنی کی اور پھر خود ہی کسی وجہ کے بغیر منگنی توڑ بھی دی۔ اس واقعے نے بھی اس کے ذہن میں احساسِ گناہ اور احساسِ جرم کی سطح کو بڑھا دیا۔

وہ برلن چلا گیا تاکہ شیلنگ کے لیکچر سن سکے، جو ہیگل پر شدید تنقید کر رہا تھا لیکن اسے ہیگل کی طرح شیلنگ نے بھی متاثر نہ کیا۔ اس کے بعد کیئر کیگارد نے سن 1845ء تک آٹھ کتابیں لکھیں جن میں Either اور Fear & Trembling اہم ہیں۔

کیئر کیگارد نے اپنی کتابوں میں اخلاقیات، جمالیات اور نفسیات پر دل کھول کر لکھا اور بے باک لہجے میں مروجہ عیسائیت پر خوب بحث کی۔ حالاں کہ وہ خود بھی عیسائی تھا۔ اس کے باوجود پادریوں نے اس کے خلاف محاذ کھڑا کر دیا اور کیئر کیگارد اپنے گھر تک محدود ہو کر رہ گیا۔

اس کی فکر کا مختصر خلاصہ ذیل میں دیا جاتا ہے:

وہ اپنے فلسفے کی بنیاد ہیگل کی عقل پرستی کی مخالفت پر رکھتا ہے اور ہیگل کی طرف کچھ ایسے جملے اور تصورات بھی منسوب کر کے ان کی مخالفت کرتا ہے، جو ہیگل نے کہے ہی نہیں تھے۔ ہیگل کے نظام میں فرد نظر انداز کیا ہوا ہے اور گروہ کو اس پر فوقیت حاصل ہے۔

کیئر کیگارد ہیگل سے اختلاف کرتے ہوئے صداقت کو موضوعی کہتا ہے۔ یعنی ہر فرد کے پاس اپنی اپنی صداقت ہے۔ فرد کوئی تکمیل شدہ شے (Finished Product) نہیں ہے، وہ ہر وقت تکمیل کے مرحلے سے گزرتا رہتا ہے، جس کے لیے وہ عقل کے بجائے اپنے دل یعنی جذبات کو رہبر بناتا ہے اور اپنی آزادی وانتخاب کا حق استعمال کرتا ہے۔

فرد جو کہ موجود ہے۔ اس کے لیے آزادی، انتخاب، جوش و جذبات اہم و ضروری ہیں تاکہ وہ اپنی راہ خود متعین کر سکے، خواہ وہ کتنی ہی پُر خطر کیوں نہ ہو۔ اجتماعیت میں فرد اپنی رائے آزادی و انتخاب کو استعمال نہیں کر سکتا، وہاں تو بس اسے تقلید کرنی ہے اور اپنا سب کچھ قربان کرنا ہے۔ کیئر کیگارد کہتا ہے ''میرا انتخاب و فیصلہ، میرا انفرادی اور ذاتی ہے، کوئی خدا یا خیالِ مطلق میرے لیے فیصلے نہیں کرتا، اپنے فیصلے صرف اور صرف مَیں ہی کر سکتا ہوں۔''

ہیگل کی طرح کیئر کیگارد بھی جدلیات سے کام لیتا ہے لیکن اسے عقلی جدلیت کے بجائے وجودی جدلیت کا نام دیتا ہے، یعنی جدلیاتی عمل میں عقل کے ارتقا کے بجائے فرد کا ارتقا ہوتا ہے۔

عیسائی ہونے کی وجہ سے کیئر کیگارد کے نزدیک ''موجود ہونے اور خدا کے حضور صرف اس صورت میں موجود رہا جا سکتا ہے کہ فرد کو اپنے گناہ گار ہونے کا احساس ہو۔ بالفاظِ دیگر خدا کے سامنے موجود ہونے کا مطلب ہے گناہ گار ہونے کا احساس، لہٰذا وجودیت کے معنی احساسِ گناہ کے ہیں۔''[1]

وہ ارتقائی اور جدلیاتی حوالے سے انسانی زندگی کو تین ادوار میں تقسیم کرتا ہے:

i۔ جمالیاتی دور جو کہ عیش و عشرت سے بھرپور ہے۔

1-History of Eastern & Western Philosophy, Page:426.

ii۔اخلاقی دَور جو کہ جدوجہد اور حاصلات سے بھرپور ہے۔

iii۔مذہبی دَور جو کہ مصائب سے بھرپور ہے۔

مذہبی دَور میں انسان جس احساس، گناہ اور داخلی کرب واذیت سے گزرتا ہے۔ وہی اسے خدا کے قریب لاتا ہے۔ دُکھ اور اذیت کے سمندر سے گزر کر، انفرادیت کا مقام حاصل ہوتا ہے جو قربِ خداوندی کے لیے ضروری ہے۔ لہٰذا انفرادیت کے حصول کا مطلب خدا سے میلاپ ہے اور جب انسان انفرادیت پالیتا ہے تو وہ ہر قسم کے اخلاقی قوانین اور مروجہ اصولوں سے ماورا ہو جاتا ہے۔ حضرت ابراہیمؑ کی قربانی کو وہ انفرادیت کی معراج کہتا ہے، جس میں حضرت ابراہیمؑ مروجہ اصولوں کی خلاف ورزی کرتے ہوئے اپنے بیٹے کو ذبح کرنے کے لیے لے کر گئے تھے۔

اپنی کتاب "The Concept of Dread" میں وہ خوف و دہشت میں فرق واضح کرتا ہے۔ خوف ہمیشہ کسی شے یا فرد کا ہوتا ہے، لیکن دہشت، آزادانہ عمل کی پیداوار ہے، جو فرد اپنا فیصلہ یا انتخاب خود کرتا ہے۔ وہ لازماً دہشت کا شکار رہتا ہے۔

کیئر کیگارد کا کہنا ہے کہ "حقیقت صرف موضوعی ہے اور موضوعی حقیقت جذباتی ہے، عقلی نہیں۔ خدا ایک حقیقت ہے لیکن یہ معروضی نہیں ہے اور وہ اپنے وجود کے لیے انسان کا محتاج ہے، کیوں کہ انسانی وجود کے بغیر خدا کا تصور ہو ہی نہیں سکتا۔"[1] اس طرح وہ خدا کو پہچاننے کے لیے عقل کے بجائے احساسات و جذبات کو اہمیت واوّلیت دیتا ہے۔

(۱)۔ازعلی عباس جلالپوری، صفحہ نمبر ۱۶۹

ژاں پال سارتر

(سن 1905ء تا سن 1980ء)

(کیئر کیگارد اور سارتر کے درمیانی عرصے میں کئی بڑے وجودی مفکرین ہوگزرے ہیں، جن میں نطشے، ہائیڈیگر، جیسپرز اور مارسل اہم ہیں، لیکن تمام کا احوال بیان کرنا طوالت کا باعث ہوگا)

سارتر وجودی فکر کا بڑا شارح ہے اور اسی کی وجہ سے وجودیت کی اتنی زیادہ تشریح ہو پائی ہے۔

سارتر سن 1905ء میں پیرس میں پیدا ہوا لیکن بنیادی تعلیم اپنے نانا کے پاس ساربون میں حاصل کی، جس کے بعد وہ برلن میں تحقیقی معلم کی حیثیت میں کام کرنے لگا۔ برلن میں اسے ہسرل اور ہائیڈیگر کو پڑھنے کا بھرپور موقع ملا جن سے وہ بے حد متاثر ہوا۔ یہاں اس نے فلسفہ پڑھایا بھی اور خود بھی پڑھا اور لکھا۔

سن 1943ء میں اس کی مشہور کتاب "Being & nothingness"[1] شائع ہوئی، جو بلاشبہ ایک مشکل اور ضخیم کتاب ہے لیکن وجودیت پر گہری اور مستند کتاب ہے۔

دوسری جنگِ عظیم کے دوران کچھ وقت جرمنی کی قید میں رہا لیکن یہاں بھی فلسفہ پڑھتا رہا اور ڈرامے لکھتا رہا۔

(ا)۔ اس کتاب کے لیے سندھی کے مشہور شاعر و دانش ور شیخ ایاز مرحوم کہا کرتے تھے کہ انھیں سب سے زیادہ پیچیدہ اور مشکل لگتی ہے۔

جنگ کے بعد کچھ عرصہ وہ کمیونسٹ پارٹی کارکن بھی رہا لیکن اسے بھی خیر باد کہہ دیا۔ ان دِنوں میں الجزائر پر فرانس کا قبضہ تھا، لیکن سارتر نے اپنی قوم کا ساتھ دینے کے بجائے الجزائر کے آزادی پسندوں کا ساتھ دیا اور اپنی ہی قوم کے خلاف نعرہ بلند کیا۔ ان دِنوں چارلس ڈی گال فرانس کا صدر تھا، جسے مشیروں نے کہا کہ سارتر کو گرفتار کر کے اس پر مقدمہ چلایا جائے، جس کے جواب میں چارلس ڈی گال نے مشہور تاریخی جملہ کہا تھا:

''مَیں سارتر کو کیسے گرفتار کروں، سارتر تو خود فرانس ہے۔''

سارتر نے اپنے خیالات کے اظہار کے لیے ناول، ڈرامے اور ادب کی دیگر اصناف کا سہارا لیا ہے۔ اس کے علاوہ اپنی سوانح عمری اور کئی مقالے بھی لکھے۔ اس کی فکر کا اختصار پیش کرنا نہ صرف مشکل بلکہ تقریباً ناممکن ہے۔ اس کے باوجود کوشش ضرور کی جاتی ہے۔

وجود Existence ہی سارتر کا اہم موضوع ہے اور وہ خود کو بلند آواز میں وجودی کہتا ہے۔ وجود کیا ہے؟ کیا اس کا مطلب محض زندہ رہنا ہے؟ زندہ تو نباتات اور حیوانات بھی رہتے ہیں، کیا وہ بھی وجود رکھتے ہیں؟ سارتر کا کہنا ہے کہ نباتات اور حیوانات زندہ تو ضرور ہیں مگر انھیں اپنے زندہ ہونے کا شعور نہیں ہے۔ یہ شعور صرف انسانوں میں ہے۔ لہٰذا وجود رکھنے کا مطلب وجود کا شعور ہے۔

انسان معاشرے میں مختلف حیثیتوں سے جیتا ہے۔ کہیں وہ باپ تو کہیں بیٹا ہے۔ کہیں مالک اور کہیں ملازم ہے۔ کہیں وہ معاشرے کا ادنیٰ فرد ہے تو کہیں فوج کا اعلیٰ افسر ہے لیکن ان تمام حیثیتوں سے زیادہ اہم اس کا وجود ہے۔ ''وہ کیا ہے؟'' سے زیادہ اہم یہ ہے کہ وہ ''موجود ہے''؛ ''کیا ہے'' انسان کے جوہر کو ظاہر کرتا ہے اور ''موجود ہے'' اس کے وجود کو۔ سارتر کے نزدیک جوہر سے زیادہ اہم اور جوہر پر فوقیت رکھنے والا ''وجود'' ہے کیوں کہ سارتر انسان کے کسی پیدائشی یا قدرتی جوہر کو مانتا ہی نہیں۔ دوسری لفظوں میں انسانوں کی کوئی پیدائشی فطرت ہے ہی نہیں۔ ہر انسان کو اپنے وجود کا جوہر خود ہی تخلیق کرنا ہے۔ یہ بات سمجھانے کے لیے سارتر مندرجہ ذیل مثال پیش کرتا ہے۔

''ہماری حالت ان اداکاروں جیسی ہے جنھیں گھسیٹ کر اسٹیج پر بیٹھا دیا جائے مگر ان کے پاس اسکرپٹ ہو، نہ مکالمے ہوں اور نہ ہی کوئی مکالمے بنانے والا (Promptor) ہو۔ اس صورتِ حال میں اس اداکار کو اپنے مکالمے اور اپنا کردار خود تخلیق کرنا پڑتا ہے، یعنی اس کا جوہر کیا ہے؟ اس کا تعین صرف اور صرف اسے ہی کرنا ہے۔''

جب انسان کو یہ ادراک ہوتا ہے کہ اسے اس دنیا میں مختصر عرصہ رہنا ہے اور پھر فنا ہو جانا ہے، یہ دنیا جو کہ کوئی مفہوم، کوئی معنی، کوئی مقصد نہیں رکھتی۔ اس میں فنا کا تصور انسان کے لیے دہشت (Dread) کا باعث بنتا ہے۔ اس بے مقصد اور بے مفہوم دنیا کا ادراک، انسان کو بیگانگی اور بے معنویت میں مبتلا کر ڈالتا ہے اور انسان پر مایوسی، اُداسی، نفرت، کراہت اور احمقیت (Absurdity) کے احساسات غالب ہو جاتے ہیں۔

ہم اس دنیا میں اپنی مرضی کے بغیر آئے ہیں اور آزاد بھی ہیں۔ کوئی بھی ایسا نہیں ہے جو کہ ہمیں بتائے کہ ہم کیا کریں، جو کچھ کرنا ہے اپنی مرضی اور اپنے انتخاب سے اور اپنے انتخاب کی ذمہ داری بھی ہمیں ہی اُٹھانا ہو گی۔ کیا صحیح ہے اور کیا غلط، اس کا فیصلہ فرد نے خود کرنا ہے لیکن اکثر لوگ اپنا فیصلہ خود کرنے اور اس کی ذمہ داری قبول کرنے کے بجائے، ہجوم کے فیصلوں اور انتخاب پر انحصار کرتے ہیں اور یوں وہ ہجوم میں گم ہو جاتے ہیں۔ یہ ہجوم میں گم ہو جانے والے افراد دراصل خود فریبی کا شکار ہوتے ہیں۔

فرد اپنی زندگی میں خود ہی معانی پیدا کرتا ہے اور اس کے اردگرد کی اشیاء معنی سے خالی ہوتی ہیں۔ اس لیے یہ سراسر لغو اور بے معنی (Nothing) ہوتی ہیں۔

فرد اور فرد سے خارج میں اشیاء دراصل وجود کے دو رُخ ہیں۔ خارجی اشیاء کو فرد معانی دیتا ہے اور ان کی تشریح کرتا ہے۔ تشریح کے لیے وہ اپنا شعور استعمال کرتا ہے۔ یعنی یہ شعور ہی ہے جو کہ فرد کو اشیاء سے جدا کرتا ہے۔ اگر شعور نہیں ہے تو فرد اور خارجی اشیاء ایک ہی ہیں، اس اکائی کو صرف شعور ہی توڑتا ہے یعنی شعور، فرد (داخلیت) اور خارجی اشیا (معروضیت) میں فاصلے پیدا کرتا ہے۔ باالفاظِ دیگر شعور جدائی، فاصلوں اور (اکائی کی) نفی کا نام ہے۔ اس نفی کرنے والے اور وجود کو دو حصوں میں تقسیم کرنے والے (موضوع اور معروض میں) شعور کو سارتر لاشیعیت (Nothingness) کا نام دیتا ہے۔

کیئر کیگارد کی وجودیت خدائی اور سارتر کی وجودیت الحادی ہے۔ وہ خدا کے وجود کو تسلیم نہیں کرتا۔ اس کے خیال میں اگر خدا موجود ہے تو انسان خود مختار ہو ہی نہیں سکتا اور اگر انسان خود مختار ہے تو پھر خدا یقیناً موجود نہیں ہے۔ سارتر انسان کو خود مختار کہہ کر خدا کی ذات کی نفی کرتا ہے۔

سارتر کی تحریروں میں دو لفظوں کو بڑی اہمیت حاصل ہے۔ وہ لفظ ''مایوسی'' اور ''متلی'' کی

کیفیت ہیں۔

یہ دونوں کیفیتیں انسان کی آزادی سے مربوط ہیں۔ آزادی کا احساس انسان کو اذیت میں مبتلا کر ڈالتا ہے اور وہ گھبرا جاتا ہے اور پھر دوسروں کی تقلید کرتے ہوئے زندگی گزارنا چاہتا ہے تا کہ اذیت سے فرار حاصل کر سکے، مگر وہ اس میں کامیاب نہیں ہوتا۔ ''ہم مجبور ہیں کہ ہم آزاد رہیں۔'' فرد ہر وقت معروضی اشیاء میں گھرا رہتا ہے، جو کہ اسے مجبور کرتی ہیں کہ وہ برسرِ پیکار ہے اور فرار کی خود فریبی میں نہ آئے۔ اس صورت میں اسے اپنی مجبوری کا احساس ہوتا ہے، جس کی وجہ سے فرد میں ''متلی'' (Naseau) کی کیفیت پیدا ہوتی ہے۔

کولن ولسن (نو۔وجودیت)

کیئر کیگارد سے سارتر تک سارے وجودیوں پر قنوطیت طاری ہے لیکن کولن ولسن نے وجودیت میں انقلاب لانے کی کوشش کی اور وجودیت سے قنوطیت کا سیاہ نقاب اُتار کر اسے خوش آفرینی (Optimism) کا چولا پہنانے کی کوشش کی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اسے نو وجودی (Neo-existentialist) کہا جاتا ہے۔

کولن ولسن سن 1931ء میں انگلستان کے ایک مزدور گھرانے میں پیدا ہوا اور اچھی تعلیم حاصل کرنے کے بجائے نو جوانی میں ایک کارخانے میں قلی بن کر کام کرنے لگا۔ البتہ مطالعے کا شوق برقرار رہا۔ زندہ رہنے کی جدوجہد میں یہ روایتی تعلیم سے پرے رہا اور علمی و ادبی حلقوں تک رسائی بھی نہ رہی لیکن یہ خاموشی سے مطالعہ کرتا رہا اور سوچ بچار کرتا رہا۔

"کولن کے لیے دو سوال اہم ہیں:

i۔ ہماری زندگی کا مفہوم کیا ہے؟

ii۔ کہیں ساری انسانی قدریں ہماری خود فریبی کا نتیجہ تو نہیں ہیں؟"

سن 1956ء میں محض 25 سال کی عمر میں اس نے اپنی پہلی مشہور کتاب "Outsider" لکھی جس نے اسے دنیا میں شہرت کی بلندیوں تک پہنچا دیا۔ اس کے بعد کولن نے تقریباً 20 کتابیں مزید لکھیں۔[1]

---

(۱)۔ وجودیت از قاضی جاوید، صفحہ نمبر 108

اس کی وجودیت کا ابتدائی نکتہ یہ ہے کہ وجودیوں نے اپنے فلسفے کی بنیاد ہیگل کی عقلیت پرستی کے خلاف احتجاج پر رکھی ہے۔ احتجاج ایک منفی شے ہے۔ لہٰذا سارا وجودی مکتبۂ فکر منفی اور قنوطی رویے کا شکار ہو گیا ہے۔

وہ خود کہتا ہے کہ ''کیئر کیگارد اور نٹشے دونوں رومانیت پسند اور وجودی تھے۔ لہٰذا وجودیت دراصل رومانیت پسندی کی ایک عقلی شکل ہے۔''(۱)

ہائیڈیگر اور سارتر کی طرح، کولن ولسن بھی ہسرل کی 'مظہریت' (Phenomenology) سے متاثر ہے اور کہتا ہے کہ دوسرے وجودیوں نے ہسرل کو سمجھنے میں غلطی کی۔

کولن کہتا ہے کہ قنوطی وجودی دراصل شعور کی وسعتوں اور طاقت سے خوف زدہ ہیں۔ اسی لیے انھوں نے شعور کو محدود کر دیا ہے، جس کی وجہ سے فرد مقصدیت سے محروم ہو گیا ہے اور نتیجے میں مایوسی نے جنم لیا ہے۔ شعور کو وسیع کریں اور اس کے بعد یہ بھی تسلیم کریں کہ شعور سے آگے بھی حسن کے اعلیٰ مظہر ہیں جو حسی اور وجدانی ذرائع سے نمو پا سکتے ہیں۔

زندگی کو لغو پکارنے اور اسے بے مقصد کہنے سے انسان کی ذات کی تکمیل کا سفر رُک جاتا ہے اور وہ ہر خوشی و لطف سے محروہ ہو کر بے مقصدیت کے کنویں میں گر جاتا ہے۔

کولن فرد کی آزادی اور انتخاب کی آزادی کی حمایت کرتے ہوئے فرد کو اپنا نصب العین خود مقرر کرنے کا مشورہ دیتا ہے۔ نصب العین اور اس کی جانب جانے والا ہر راستہ فرد کو مایوسی کی کھائیوں سے نکال کر، اسے لطف اور خوشی سے ہمکنار کر سکتا ہے۔

---

(۱)۔ وجودیت از قاضی جاوید، صفحہ نمبر 108

منطقی اثباتیت (ویانا سرکل)

یہ فلسفیانہ تحریک ویانا سے شروع ہوئی اور پھر پورے یورپ و امریکہ میں پھیل گئی۔ ویانا میں پروفیسر شلک نے اپنے ساتھیوں کے ساتھ مل کر سن 1928ء میں اس تحریک کی بنیاد رکھی۔ شلک کے اکثر ساتھی ماہر لسانیات، سائنس دان اور فلسی تھے، جن میں کارنپ، نیورتھ، فیگل اور گوڈل اہم تھے۔

انگلستان میں اے۔ جی آئر اور امریکہ میں مورس، جان ڈیوی، برٹرینڈ رسل اور بوہر وغیرہ نے اس تحریک کو آگے بڑھایا اور ''سائنس کے فلسفے'' کی ابتدا کی۔

منطقی اثباتی، زبان کے تجزیے کے ذریعے فلسفے کا نئے سرے سے جائزہ لیتے ہیں اور زبان ہی کی بنیاد پر فلسفے کے کئی نظریات کو رد کرتے ہیں۔ اس تحریک کے دو مقصد ہیں۔

۱۔ نفی: وہ زباں کا تجزیہ کرتے ہوئے مابعد الطبیعات کی مکمل نفی کرتے ہیں۔

۲۔ اثبات: تمام سائینسوں کو مضبوط بنیادوں پر اور نئے سرے سے ترتیب دے کر ان کے لیے مشترکہ بولی کی بنیاد رکھی جائے۔

۱۔ مابعد الطبیعات کی نفی

''مابعد الطبیعات یعنی حقیقتِ مطلق کے متعلق آگاہی یا عرفان کو فلسفے سے خارج کریں۔''
یہ ہے وہ بنیادی اصول جس پر تمام منطقی اثباتی متفق ہیں۔ مابعد الطبیعات کو ہیوم اور کانٹ نے بھی

تقریباً رد ہی کیا تھا، لیکن ان کا کہنا ہے کہ انسان کی ذہنی ساخت ہی ایسی ہے کہ وہ حقیقتِ مطلق کے بابت علم حاصل کر ہی نہیں سکتا لیکن ایسا کہنے سے بھی وہ گویا مابعدالطبیعات کی تائید کر رہے تھے لیکن منطقی اثباتی مکمل طور پر مابعدالطبیعات کو فلسفے سے خارج کرتے ہیں، جن کے لیے وہ زباں کا تجزیہ کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ زبان کے تمام جملوں کو تین قسموں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔

ا۔ تجربی یا واقعاتی جملے (Empirical or Factual)

۲۔ تجزیاتی جملے (Analytical)

۳۔ مابعدالطبیعاتی جملے (Metaphysical)

ا۔ تجربی جملے

تجربی جملے کسی واقعے یا تجربے کے متعلق ہوتے ہیں، جن کی تصدیق یا تردید حواس کے ذریعے کی جا سکتی ہے۔ مثلاً ''باہر مینہ برس رہا ہے'' اس جملے کی تصدیق آسانی سے کی جا سکتی ہے۔ باہر جانے کے بعد یہ پتا چلے گا کہ جملہ صحیح ہے یا غلط۔

۲۔ تجزیاتی جملے

یہ جملے منطق اور ریاضی سے تعلق رکھتے ہیں۔ مثلاً "5=5-10" یہ ریاضی کی مساوات ہے، جس میں علامت کے دونوں طرف یکساں عدد ہے۔ اس قسم کے ریاضیاتی یا منطقی جملے کوئی نیا علم یا آگاہی نہیں دیتے مگر پہلے سے طے شدہ آگاہی کا صرف اظہار ہیں۔ دوسرے لفظوں میں یہ جملے معلوماتی نہیں بلکہ صرف معلومات کی گردان ہیں۔

۳۔ مابعدالطبیعاتی جملے

وہ جملے جو کہ نہ تو تجربی ہوں اور نہ ہی تجزیاتی ہوں تو ان کو مابعدالطبیعاتی جملے کہا جاتا ہے۔ منطقی اثباتی کہتے ہیں کہ وہ جملے ہر قسم کی صداقت سے دُور ہوتے ہیں، جن میں نہ تو تجربی صداقت ہوتی ہے اور نہ ہی لفظی صداقت۔ وہ کہتے ہیں کہ زبان کی لغت میں بے شمار الفاظ ہیں جو مل کر جملے بناتے ہیں لیکن ان جملوں کو صحیح یا غلط قرار دینے کے لیے بھی اصول ہیں۔

الف۔ معنویت کا اصول

ب۔ گرامر کا اصول

کوئی بھی جملہ صرف اس صورت میں صحیح ہے جب وہ اصولوں کی خلاف ورزی نہ کرے۔ مثلاً یہ جملہ دیکھیں "اس درخت پر شروبن کے گھونسلے ہیں" یہ جملہ گرامر کے لحاظ سے بالکل صحیح لیکن معنی کے اعتبار سے بالکل غلط ہے۔ کیوں کہ اس جملے کا دارومدار "شروبن" پر ہے اور شروبن کا یقیناً کوئی وجود نہیں ہے۔ لہٰذا یہ جملہ بالکل غلط ہے۔ اسی طرح مابعدالطبیعات کے سارے جملے ایسے لفظوں پر دارومدار رکھتے ہیں، جن کا کوئی وجود نہیں ہے یا اس وجود کو حسی تجربے میں نہیں لایا جاسکتا۔

وٹگنسٹائن (Wittganstein) کا کہنا ہے کہ زبان کے صرف وہی الفاظ بامعنی ہیں جن کا کوئی خارجی وجود ہے، یعنی ایک لفظ ہے 'کتاب' یہ محض ذہن کی پیداوار ایک لفظ نہیں ہے بلکہ خارجی طور پر اس کا وجود بھی ہے، جس کی تصدیق کی جاسکتی ہے۔ اس کے مطابق مابعدالطبیعاتی جملوں میں استعمال ہونے والے لفظوں کی تصدیق نہیں کی جاسکتی۔ اس لیے وہ بے معنی ہیں۔ مثلاً یہ جملہ 'جوہر واحد ہے، ناقابلِ تقسیم، غیر متغیر اور ازلی ہے، اس پورے جملے کا دارومدار لفظ، جوہر، پر ہے جو بے معنی ہے۔ اس لیے پورا جملہ ہی بے معنی ہے۔"

ب۔ اُصولِ گرامر

اگر گرامر غلط ہے تو پورا جملہ غلط ہے مثلاً ہر گاڑی دوڑتی رستے پر ہے۔ اسی طرح جدید فلسفے کے بانی ڈیکارٹ نے ایک غلط جملہ کہہ کر اپنے پورے فلسفے کی بنیاد اس پر رکھی یعنی "مَیں سوچتا ہوں اس لیے مَیں ہوں۔"

منطقی اثباتی اس جملے کو گرامر کے لحاظ سے غلط قرار دیتے ہیں کیوں کہ یہ جملہ یوں ہونا چاہیے "مَیں سوچتا ہوں اس لیے مَیں ۔۔۔ ہوں۔"

۲۔ اثبات

اس تحریک کا دوسرا مقصد یعنی "تمام سائنسی علوم کو ملا کر ان کیلئے کوئی مشترکہ زبان تجویز کی جائے" فلسفیانہ سے زیادہ لسانی اور سائنسی ہے۔ اس سلسلے میں وہ International Encyclopedia of united science کی کئی جلدیں ترتیب دے چکے ہیں لیکن ابھی تک تمام سائنسی علوم کے لیے کوئی مشترکہ زبان یا لغت نہیں لا سکے ہیں۔ ان کی کوششیں ہیں کہ "معیار" کو "مقدار" میں کس طرح تبدیل کیا جائے؟ یعنی اشیاء کی خاصیتوں کو مقداری علامتوں میں کس طرح لکھا جائے۔ اس سلسلے میں طبیعات میں کافی پیش رفت ہوئی ہے۔ مثلاً "یہ میز سرخ ہے۔" سرخ رنگ خاصیت ہے

لیکن طبیعات کی زبان میں سرخ رنگ روشنی کی مخصوص لہریں ہیں جو لمبائی اور چوڑائی میں دوسری لہروں سے مختلف ہیں۔ طبیعات سُرخ رنگ کو اس کی لہروں کی لمبائی اور چوڑائی کے حساب سے ریاضی کی علامتیں دے کر ظاہر کر سکتی ہے۔

یورپ اور امریکہ میں سائنسی رجحان زیادہ ہونے کی وجہ سے ان لوگوں کی سوچ زیادہ تر ''معروضی'' (Objective) ہو چکی ہے۔ لہٰذا وہاں منطقی اثباتیت کا اچھا بھلا استقبال کیا گیا ہے لیکن آج کل اس تحریک پر کافی اعتراضات شروع ہو چکے ہیں۔

ارتقائیت (Evolutionism)

ارتقاء کا نظریہ خود بھی ارتقائی مراحل طے کرتا رہا ہے۔ ابتدا تو یونان سے ہوئی تھی لیکن اسے با قاعدہ شکل ڈارون نے دی۔ ڈارون نے کہا کہ جانداروں میں زندہ رہنے کے لیے شدید کشمکش ہوتی رہتی ہے۔ اس کشمکش میں کئی جاندار ختم ہو جاتے ہیں اور صرف وہی بچ پاتے ہیں جو ماحول سے مطابقت اختیار کر سکتے ہیں اور زیادہ باصلاحیت ہیں۔☆ انسان بھی ہر وقت حالتِ جنگ میں ہے۔ یہ جنگ ماحول سے، دیگر جانداروں سے اور اب دوسرے انسانوں سے ہے۔ سب اصول غلط ہیں اور صرف ایک اصول صحیح ہے وہ ہے اپنے وجود کی بقاء۔ انسان اپنے وجود کو بچانے کے لیے ہر قسم کی اخلاقیات وغیرہ پسِ پشت ڈال دیتا ہے۔ فلسفے کی دُنیا میں نظریہ ارتقا کا پہلا بڑا فلسفی ہر برڈ اسپینسر تھا اور اُس نے تقریباً ڈارون والی بات دہرائی تھی، لیکن برگسان ان کی مادی میکانکیت کے خلاف تھا۔

برگسان (سن 1859ء تا 1941ء)

پیرس کا یہ عظیم فلسفی پہلے بڑا ماہرِ طبیعات اور ماہر ریاضیات تھا لیکن اچانک وہ فلسفے کی طرف راغب ہو گیا اور فلسفے کا استاد بن گیا۔

ڈارون کی ارتقائیت کا منطقی نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ انسان اس جہد البقاء میں مکانیکیت / جبریت کا شکار ہے اور انسان کی تخلیق کے متعلق سارے مذہبی نظریات غلط ہیں، جیسا کہ برگسان مذہب کی طرف جھکاؤ رکھتا تھا۔ اس لیے اس نے مذہب کو ڈارونی حملے سے بچانے کی کوشش کی اور ایک کتاب "Creative Evolution" لکھی ''قوتِ حیات'' (Elan vital) کی اصطلاح بھی برگسان نے متعارف کرائی۔

☆ Survival of the Fittest.

ڈارونی اور اسپینسر کی ارتقائیت سائنسی ہے، جس پر برگسان تنقید کرتے ہوئے کہتا ہے کہ سائنس کسی بھی حقیقت کا کلی طور پر ادراک کرنے سے قاصر ہے کیوں کہ یہ اشیاء کو ٹکڑوں میں تقسیم کرنے کے بعد ان کا تجزیہ کرتی ہے، جس کی وجہ سے سائنس کے نتائج صرف جزوی طور پر صحیح ہوتے ہیں۔ لہٰذا اشیاء کا ادراک براہِ راست اور وجدان کے ذریعے کرنا چاہیے۔ اسپنسر کی ارتقائیت کی کائنات ٹکڑوں میں تقسیم اور جامع ہے لیکن برگسان کی کائنات بنتی اور بگڑتی رہتی ہے، زندہ ہے، حرکت میں ہے اور اس میں تخلیقی ارتقا کا عمل جاری وساری ہے۔(۱)

وہ تخلیقی قوت کو مادے میں قید دیکھتا ہے جو مادے سے باہر نکلنے اور مادے کی بندشیں توڑنے کے لیے بے قرار ہے۔ یہ قوتِ حیات عقلی نہیں بلکہ وجدانی ہے۔ عقل کا تعلق مادے سے ہے، اس لیے عقل مادے کی حمایت میں اس تخلیقی قوت کو روندنے کی کوشش کرتی رہتی ہے۔

عقل پر مزید تنقید کرتے ہوئے وہ کہتا ہے کہ عقل نے زمانے کو بھی ماضی، حال اور مستقبل کے ٹکڑوں میں تقسیم کر رکھا ہے، جو کہ غلط ہے۔ یہ زمانہ مستقل بہاؤ ہے۔ ماضی، حال اور مستقبل دراصل ایک ہی شے یعنی زمانے کا بہاؤ ہے۔ حال اصل میں ماضی ہی ہے، جس میں مستقبل کی جھلک بھی ہے۔

وہ عقل کو وجدان کا ایک ناقص حصہ سمجھتا ہے اور اس کا کام قوتِ حیات کے اشاروں پر ناچنا ہے۔ وجدان ہی حقیقی زندگی ہے جو کہ جبلت کی ترقی یافتہ صورت ہے۔ جبلت اس منزل پر صرف اس وقت پہنچتی ہے جب اسے خود آ گاہی حاصل ہوتی ہے۔

برٹرینڈ رسل کا کہنا ہے کہ برگسان نے پرانے صوفیانہ نظریات کو سائنس کے غلاف میں لپیٹ کر پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔ اس کی قوتِ حیات جو کہ مادے کی قید میں ہے۔ وہ اصل میں صوفیانہ روح ہے جو کہ اس مادی جسم میں قید ہے۔ وحدانیت اور خرد دشمنی دونوں صوفی ازم کی خاصیتیں ہیں جو کہ برگسان نے جوں کی توں استعمال کی ہیں۔

برگسان کے بعد ارتقائیت پر الیگزینڈر، مارگن اور وائیٹ ہیڈ نے بھی بہت کچھ لکھا ہے۔

نتائجیت (Progmatism)

یہ فلسفیانہ تحریک امریکہ میں پیدا ہوئی اور آج کل زوروں پر ہے قریباً ہر نظریے کی جڑیں یونان کی سرزمین میں گہری پیوست ہیں اور اس نظریے کے آثار بھی عہدِ عتیق میں ملتے ہیں لیکن

(۱)۔ روایاتِ فلسفہ از علی عباس جلالپوری صفحہ نمبر ۱۲۵

باقاعدہ تحریک کے طور پر اس کی شروعات سی ایس پیئرس نامی امریکی فلاسفر نے کی۔

جیسا کہ نام سے ظاہر ہے اسی طرح اس کا مطلب ہے کہ ''ہر وہ نظریہ اور عمل صحیح ہے جس کا نتیجہ اچھا ہو'' یعنی کسی نظریے اور عمل کے نظریاتی اور عملی اہمیت کے بجائے اس کی افادیت کو دیکھنا چاہیے۔ اگر کوئی نظریہ خواہ کتنا ہی اچھا ہو مگر اس سے انسان ذات کو کوئی فائدہ نہیں ہے تو یہ نظریہ بیکار ہے اور اگر کوئی نظریہ خواہ کتنا بھی غلط ہو لیکن اگر اس سے کوئی فائدہ ہے تو یہ نظریہ صحیح ہے۔

پیئرس نے اپنی زندگی میں کوئی کتاب نہیں چھپوائی لیکن مضامین کے ذریعے یہ نظریہ دیا کہ نظریات کی اہمیت اسی میں ہے کہ وہ کس حد تک قابلِ عمل ہیں اور کتنے فائدہ مند ہیں؟ لیکن نظریات کی یہ افادیت، عملیّت اور تجربیت پوری نسلِ انسانی کے لیے ہو۔ بالفاظِ دیگر یہ ''معروضی صداقت افادیت'' بن سکتی ہو۔ اگر کوئی نظریہ عملی طور پر کچھ کے لیے فائدہ منداور دوسروں کے لیے نقصان دہ ہے تو یہ نظریہ غلط ہے۔ فائدہ سب کے لیے ہونا چاہیے۔ پیئرس کہتا ہے کہ مذہب، اخلاقیات اور سیاسیات کے نظریے اگر کوئی اچھائی پیدا کر سکتے ہیں تو صحیح ہے ورنہ غلط، پیئرس کی نتائجیت کو ''معروضی نتائجیت'' کا نام دیا گیا ہے۔

ولیم جیمز (موضوعی نتائجیت)

پیئرس کی نتائجیت کو معروضی سے تبدیل کر کے موضوعی (Subjective) بنانے والا ولیم جیمز بھی امریکی فلسفی تھا۔ یہ بنیادی طور پر ماہر نفسیات اور ''تجربیت پسندی'' سے بہت متاثر تھا۔ اس کی نگاہ میں ازلی صداقت کا کوئی وجود نہیں ہے۔ صداقتیں بدلتی رہتی ہیں اور ہر کسی کے پاس اپنا اپنا ''سچ'' ہے۔

وہ پیئرس کی اس بات سے متفق تھا کہ ''نظریات کی اہمیت ان کی افادیت میں ہے'' لیکن اس کو کافی حد تک بدل بھی ڈالا۔ پیئرس صرف ان نظریات کی افادیت تسلیم کرتا ہے جو کہ سب کے لیے معروضی اور فائدہ مند ہوں لیکن جیمز کہتا ہے کہ اگر یہ نظریے کسی سماج، ملک، قوم یا طبقے کے لیے فائدہ مند ہوں تو یہ نظریے ان کے لیے صحیح ہیں۔ مثلاً اگر ناگ کی پوجا کسی قبیلے کے لیے فائدہ مند ہے تو (اس قبیلے کی حد تک) ناگ کی پوجا صداقت ہے۔ کوئی معاشی، سیاسی یا عمرانی نظریہ اگر کسی قوم کے لیے فائدہ مند ہے تو یہ نظریہ بے شک صحیح ہے، ضروری نہیں ہے کہ یہ نظریہ ساری دنیا کے لیے بھی

فائدہ مند ہو۔

ولیم جیمز کے یہ خیالات امریکی قوم کو بے حد پسند آئے، کیوں کہ ان کی پالیسی یہ رہی ہے کہ سرمائے اور طاقت کے زور پر چھوٹی اور کمزور ریاستوں کا استحصال کیا جائے۔ یہ پالیسی امریکی قوم کے مفاد میں گئی ہے اور امریکہ ایک خوش حال ملک بن گیا ہے۔ جیمز کے فلسفے کی وجہ سے ''امریکی چھینا جھپٹی'' کو ایک جواز مل گیا ہے کیوں کہ چھینا جھپٹی نے انھیں اچھے نتائج دیئے ہیں۔

امریکی قوم جمہوریت پسند ہے لیکن صرف اپنے ملک اور اپنے مفادات کے لیے۔ وہ کسی دوسرے ملک میں ''آمریت'' کا استقبال کرنے کے لیے بے تاب ہوتے ہیں۔ بشرطیکہ یہ ان کے مفاد میں ہو۔ امریکی سرمایہ دار پوری دنیا پر اپنا تسلط جما رہا ہے اور اسے درست بھی قرار دیتا ہے کیوں کہ یہ نظریے اسے فائدہ دے رہے ہیں۔

برٹرینڈ رسل نے ولیم جیمز کے فلسفے پر کافی تنقید کی ہے اور کہتا ہے کہ غلط نظریے بھی فائدہ دے سکتے ہیں مگر یہ ہیں غلط، فائدہ دینے کی وجہ سے غلط نظریات کو صحیح قرار نہیں دیا جا سکتا۔

اس نظریے کا دوسرا بڑا شارح جان ڈیوی ہے۔ وہ بھی امریکی ہے۔ ڈیوی کہتا ہے کہ جس طرح انسانی جسم کے اعضاء انسان کے لیے اوزار کا کام دیتے ہیں۔ اسی طرح ''فکر'' بھی انسان کا اوزار ہے۔ آنکھیں دیکھنے کا کام کرتی ہیں، انسان کے مفاد کے لیے ٹانگیں چلنے کا کام کرتی ہیں اور کان سننے کا۔ یہ تمام اعضاء ایک مشین کے اوزار یا پُرزے کی مانند کام کرتے ہیں۔ اس طرح ''فکر'' بھی ایک ذہنی اوزار ہے اور صرف انسان کے مفاد کے لیے کام کرتا ہے۔ لہٰذا سب فکریں اور سب نظریے انسان کے مفاد کے لیے ہیں اور ہونے چاہئیں، اگر مذہبی فکر انسان کے لیے فائدہ مند ہے تو صحیح ہے اور اگر فائدہ مند نہیں ہے تو غلط ہے۔ کوئی ازلی صداقت اور کوئی ابدی سچ نہیں ہے۔

معروضی نتائجیت کے حامی پیرس کے علاوہ رامسی، لیوس اور کارنپ قابلِ ذکر ہیں اور موضوعی نتائجیت کو بعد ازاں شلر اور رارٹی نے فروغ دیا۔

برٹرنڈرسل ___ ایک ہمہ جہت فلسفی

(سن 1872ء تا 1970ء)

منطق میں ارسطو کا وارث بلکہ ارسطو کی تکمیل، مذہبی انتہا پسندی کے خلاف والٹیر کا جانشین، لاادریت میں ہیوم اور کانٹ کا حامی، تجربیت کا مداح، حقیقت پسند، معروضی فکر کا دلدادہ، انسانی وسماجی حقوق کا علم بردار، ماہر تعلیم، عظیم استاد، بڑا ریاضی دان، نوبل انعام یافتہ، جنگ کی مخالفت کے باعث سزا یافتہ، انسانی آزادی اور انفرادیت کا وکیل، نیک دل اور شریف ---

برٹرینڈرسل انگلستان کے مشہور رسل خاندان میں پیدا ہوا۔ اس کا تڑدادا انگلستان کا وزیر اعظم بھی رہ چکا ہے۔ اس کی ریاضی سے بے پناہ دلچسپی تھی۔ پورا دن کاغذ کالے کرتا رہتا وہ یہ دیکھ کر حیرت زدہ رہ جاتا تھا کہ ایک مختصر ترین فارمولا اپنے اندر کتنی وسیع حقیقتیں، بے داغ اور سو فیصد سچے انداز میں سما سکتا ہے۔ ریاضی کے فارمولے حل کرتے ہوئے اس پر ایک عجیب وجدانی اور سرشاری کی کیفیت طاری ہو جاتی تھی۔ وہ ریاضی کے ذریعے منطق سے ہوتا ہوا فلسفے کی دنیا میں پہنچا اور (1910-13ء) میں وائٹ ہیڈ کے ساتھ مل کر "Principia Mathematica" لکھی، جو کہ منطق اور ریاضی کا بے مثال کارنامہ ہے۔

جنگ کی مخالفت کی وجہ سے اسے انگلستان چھوڑنا پڑا۔ وہ امریکہ میں رہا اور یہاں پادریوں نے اُس کے خلاف آگ بھڑکا دی۔ آخر اسے پروفیسر شپ چھوڑنا پڑی۔ نجی ملکیت کے خلاف ہونے کی وجہ سے وہ اشتراکی بن گیا لیکن روس میں انفرادی آزادی اور رائے کے اظہار پر پابندی کے باعث وہ اشتراکیت سے بھی باغی ہو گیا۔ البتہ وہ چینی اشتراکیت اور چینی قوم سے بہت

متاثر ہوا۔ اسے سن 1950ء میں ادب کا نوبل انعام بھی ملا، جب ویت نام میں امریکی فوجیوں کے مظالم انسانیت کی توہین بن گئے تو رسل نے پوری دنیا کے فلسفیوں، ادیبوں اور سائنس دانوں کو متحد کیا اور ایک ''اخلاقی'' نوعیت کا ''جنگی جرائم کے خلاف'' ٹربیونل قائم کیا، جہاں انسانی ضمیر کی عدالت میں کیس چلا کر امریکہ کو مجرم قرار دیا۔

90 سال کی عمر میں کہا ''میں نے نوے سال فلسفے کو دیئے اور اب نوے سال تک افسانے لکھوں گا''، مگر اس کی خواہش پوری نہ ہوئی اور سانس کی ڈوری ٹوٹ گئی۔

فلسفے میں اس کی نمایاں خدمات تو منطق کے میدان میں ہیں لیکن اس کا ایک بڑا کارنامہ ''مغربی فلسفے کی تاریخ'' (History of Western Philosophy) بھی ہے۔ اس کتاب میں رسل نے یونانی داناؤں سے لے کر منطقی اثباتیوں تک کی تاریخ لکھی ہے۔ فلسفے پر اس کی گرفت حیران کن اور اس کا اندازِ تحریر بے حد متاثر کن اور عالمانہ ہے۔ اپنی سوانح عمری کے علاوہ رسل نے کئی کتابیں لکھیں، جن میں "Why i am not a Chiristian" بے حد اہم ہے۔ یہ مضامین کا مجموعہ ہے جس میں اس نے خدا کے وجود کے بارے میں کھلے انداز میں لکھا ہے کہ خدا کے وجود کو عقلی بنیادوں پر ثابت نہیں کیا جا سکتا۔ وہ مابعد الطبیعات کا منکر ہے اور صرف ان حقائق کو تسلیم کرنے کے لیے تیار ہے، جن کو تجربے کے ذریعے ثابت کیا جا سکے۔ خدا یا حقیقتِ مطلق انسانی تجربات سے ماورا ہے۔ لہٰذا اس پر سوچنا فضول ہے۔

''صداقت'' کے متعلق وہ پکا معروضیت پسند ہے۔ کہتا ہے کہ کسی (موضوع) کے سوچنے، مشاہدہ کرنے یا موجود ہونے یا نہ ہونے سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ مثلاً بیابانوں میں بارش ہوئی اور کسی نے نہ دیکھی تو کیا وہاں برسات کے وجود سے ہی انکار کر دیا جائے؟ اسی طرح وہ کہتا ہے کہ ''صداقت مشاہدہ کرنے والے کے وجود کے بغیر بھی صداقت رہے گی۔''

رسل کی مندرجہ ذیل کتابیں مشہور اور اہم ہیں:

1-Principla Mathematica.
2-History of Western Philosophy.
3-Philosophical logic.
4-Why I m not a Christian.
5-Popular Essays.
6-Un Popular Essays.
7-Conquest of happiness.
8-ABC of Relativity.

باب دوم

مشرقی فلسفہ

چینی فلسفہ

دنیا میں سب سے زیادہ آبادی رکھنے والا ملک چین کسی وقت چھوٹی چھوٹی ریاستوں میں تقسیم تھا، جن کے حکمران ایک دوسرے سے برسرپیکار رہتے تھے۔ پہلی بڑی حکمرانی شینگ سن 1500 قبل مسیح میں وجود میں آئی اور تقریباً پورا چین سن 221 ق م میں متحدہ ریاست بنا اور شین خاندان کی حکومت اقتدار میں آئی۔ اسی دور میں عظیم ''دیوارِ چین'' کی بنیاد رکھی گئی۔

چین بنیادی طور پر ابتدا سے ہی زرعی سماج رہا ہے اور اس میں زرعی سماج کی ساری اچھائیاں اور خامیاں بھی موجود ہیں۔ چینی رسم الخط تقریباً سن 2000 ق م میں وجود میں آیا اور قریباً 1000 ق م میں قانون ''تحریر'' ہو گئے۔

چینی فلسفے کا باقاعدہ آغاز کنفیوشس (Confucius) سے ہوا۔ کنفیوشس سے پہلے بھی کئی چھوٹے بڑے فلسفی موجود تھے، لیکن ان سب کا احوال یہاں لکھنا ضروری نہیں ہے۔ کنفیوشس چھٹی صدی قبل مسیح کا فلسفی ہے اور اسی دور میں یونان میں پتھاگورس اور ہندوستان میں گوتم بدھ پیدا ہوا۔

چین میں یہ دور جاگیرداروں کا تھا جو چھوٹے چھوٹے شہروں کے قلعوں میں رہتے تھے اور اپنے اپنے علاقوں کے حکمران تھے۔ ''چین میں زمانہ قدیم سے مقدس مقامات کی بھرمار رہی ہے، خصوصاً کئی پہاڑ مقدس تھے اور چینی ایسے مقامات کا احترام عبادت کی حد تک کرتے تھے۔ جاگیرداروں نے بھی اپنے محلات کو مقدس قرار دے رکھا تھا اور جاگیرداروں کو محصول ادا کرنے کا مطلب یہ تھا کہ گویا چینی اپنا مذہبی فرض ادا کر رہے تھے۔ یہاں تک کہ جاگیردار کے محل کا دیدار،

زیارت اور ثواب کی حیثیت رکھتا تھا۔[1]

اس دَور میں زیادہ علم والا اسے سمجھا جاتا تھا جو مذہبی و درباری رسم و رواج سے واقف ہو۔ دربار کا لباس کیسا ہونا چاہیے، آواز کتنی بلند ہو، قدم کیسے اُٹھائے اور کیسے رکھے جائیں، جاگیردار سے کس طرح بات کی جائے۔ وغیرہ وغیرہ کا علم، ایک اعلیٰ اخلاقی گن سمجھا جاتا تھا۔ اس دَور کے اسکول صرف مذہبی اور درباری رسومات اور روایات سکھاتے تھے۔ اس دَور میں عظیم فلسفی کنفیوشس پیدا ہوا۔

چینی فلسفے کے بنیادی نکات

چینی فلسفیوں پر کچھ لکھنے سے قبل، چینی فلسفے کے چند اہم اور بنیادی نکات ذیل میں دیئے جاتے ہیں:

۱۔ چینی فلسفہ بنیادی طور پر انسان دوستی پر مشتمل ہے۔ کنفیوشس کا اخلاقی نظام، انسانی تعلقات کو بہتر بنانے پر مشتمل ہے۔

۲۔ ماورائی طاقتوں یا مابعد الطبیعاتی نظاموں سے کافی دُور۔

۳۔ تاؤازم (Taoism) کے اثرات کی وجہ سے چینی فلسفہ اور چینی عوام فطرت سے محبت کرتے ہیں اور فطرت کو ہی اپنا استاد مانتے ہیں۔ فطرت سے ہم آہنگی اور فطرت کی تابعداری کو بڑی اہمیت حاصل ہے۔

۴۔ سن زو نامی فلسفی نے فطرت سے ہم آہنگی کے بجائے فطرت کو تسخیر کرنے کے لیے کہا۔ فطرت کی اطاعت کرنے کے بجائے فطرت کو طابع کرنے پر اصرار کیا۔

۵۔ چین کے لوگ بنیادی طور پر رواداری اور درگزر سے کام لیتے ہیں۔ مذہبی آزادی اور مذہب کو ذاتی معاملہ سمجھتے ہیں۔ چین شاید واحد ملک ہے جہاں مذہبی یا فرقہ وارانہ جنگیں کبھی نہیں لڑی گئیں ہیں۔

۶۔ جمہوری اقدار چینی فلسفے میں کافی مضبوط ہیں۔ مینشس نے اپنے سیاسی فلسفے میں جمہوریت اور عوام کے بابت بہت کچھ کہا ہے۔

۷۔ کنفیوشس ازم اور تاؤازم دو الگ الگ مکتبۂ فکر ہیں لیکن اب تک چینی لوگ دونوں فلسفیوں کے اہم خیالات لے کر ان کی بنیاد پر اپنی زندگی استوار کر چکے ہیں۔

چینی مکتبۂ فکر کے دونوں مکاتیب کا مختصر جائزہ ذیل میں پیش کیا جاتا ہے۔

1-The living thoughts of confucius by:Alfred Doebin Page:9.

کنفیوشس☆ اور اس کے پیروکار

کنفیوشس شانتونگ صوبے کے ایک گاؤں لو(Lu) میں سن 550 قبل مسیح میں پیدا ہوا۔ ابھی وہ تین سال کا ہی تھا کہ اس کے والد کا انتقال ہو گیا اور اسے کچھ عرصہ چرواہا بن کر گزر بسر کرنا پڑی لیکن جلد ہی اسے چھوڑ کر مزید تعلیم حاصل کی اور پھر معلم کے پیشے کا انتخاب کیا۔ وہ ساری عمر ایک چلتی پھرتی یونی ورسٹی بن کر رہا۔

اس کی دلچسپی ادب، تاریخ اور قدیم روایات سے تھی جن کو وہ نئے معانی اور تشریحات دے کر اپنے شاگردوں تک پہنچاتا رہا۔

ایک دفعہ اسے اپنے شہر کا چیف مجسٹریٹ اور پھر پولیس کا وزیر بھی بنایا گیا، لیکن وہ محلاتی سازشوں کا شکار ہو گیا۔ اقتدار کے خواہش منداس کے پیچھے پڑ گئے اور اسے سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر جلاوطن ہونا پڑا یعنی اپنی آبائی ریاست چھوڑنا پڑی۔

کنفیوشس اپنا گھر بار چھوڑ کر شہر شہر بھٹکتا رہا اور اس کے شاگرد بھی اس کی محبت اور سیکھنے کی خواہش میں اس کے ساتھ ساتھ تھے۔

کنفیوشس جس ریاست میں بھی گیا وہاں کے حکمران اس کے نظریوں سے خوف زدہ ہو گئے۔ نتیجے میں کنفیوشس کو بار بار ہجرت کرنا پڑی۔ اس پر قاتلانہ حملے بھی کرائے گئے۔ سیاست میں جس نظریے نے جاگیرداروں کو خوف زدہ کر رکھا تھا۔ وہ یہ تھا کہ ''ایک مرکزی حکومت ہو اور چھوٹی حکومتیں و ریاستیں اس میں ضم ہو جائیں'' ظاہر ہے کنفیوشس کے ایسے نظریات کسی بھی مقامی حکمران کو بالکل نہ بھائے۔

68 سال کی عمر میں تھکا ماندہ کنفیوشس اپنی آبائی ریاست میں لوٹ آیا۔ اس کی بیوی کا بھی انتقال ہو چکا تھا اور وہ بہت تنہا ہو گیا تھا۔ اسے اپنے ایک شاگرد یتان اور بیٹے پیئو سے بے حد محبت تھی لیکن یہ دونوں دربدری کے زمانے میں انتقال کر گئے تھے اور اس بوڑھے استاد کو مزید اکیلا اور دکھی کر گئے۔

73 سال کی عمر میں جب اس کی آخری گھڑی آئی تو اس کا صرف چھوٹا پوتا اس کے پہلو میں کھڑا تھا جس سے آخری گفتگو کرتے ہوئے کنفیوشس نے اس جہاں کو الوداع کہا۔

☆ کنفیوشس کا اصل نام Kung-Fu-Tse تھا لیکن لاطینی زبان سے ہوتا ہوا جب انگریزی تک پہنچا تو Con-fu-cios ہو گیا۔ اسی طرح Mang-Tse بدل کر Men-cius بن گیا۔

''اس کے انتقال کا سُن کر، اس کے بے شمار شاگرد جمع ہو گئے اور اسے بڑے اعزاز کے ساتھ دفنا کر تین سال تک اس کی قبر پر سوگ مناتے رہے، جب سب چلے گئے تو اس کا ایک شاگرد زی کونگ مزید تین سال وہیں رہا اور سوگ مناتا رہا۔''(۱)

کنفیوشس کا فلسفہ

ا۔ سیاسی فلسفہ

کنفیوشس کا سیاسی فلسفہ جمہوریت پر مشتمل ہے۔ وہ حکمرانوں کے اس نظریے سے اختلاف رکھتا ہے، جس میں حکمران دعویٰ کرتے تھے کہ وہ خدا کے نمائندے ہیں اور خدا نے ہی انھیں اقتدار دیا ہے۔ 'کنفیوشس سیاسی قوت کا سرچشمہ عوام کو سمجھتا ہے اور کہتا ہے کہ جو بھی حکومت عوام کا اعتماد کھو دے گی آخر کار اسے اقتدار سے ہاتھ دھونا پڑیں گے۔''

حکومت کے لیے کیا ضروری ہے؟ اپنے ایک شاگرد کے سوال کے جواب میں وہ حکومت کے لیے تین باتیں اہم قرار دیتا ہے:

i۔ عوام کے لیے خوراک کا مناسب بندوبست ہونا چاہیے۔

ii۔ فوجی ساز و سامان اور ہتھیار ہونے چاہئیں۔

iii۔ حکمران پر عوام کا اعتماد ہونا چاہیے۔(۲)

اس کے علاوہ دوسرے نمبر پر اچھے لوگوں کی تقرری کی اہمیت ہے۔ ایمان دار اور محنتی لوگوں کو حکومت کے اہم عہدوں پر مقرر کیا جائے، لیکن ایمان دار لوگوں کی تقرری کا تعلق براہِ راست حکمران سے ہے، یعنی اگر حکمران ایمان دار ہوگا تو اہل کار اور آفیسر بھی ایمان دار رہیں گے اور اگر حکمران ایمان دار نہیں ہوگا تو اہلکار بھی ایمان دار نہیں رہ سکیں گے۔

اس کے بعد حکمرانوں کو اپنے دربار کے اخراجات گھٹانے چاہئیں اور دولت کی مرکزیت کو ختم کرنا چاہیے۔ زیادہ دولت کم ہاتھوں میں ہونے کے بجائے تھوڑی تھوڑی دولت زیادہ ہاتھوں یعنی ہر کسی کے پاس ہو۔

ریاست میں موسیقی کو فروغ دیا جائے اور یہ ہر اسکول میں سکھائی جائے کیوں کہ موسیقی

1-Our Oriental Hertiage by:will Durrant, Page:664.
2-Our Oriental Hertiage by:will Durrant, Page:664.

سے انسان میں ترتیب پیدا ہوتی ہے اور وہ سچی خوشی حاصل کرنے کے قابل بنتا ہے۔

اس کے علاوہ حکومت کو عوام کے طور طریقوں اور نشست و برخاست پر بھی دھیان دینا چاہیے، کیونکہ بہتر قوم ہی بہتر حکومت کی باعث ہوتی ہے۔

کنفیوشس کا ریاست کا تصور، ایک فلاحی ریاست کا تصور ہے۔ اس کی ریاست اور افلاطون کی یوٹوپیا میں کافی مماثلت ہے۔ کنفیوشس کی ریاست میں مکمل امن و امان کی ذمہ داری حکومت پر ہے، جہاں بیماروں کا علاج، یتیموں، غریبوں، بیواؤں اور معذوروں وغیرہ کی کفالت اور دیکھ بھال کا ذمہ بھی حکومت کا ہے۔

کنفیوشس کے سیاسی نظریات آج کل کے انسانوں کو بالکل روایتی دِکھائی دیں گے، لیکن یہ آج سے ڈھائی ہزار سال قبل کے بے رحم جاگیردارانہ سماج میں بالکل نئے تھے، جہاں فلاحی ریاست اور عوامی بھلائی کا تصور ہی نہیں تھا۔ جاگیردار اور حکمران خود کو خدا کا نمائندہ (ظلِ الٰہی) تصور کرتے تھے اور یہ سمجھتے تھے کہ عوام ان کی غلام ہے اور غلام کی ضروریات محض کھانا کھانے تک محدود ہوتی ہیں۔

کنفیوشس کے نظریات اور اس کی عالمانہ و مدلل گفتگو نے وقت کے حکمرانوں کو بھڑکا دیا، جنھوں نے کنفیوشس کو کبھی بھی سکھ کا سانس لینے نہ دیا۔

2۔ لاادریت

کنفیوشس مذہب کے بارے میں لاتعلق رہا۔ اس کے دَور میں وفات پا جانے والے آباؤاجداد کی پوجا ہوتی تھی اور قربانی کی جاتی تھی۔ جیسا کہ کنفیوشس قدیم ادب اور قدیم سماجیات کا استاد تھا، لہٰذا اس نے شاگردوں کو اجازت دے رکھی تھی کہ وہ بے شک مردہ پرستی میں حصہ لیں لیکن خود مذہب و مابعدالطبیعات سے دُور رہا۔

اس کے شاگرد نے پوچھا ''کیا ہم وفات پا جانے والے لوگوں کی روحوں کی خدمت کر سکتے ہیں؟''

''تم زندہ لوگوں کی خدمت نہیں کر سکتے تو مردہ لوگوں کی کیا خدمت کرو گے۔''

شاگرد نے پھر پوچھا ''ہمیں موت کے بابت کچھ بتائیں؟''

کنفیوشس نے جواب دیا ''ہمیں زندگی کے بابت پورا علم نہیں ہے تو موت کی کیا خبر؟''

کنفیوشس نے نہ تو خدا کے وجود کو ثابت کرنے کی کوشش کی ہے نہ ہی رد کرنے کی، بلکہ اس معاملے میں وہ خاموش ہے۔ وہ اپنے سیاسی یا اخلاقی فلسفے میں کسی بھی مابعدالطبیعاتی ہستی کی کوئی

گنجائش یا ضرورت محسوس نہیں کرتا۔

3۔سماجی و اخلاقی فلسفہ

سماج کی بنیادی اکائی گھرانہ ہے اور گھرانے کی بنیادی اکائی فرد ہے۔ فرد کی زندگی میں نظم و ضبط ہوگا تو گھرانے میں بھی نظم وضبط ہوگا اور اس طرح پورے سماج میں نظم وضبط اور امن وسکون ہوگا۔

فرد میں نظم وضبط کیسے پیدا ہوگا؟ کنفیوشس جواب دیتا ہے ''دانائی سے، دانائی ملے گی اشیاء کے مشاہدے اور جانچ پڑتال سے، دانائی انسان کے دل میں صداقت پیدا کرے گی اور پھر صداقت خودی وشخصیت کی تعمیر کرے گی اور یوں فرد کی زندگی میں نظم وضبط پیدا ہوگا۔''

فرد ہی سماج کی تعمیر کرتے ہیں اور بہتر فرد کے معنی بہتر معاشرہ۔ کنفیوشس بہتر فرد سے بھی بہت آگے ''اعلیٰ انسان کا تصور دیتا ہے۔ اعلیٰ انسان (Ideal man) کا تصور یورپ کے کئی فلسفیوں کا پسندیدہ موضوع رہا ہے۔ سقراط کا اعلیٰ انسان ''دانا اور باخبر'' ہے۔ حضرت عیسیٰؑ کا اعلیٰ انسان ''نیک'' ہے۔ نٹشے کا فوق البشر بہادر ہے اور کنفیوشس کے اعلیٰ انسان میں یہ ساری خصوصیات بیک وقت موجود ہیں، یعنی اعلیٰ انسان دانا، نیک اور بہادر ہونا چاہیے۔ اگر محض دانائی ہوگی تو اس دانائی کو زنگ لگ جائے گا اور اگر دانائی کے بغیر محض محنت ہوگی تو یہ بیل والی محنت بن جائے گی۔ اعلیٰ انسان میں دانائی اور محنت کا توازن مساوی ہونا چاہیے۔ اعلیٰ انسان کی مزید خوبیاں اس طرح ہیں:

- اعلیٰ کردار کا مالک ہو۔
- اعلیٰ انسان اپنے اندر وہ باتیں تلاش کرتا ہے جو کہ ادنیٰ انسان دوسروں میں تلاش کرتے ہیں۔
- وہ بولتا کم اور عمل زیادہ کرتا ہے۔
- وہ میانہ روی اختیار کرتا ہے اور کسی بات میں انتہا پسند نہیں ہوتا ہے۔
- وہ ہر کام محتاط طریقے سے کرتا ہے۔
- وہ جب اشتعال میں ہوتا ہے تو اپنے غصے کے نتائج پر غور کرتا ہے، وغیرہ وغیرہ۔

سقراط سے بھی پہلے کنفیوشس ''میانہ سنہری اوّل'' (Golden mean Principle) کا تصور دیا تھا، یعنی ہر کام میں میانہ روی اختیار کی جائے؛ اور کسی بھی بات میں انتہا پسندی سے کام نہ لیا جائے۔

''نیکی کیا ہے؟'' اس کے ایک شاگرد نے پوچھا۔

''دوسروں کے لیے بھی وہی پسند کرو جو کہ اپنے لیے پسند کرتے ہو اور دوسروں کے لیے

بھی وہ ناپسند کریں جو کہ اپنے لیے پسند نہیں کرتے۔"☆

کنفیوشس کے ہم عمر لاؤزے اور بعد میں آنے والے حضرت عیسیٰؑ نے یہ کہا کہ "برائی کا جواب برائی سے نہیں بلکہ نیکی سے دینا چاہیے" کنفیوشس نے اس اصول سے اختلاف کرتے ہوئے کہا "اگر برائی کا جواب نیکی سے دیں گے تو پھر نیکی کا جواب کس سے دیں گے؟ برائی کے جواب میں انصاف کرنا چاہیے اور نیکی کے بدلے میں نیکی۔"(1)

کنفیوشس نیکی کی بنیاد سماجی رشتوں پر رکھتا ہے، جو کہ پانچ اقسام کے ہیں:

i۔ باپ اور بیٹے کا رشتہ

ii۔ حکمران اور رعایا کا رشتہ

iii۔ میاں اور بیوی کا رشتہ

iv۔ بڑے اور چھوٹے بھائی کا رشتہ

v۔ دوست کا دوست سے رشتہ

یہ رشتے محض لفظ نہیں ہیں بلکہ ان میں معانی ہیں، اگر ہر کوئی ان معنوی رشتوں کا فرض ادا کرے گا تو معاشرے میں امن وسکون ہو جائے گا۔

لیکن یہ فرض "خالی فرض" نہیں ہے، یعنی صرف جان چھڑانا نہیں ہے بلکہ اس فرض کی بنیاد "محبت" پر رکھی گئی ہے۔ باپ اور بیٹے کو ایک دوسرے سے محبت سے پیش آنا چاہیے، دوست کو دوست سے محبت سے پیش آنا چاہیے۔ دوستوں میں سارے سماجی تعلقات آ جاتے ہیں، جن میں پڑوسی اور سماج میں رہنے والے سب لوگ شامل ہیں یعنی سب سے محبت سے پیش آنا چاہیے۔

نیکی کی بنیاد محبت ہے۔ باپ بیٹے سے محبت کرے تو یہ نیکی ہے، میاں بیوی ایک دوسرے سے محبت کریں تو یہ نیکی ہے۔ پڑوسیوں کی محبت، کاروباری معاملات میں محبت سے پیش آنا وغیرہ عین نیکی ہے۔

کنفیوشس کے اثرات

کنفیوشس کے آج بھی چین کے عوام پر گہرے اثرات ہیں۔ ان میں کتنی ہی تبدیلیاں آئیں، کتنے ہی نئے نظریے پیدا ہوئے، جنھوں نے حمایت یا مخالفت کی۔ بدھ مت آیا، جین مت آیا،

☆ تقریباً یہی اصول اسلامی تعلیمات میں بھی ہے۔

1-Our Oriental heritage by:will Durrant, Page:670.

ہندی فلسفے کا اثر پڑا، لیکن کنفیوشس کے اثرات برقرار رہے۔ یہ دوسری بات ہے کہ یہ ساری باتیں کنفیوشس ازم پر اثر انداز ضرور ہوئیں۔

کنفیوشس کے انتقال کے بعد اس کے کئی شاگردوں نے اس کے نقشِ قدم پر چلنے کی کوشش کی اور اس کے نظریات کا پرچار کرنے کے لیے نئے نئے اسکول کھولے۔ اس کے پیروکاروں میں دو اہم نام مینشس (Mencius) اور سن زو (Hsun Tsu) ہیں، جنھوں نے اس کے خیالات کا پرچار کرنے کے ساتھ ساتھ اپنے اپنے طور پر ان کی تشریح بھی کی۔ مینشس نے کہا کہ ''انسان بنیادی طور پر نیک ہے'' اور سن زو نے کہا کہ ''انسان بنیادی طور پر نیک نہیں بلکہ بُرا (Evil) ہے۔ اسے صرف بہتر تعلیم و تربیت سے اچھا انسان بنایا جا سکتا ہے۔''

کنفیوشس کا مخالف مکتبۂ فکر تاؤازم تھا، جس کا مختصر احوال ذیل میں دیا جاتا ہے۔

تاؤازم (Taoism)

چینی زبان میں تاؤ کا مطلب ہے ''راستہ'' یہاں اس کا اصطلاحی مقصد ''سیدھا راستہ'' ہے۔ یعنی وہ طریقہ کار جس کے تحت زندگی گزاری جا سکے اور وہ طریقہ کار ''فطرت'' ہے۔

تاؤمت والے کہتے ہیں کہ جس طرح فطرت اپنی راہ پکڑ کر چلتی ہے۔ انسان کو بھی اس راستے پر چلنا چاہیے۔ انسان کو ہر کام فطری انداز میں کرنا چاہیے اور کوئی بھی کام فطرت کے خلاف نہیں کرنا چاہیے۔ فطرت سے مکمل ہم آہنگی نیکی ہے اور فطرت سے ٹکراؤ بدی ہے۔ علم حاصل نہ کریں کیوں کہ علم کا حصول غیر فطری ہے۔ بے علم لوگ نیک ہوتے ہیں، علم و آگاہی والے لوگ بُرے ہوتے ہیں۔ بدترین حکومت وہ ہوگی جس کا حکمران فلسفی ہوگا۔

فطرت سادہ ہے، اس لیے انسان کو سادگی اختیار کرنا چاہیے۔ سادہ اور جاہل آدمی خوش رہ سکتا ہے جب کہ باعلم انسان نہ تو خود خوش رہ سکتا ہے اور نہ ہی دوسروں کو خوش رہنے دیتا ہے۔ فطرت کے طریقہ کار میں کسی قانون دان، کسی صنعت، کسی کتاب یا کسی دانا کی بالکل ضرورت نہیں ہے۔ کیوں کہ یہ فطرت کے نظام میں خلل ڈالتے ہیں۔

تاؤازم قانون سازی کے سخت خلاف ہے۔ اس کے بقول جتنے زیادہ قانون بنیں گے۔ چور وڈاکو بھی اتنے زیادہ پیدا ہوں گے۔

انسان کی بھلائی و خوشی اسی میں ہے کہ وہ فطرت کو تسخیر کرنے کے بجائے اس سے مطابقت پیدا کرے۔ فطرت کے قوانین کو سمجھے اور پھر ان قوانین پر عمل کرے۔

''فطرت کی ہر شے خاموشی کے ساتھ اپنا کام کرتی ہے اور اپنے کام کے عوض کوئی بھی مطالبہ نہیں کرتی۔ اپنا کام ختم کر کے ہر شے خود بخود ختم ہو جاتی ہے اور اپنی اصلی حالت کی طرف لوٹ جاتی ہے۔ ان فطری قوانین کو سمجھنا دانائی ہے۔۔۔''(۱)

تاؤازم کے تین بڑے شارح تھے، جن میں لاؤزے اہم ہے، لاؤزے کنفیوشس کا ہم عصر اور تاؤازم کا زبردست حامی ہے۔ لاؤزے کے علاوہ چانگ زو اور یانگ چو بھی تاؤازم کے فلسفی ہیں۔

یانگ چو نے کہا: ''اگر مجھے دنیا کی حکمرانی کے بدلے میں صرف یہ کہا جائے کہ میں اپنے جسم کا ایک بال نوچ کر دے دوں تو میں ایسا ہرگز نہیں کروں گا، کیوں کہ یہ سودا مہنگا ہے۔''(۲)

یانگ چو نے قریباً قریباً رہبانیت کا پرچار کیا ہے اور مشورہ دیتا ہے کہ سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر جنگلوں، بیابانوں اور پہاڑوں میں رہیں ورگرنہ یہ معاشرہ آپ کو تباہ کر ڈالے گا۔ لاؤزے فطرت کی ماہیت کے متعلق بولتا ہے۔ یہ فطرت کیا ہے، جس سے زندگی کا ہر سبق براہِ راست لیا جائے؟

فطرت تاؤ سے جنم لیتی ہے، جس کا کوئی نام نہیں ہے۔ ہر شے اپنے آپ میں وجود (Being) ہے، مگر تاؤ جیسا کہ کوئی شے (Thing) نہیں ہے لہٰذا وہ کوئی وجود بھی نہیں ہے، بالفاظِ دیگر وہ عدم وجود (Non-Being) ہے۔''(۳)

یعنی وجود صرف فطرت کا ہے اور فطرت ہی سب کچھ ہے۔ یہ فطرت چند قوانین کے تحت کام کرتی ہے اور یہ قوانین کا مجموعہ تاؤ ہے☆

تاؤازم کسی حد تک تصوف (Pantheism) سے قربت رکھتا ہے۔ دونوں کے نزدیک فطرت کے تضادات محض آنکھوں کا دھوکہ ہیں اور بظاہر دکھائی دینے والی دو انتہائیں، ایک ہی وحدت کے دو منظر ہیں۔ یعنی کثرتِ وجود، دراصل واحد وجود کی مظہر ہے۔ انسان اپنی خودی کو ختم کر کے فطرت میں فنا ہو جائے۔ ''مَیں'' اور ''غیر میں'' کا فرق مٹانا ہی انسان کی بلندی اور معراج ہے۔

چین میں آج بھی بے شمار لوگ تاؤ کے پیروکار ہیں اور انتہائی سادہ و فقیرانہ زندگی گزار رہے ہیں۔

1-Our Oriental heritage by:Will Durrant, Page:656.

2-History of Eastern & Western Philosophy by:Radhkirshana, Page:566.

3-History of Eastern & Western Philosophy, Page:567.

☆ تقریباً اسپائنوزا والی بات

ہندوستانی فلسفہ

ہندوستانی فلسفہ ایک وسیع اصطلاح ہے، جس میں کم از کم چار بڑے مکاتیب فکر ہیں۔ یہاں ہندوستانی فلسفے کا مطلب ہے، وہ فلسفہ جو کہ ہندوستان کی سرزمین پر پیدا ہوا اور پھر دنیا کے کتنے ہی علاقوں میں پھیل گیا۔ چار بڑے مکاتیب فکر یہ ہیں:

۱۔ ہندی فلسفہ

۲۔ مادہ پرستی

۳۔ جین مت

۴۔ بدھ مت

۱۔ ہندی فلسفہ

ہندی یا ہندو فلسفہ، ہندو مذہب اور ہندو ثقافت آپس میں اس حد تک پیوست ہیں کہ انھیں ایک دوسرے سے جدا کرنا تقریباً ناممکن ہے۔ ہندی فلسفہ پڑھتے پڑھتے انسان ہندو مذہب کی حد میں جا پہنچتا ہے اور ہندو مذہب کا مطالعہ کرتے کرتے قاری ہندی فلسفے کی حدود میں جا نکلتا ہے لیکن چند دانش وروں نے ان دونوں کو الگ الگ سمجھانے کی کوشش کی ہے۔ یہاں ہمارا مقصد ہندی فلسفے کے متعلق کچھ آگاہی حاصل کرنا ہے لیکن پہلے ہندو مذہب اور اس کا پس منظر جاننا انتہائی ناگزیر ہے۔

ہندو مذہب

دیگر قدیم مذاہب کی طرح ہندو مذہب بھی فطرت پرستی سے شروع ہوتا ہے۔ قبیلوں میں

رہنے والے انسان کو جس بات نے فائدہ دیا، وہ پسندیدہ اور مطلوبہ ہوگئی اور جس بات سے نقصان ہوا وہ ناپسندیدہ و قابلِ نفرت بن گئی اور یوں فطری باتیں ٹوٹم (Totem) اور ٹابو (Taboo) میں تقسیم ہوگئیں۔

اگلے مرحلے میں انسان پسندیدہ اشیاء ٹوٹم کی دلی تمنا کرنے لگا جب کہ ناپسندیدہ اور نقصان دہ اشیاء ٹابو سے دُور بھاگنے لگا، لیکن فطری قوتیں انسان کے بس سے باہر تھیں۔ بارش اچھی تھی، لیکن بارش کی کثرت نقصان دہ بھی تھی۔ آگ کی حرارت حیات بخش تھی تو حیات کش بھی، یعنی ایک ہی شے فائدہ مند بھی ہے اور نقصان دہ بھی۔ انسان فطری قوتوں کی خوشامد کرنے لگا۔ خشک سالی میں بارش کو پکارنے لگا اور یوں اس نے بارش کا دیوتا تخلیق کر لیا۔ سخت سردی میں آگ کی تلاش کرتے ہوئے وہ اگنی دیوتا کی تخلیق تک پہنچا۔ آہستہ آہستہ اس نے فطرت کی ہر قوت کا ایک دیوتا بنالیا اور پھر ان کو شخصی روپ (Personification) دیتے ہوئے ان کے بت بنا لیے اور ان کی پوجا کرنے لگا، ان سے دُعائیں مانگنے لگا اور ان کو راضی کرنے کے لیے، ان کے غصے سے بچنے کے لیے خورد و نوش کی اشیاء سے لے کر جانوروں اور انسانوں کی قربانیاں دینے لگا۔

ہندوستان میں آریاؤں کی آمد سے قبل ''دراوڑی'' نامی انتہائی تہذیب یافتہ قوم آباد تھی، جس کا ثقافتی و سیاسی مرکز ''موئن جودڑو'' کے نزدیک تھا۔

آریا آئے اور آ کر تباہی مچائی۔ وہ اپنے ہمراہ لشکری قوت، بھوک اور نسلی برتری بھی لے کر آئے۔ لشکری طاقت نے موئن جودڑو کی تہذیب کو تاراج کر ڈالا، ان کی بھوک ہندوستانی دراوڑوں کے وسائل پر قبضے کا سبب بنی، دراوڑوں کی رنگت سیاہ یا سانولی تھی اور آریا صاف رنگت کے مالک تھے۔ اپنی نسل کو بچانے کے لیے انھوں نے دراوڑوں سے شادی کرنے پر پابندی عائد کرتے ہوئے ان کو نچلی ذات قرار دیا۔ ہندو مذہب سمیت ہندو فلسفے کے چھ سرچشمے ہیں:

i۔ شروتی (یعنی جس کو سنا جائے۔ یہ وید ہیں)

ii۔ سمرتی (جسے یاد رکھا جائے۔ اس کی بنیاد ویدوں پر ہے)

iii۔ اتہاس (تاریخ: رزمیہ داستان؛ مہابھارت، بھگوت گیتا)

v۔ پران (اتہاس کی طرح، ویدوں پر مشتمل 18 پران)

vi۔ درشن (یعنی صداقت، روشنی، 6 درشن ہیں)

درج بالا تمام سرچشموں (Sources) میں وید زیادہ اہم ہیں، لہٰذا ان کا مختصر تعارف ذیل میں دیا جاتا ہے۔

وید

وید کے معانی جانکاری، آگاہی یا علم کے ہیں۔ فطرت کی طاقتوں اور دیوتاؤں کا علم اور ان کو رضامند کرنے کے طریقوں یعنی دعاؤں وعبادتوں کا علم، وید اوّلی شاعری (Hymns) پر مشتمل ہیں:

i۔رگ۔وید	:	عبادت اور تعریف
ii۔سما۔وید	:	آہنگ اور ترانے کا علم
iii۔یجر۔وید	:	قربانی کے طریقوں کے بابت علم
iv۔اتھر۔وید	:	جادوئی طریقوں کے بابت علم

ویدوں کے ابتدائی دیوتا فطری قوتیں تھیں۔ آسمان، سورج، زمین، آگ، روشنی، ہوا، پانی اور جنسی قوت وغیرہ سب دیوتاؤں کا درجہ رکھتی تھیں۔ یہ فطری قوتیں شخصیت کا روپ دھارنے لگیں تو آسمان باپ بن گیا، زمین ماں بن گئی، پرتھوی دیوی بن گئی، آگ اگنی دیوتا اور طوفان اندرا دیوی بن گئے۔ اس طرح بے شمار دیوتا وجود میں آ گئے۔

یہ دیوتا اپنے آپ میں مکمل اور بااختیار تھے۔ ہر دیوتا کی پوجا کے وقت اسے واحد دیوتا سمجھا جاتا تھا۔ آگے چل کر صرف ایک دیوتا (خدا) بن گیا، جسے برہما کا نام دیا گیا، جس نے وشنو (نیکی اور تخلیق کا دیوتا) اور شیوا (موت اور بربادی کا دیوتا) تخلیق کیا۔ باقی سب دیوتا اس ایک برہما کی صفات بن گئے، اور آخر میں وشنو اور شیوا بھی برہما کی صفات قرار دیئے گئے لیکن یہ تصور کافی بعد کا اور فلسفیانہ ہے۔

وید قریباً 1500 ق۔م میں وجود میں آئے۔ ان کے لکھنے والے کون ہیں؟ یہ تو پتا نہیں چلتا لیکن ہندو مذہب والے یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ یہ الہامی ہیں اور کسی انسان کے تحریر کردہ نہیں ہیں۔

ویدوں کو سمجھنے اور ان میں پوشیدہ معانی اور دانش کا کھوج نکالنے کے لیے ہندو بزرگوں نے ان کا گہرا مطالعہ کیا اور پھر جو کچھ محسوس کیا اپنے خاص شاگردوں کو بتایا۔ ان کے ان خیالات، تشریحات اور نقطۂ نظر کو اپنشد کا نام دیا گیا، جو کہ ہندو فلسفے کی اہم بنیادیں ہیں۔

ہندو فلسفہ

صداقت کیا ہے؟ صداقت کے بارے میں جاننے اور اس کی ماہیت کو سمجھنے کی کوشش تقریباً ہر دَور کے انسان نے ہمیشہ کی ہے۔ ہندو فلسفے کی شروعات بھی صداقت کی تلاش سے ہوتی ہیں۔

ہندو رہنماؤں نے صداقت کی تلاش ویدوں سے شروع کی اور صرف اپنے خاص شاگردوں کو بتائی۔

تقریباً سن 800 ق۔م سے سن 500 ق۔م تک یہ سلسلہ چلتا رہا۔

جیسا کہ اپنشد مختلف داناؤں کی تشریحات پر مشتمل ہیں، لہٰذا ان میں بہت سارے تضادات (Contradictions) بھی ہیں۔ اپنشدوں کو ویدانت بھی کہا جاتا ہے۔☆

اپنشد اور ویدانت کے دانا صداقت کو کس طرح سمجھتے ہیں۔ آیئے مختصر جائزہ لیتے ہیں۔

i۔ مابعد الطبیعات

فلسفے کا بڑا اور اہم سوال یہ ہے کہ خالق کون ہے؟ یا یہ دنیا کس نے اور کیسے تخلیق کی؟ وغیرہ وغیرہ

ہندو فلسفے میں دو لفظ نہایت اہم ہیں، ایک آتما دوسرا برہما، آتما کا لغوی مطلب سانس لینا ہے لیکن اس کا اصطلاحی مطلب انسان کی روح ہے۔

ہر جان دار کی ایک روح ہے جو کہ فنا نہیں ہوتی، فنا صرف جسم ہوتا ہے لیکن یہ آتما ایک بہت بڑی آتما کا حصہ ہے اور آخر کار اس میں ضم ہو جاتی ہے۔ آتماؤں کی آتما یا روحوں کی روح کو روحِ مطلق یا برہما کہا جاتا ہے۔

''اپنشدوں کے مطابق برہما حقیقتِ مطلق (Absolute Reality) ہے۔ برہما لامحدود، ازلی، ابدی، ہر شے پر قادر، ہر بات سے باخبر اور روح الارواح ہے۔ برہما ہر زندہ اور بے جان شے پر محیط ہے۔

برہما سے ہر شے پیدا ہوتی ہے اور ہر چیز برہما کے اندر ہی رہتی ہے۔ سورج، چاند، آسمان، زمین اور دن رات وغیرہ سب اس کے حکم کی تعمیل کرتے ہیں۔ برہما لامحدود بھی ہے۔ یہ کل اشیاء پر محیط ہونے کے ساتھ ساتھ کل اشیاء سے ماورا بھی ہے۔[1]

☆ وید+انت= آگاہی+خاتمہ، ویدانت کا لفظی معنی ہے۔ ویدوں کا اختتام البتہ اس کا اصطلاحی مطلب ہے جہاں علم کا خاتمہ ہو۔ ویدانتی فلسفہ تصوف کے کافی قریب ہے۔

(۱)۔ فلسفۂ مذاہب از اامولیہ رنجن مہاتیر، صفحہ نمبر ۱۶۴۔

انسان کی آتما کا سب سے بڑا مقصد برہما سے ملنا اور اس سے ایک ہونا ہے لیکن آتما جسم میں قید ہے۔ اس قید سے نکلنے کے لیے اسے ''نجات'' (Moksa) کا راستہ اختیار کرنا پڑے گا، جب تک روح انسانی جسم میں رہے گی تب تک پاک صاف نہیں ہوگی، جب تک پاک صاف نہ ہو گی تب تک اس کا برہما سے میلاپ نہ ہو سکے گا۔ روح صرف ''کرم'' (نیک اعمال) سے پاک صاف ہو سکتی ہے۔ اگر جسم میں رہتے ہوئے روح یا آتما پاک صاف نہ ہوئی تو جسم کے مرنے کے بعد روح کو دوبارہ جنم لینا ہوگا۔ یہ جنم کسی انسان یا جانور کی شکل میں ہو سکتا ہے۔

جب تک انسانی آتما پاک صاف نہ ہو گی تب تک وہ بار بار جنم لیتی رہے گی۔ بار بار جنم لینا ایک عذاب ہے۔ درد، اذیت اور تکلیف ہے۔ کبھی کتا بننا پڑتا ہے تو کبھی آتما کو بلی، چڑیا اور مچھلی وغیرہ کا جسم ملتا ہے اور وہ ذلتوں کی انتہاؤں سے گزرتا رہتا ہے۔

(اس بار بار جنم لینے کے عمل کو آواگون 'Transamigiration' کہا جاتا ہے۔ آواگون سے نجات یا معافی یا مکتی حاصل کر لینا انتہائی ضروری ہے)

مکتی کیسے ملے گی؟ مکتی حاصل کرنے کے لیے انسان کو برہما سے دل لگانا پڑے گا، برہما کو سمجھنا پڑے گا۔ برہما کو خوش کرنا پڑے گا۔ برہما کو سمجھنے کے لیے دنیاوی علم ناکافی ہے۔ کیوں کہ دنیاوی علم حواس کے ذریعے حاصل ہوتا ہے اور حواس ناقص ہیں۔ آخر یہ کان، یہ آنکھیں اور یہ محدود دماغ برہما کو کس طرح دیکھ، سُن اور سمجھ سکتے ہیں؟ برہما کو سمجھنے کے لیے تو اندر کی آنکھیں اور اندر کے کان چاہئیں۔☆

''اندر کی آنکھیں کھولنے کے لیے اور وجدان (Intuition) حاصل کرنے کے لیے انسان کو اپنے اعمال اور اپنی سوچوں کو ہر قسم کی برائیوں سے پاک کرنا پڑے گا۔ روزے رکھنا ہوں گے اور جسم و ذہن کو سکون کی انتہا تک پہنچانے کے لیے یوگا کی مشقیں کرنی پڑیں گی۔(1)

آنکھیں بند، کان بند، سوچیں بند، جسمانی لذت سے دُور ہونا پڑے گا۔ باہر کی آوازوں سے چھٹکارہ حاصل کیے بغیر ازلی آواز سُنی نہیں جا سکے گی۔

کٹھن ریاضتیں، طویل مجاہدے، نیت کی سچائی، پاکیزگی اور برائیوں سے توبہ وغیرہ انسان کی آتما کو اپنے آپ سے بے خبر کر ڈالیں گی۔

1-Our Oriental Heritage By: Will Durrant, Page:412.

آتما اپنی بجائے برہما کو محسوس کرنے لگے گی، خودی ختم ہو جائے گی۔ اپنی نفی ہو جائے گی اور برہما سے میلاپ کی منزل مل جائے گی۔

لیکن اس منزل پر ہر انسان نہیں پہنچ سکتا اور نہ ہی ہر انسان یہ دنیا تیاگ کر بنواس لے سکتا ہے۔ اس لیے اس دنیا کا کام کاج کرتے ہوئے اگر کوئی نیک کام "کرم" کرے اور برائیوں سے دُور بھاگے تو بھی وہ آواگون سے بچ جائے گا۔ فرق اتنا ہے کہ پہلی صورت میں اسے اس دنیا میں ہی نروان مل جائے گا اور اسے مکتی حاصل ہو جائے گی، جس کا اسے شعور بھی ہوگا اور دوسری صورت میں اسے مرنے کے بعد نجات ملے گی۔

آتما جب برہما سے ملتی ہے تو یہ مکمل سکون کی کیفیت میں آ جاتی ہے۔ انفرادی شعور اور ہستی ختم ہو جاتی ہے اور روح، روحِ مطلق کا حصہ بن کر ہمیشہ ہمیشہ کے لیے ابدی بن جاتی ہے۔

دیگر مذاہب کی طرح ہندو مذہب میں بھی رسومات پر زیادہ زور دیا گیا ہے۔ مندر میں جانا، دعائیں پڑھنا اور پوجا کرنا وغیرہ پر زیادہ زور دیا گیا ہے لیکن ویدانتی فلسفے میں رسمی عبادتوں کے بجائے کرم اور یوگ پر زور دیا گیا ہے۔ ذاتی خواہشات سے چھٹکارے اور اندر کے اسرار کو سمجھنے پر اصرار کیا گیا ہے۔

ہندو مذہب میں دیوتاؤں کی جو کثرت دکھائی دیتی ہے وہ ویدانت میں ختم ہو جاتی ہے اور ان کی جگہ پر احدیت آ جاتی ہے۔ "ادویت (احدیت) کے مطابق برہما حقیقی ہے اور دنیا غیر حقیقی۔ برہما واحد ہے، بے شمار نہیں۔ اس واحد وجود سے ہی ساری کثرت وجود میں آئی۔ انفرادی روح برہما ہی ہے۔ مظہری کائنات برہما سے ظہور پذیر ہوتی ہے اور واپس اسی کی طرف لوٹ جاتی ہے۔

ii۔ ہندو اخلاقی فلسفہ

ہندو فلسفے میں نظامِ اخلاق، رگ وید میں موجود "ریت" پر ہے۔ ریت کا مطلب "اخلاقی معیار" ہے۔

نظامِ اخلاق میں بھی بنیادی حیثیت آواگون یا نظریہ تناسخ کی ہے۔ روح کو مکتی تب ہی ملے گی جب وہ نیک کام "کرم" کرے گا۔ نیک اعمال نہ کرنے کی صورت میں روح کو یہ سزا ملے گی کہ اسے دوبارہ جنم لینا پڑے گا اور زندگی کے عذاب بار بار جھیلنا پڑیں گے۔ ان عذابوں سے نجات کے لیے رگ وید برہما کی خوشنودی حاصل کرنے کا درس دیتے ہیں۔ برہما نہ صرف اچھے اعمال کی جزا

اور بُرے اعمال کی سزا دیتا ہے بلکہ وہ اچھے خیالات اور اچھی نیت کی بھی جزا دیتا ہے۔

رگ وید بتاتے ہیں کہ برہما کی نگاہ میں ذیل کے اعمال گناہ ہیں جن کی وہ سزا دیتا ہے:
بُری نیت، قسم کھانا، جھوٹ بولنا، چغل خوری، بدتمیزی، بہتان تراشی، بے ایمانی، تعویز یا جادو، جوا، قرض لینا، انا پرستی یا لڑائی، زنا کرنا، چوری کرنا کسی کی جان و مال کو نقصان پہنچانا وغیرہ وغیرہ۔

ہندو اخلاقیات میں محبت بھی ایک نیکی ہے۔ محبت کی ابتدا برہما سے ہو کر انسانوں، جانوروں، پودوں اور جمادات تک پہنچتی ہے۔ ہر کسی سے محبت کی جائے کیوں کہ برہما ہر جگہ اور ہر مظہر میں موجود ہے۔

فرض شناسی بھی ایک اعلیٰ نیکی کا درجہ رکھتی ہے، جس کا جو فرض ہے، وہ ادا کرے اور فرض کی ادائیگی میں تکالیف بھی خوشی سے برداشت کرے، پھر خواہ دل کے فیصلے اس کے برعکس ہی کیوں نہ ہوں۔ کھتری☆ کا کام لڑنا ہے، لہٰذا وہ دھرم و دیس کے لیے لڑنے سے بالکل نہ گھبرائے، بھگوت گیتا میں جب ارجن دیکھتا ہے کہ مخالف فوج میں اس کے کئی عزیز ہیں تو وہ ان سے لڑنے کے بجائے ہتھیار ڈالنے کی بات کرتا ہے لیکن کرشن اسے اس کا فرض یاد دلاتا ہے۔ کرشن جو وشنو کا اوتار ہے۔ ارجن سے کہتا ہے کہ جنگ اس پر فرض ہے خواہ یہ عزیزوں سے ہی کیوں نہ لڑنا پڑے۔ بالفاظِ دیگر فرض کی ادائیگی ہر قسم کے جذبات اور نتائج سے بالاتر ہونی چاہیے۔ اس طرح ہر کسی کو اپنا فرض نبھا کر نیکی کرنی چاہیے۔ اچھے اعمال (کرم) یا نیکی انسان کو خوش حالی، برہما کی خوشنودگی، امرتا اور مکتی کی راہ پر لے جانے کے لیے انتہائی ضروری اور یہی انسان کا مقصدِ حیات ہے۔

iii۔ ہندی سیاسی فلسفہ

ہندوستان راجاؤں اور مہاراجاؤں کا ملک رہا ہے۔ بعض اوقات کوئی راجہ ہندوستان کے قریباً تمام علاقوں کا حکمران رہا ہے اور حکومت حاصل کرنے کا واحد ذریعہ ''طاقت'' ہی رہی ہے، جس کے پاس طاقت ہے وہ آگے بڑھے اور حکومت پر قبضہ کر لے لیکن یہ طاقت زیادہ تر کھتریوں یا جنگ جو قبیلوں کے پاس رہی ہے۔ ایک دَور ایسا بھی آیا کہ برہمنوں نے کھتریوں کی طاقت کو للکارا اور جنگیں کیں۔ کئی برہمن راجے بھی ہو گزرے ہیں، جس طرح یورپ میں کلیسا اور بادشاہت میں کشمکش رہی اور کبھی کبھار کلیسا کے زیادہ طاقت ور ہو جانے کی وجہ سے انھوں نے حکومتوں پر قبضہ بھی

کرلیا لیکن بادشاہت یا عوامی حکومتیں بالآخر کلیسا کو شکست دینے میں کامیاب رہیں۔ یہی صورتِ حال ہندوستان میں بھی رہی۔ کھتری راجاؤں کی دلیل یہ تھی کہ حکمرانی پر ان کا حق ہے اور برہمنوں کا کام صرف مذہبی رسومات اور روایات ادا کرنا ہے۔ برہمن کی دلیل یہ تھی کہ وہ برہما کے چہرے سے بنا ہے اور سب سے بالاتر ہے۔ لہٰذا برہما کی دنیا کو بہتر طور پر چلا سکتا ہے۔

ہندو سیاسی فلسفے کی ابتدا کا تو کچھ پتا نہیں ہے، لیکن یہ باقاعدہ اور تحریری شکل میں چندر گپت موریہ کے دَور میں آیا۔

جب سکندرِ اعظم نے راجہ پورس کو شکست دی اس پر خراج مقرر کر کے واپس ہوا تو ہندوستان سے اس کی طاقت سات سال کے مختصر عرصے میں ہی ختم ہوگئی اور ایک نوجوان کھتری چندر گپت نے ہندوستان کے تخت پر قبضہ کرلیا اور موریہ خاندان کی شہنشاہیت کی بنیاد پڑی، جو کہ ہندوستان کی تاریخ کا یادگار دَور تھا۔

چندر گپت موریہ، بہادر، سمجھ دار، معاملہ فہم، بہترین منتظم اور ایک رومانی کردار تھا لیکن اس کی کامیابیوں کے پیچھے ایک خاموش پُرسکون حقیقت پسند اور غیر جذباتی کردار کوٹلیہ تھا۔

کوٹلیا چانکیہ

کوٹلیا چانکیہ یا وشنو گپتا، چندر گپت کا اہم ترین مشیر تھا، جس نے سن 300 ق۔م میں سیاسی فکر پر مشتمل مشہور کتاب ''ارتھ شاستر'' لکھی۔ ارتھ شاستر میں کوٹلیا نے باقاعدہ دلائل کے ساتھ سیاسی اداروں اور سیاسی داؤ پیچ پر تفصیل سے لکھا۔ ذیل میں مختصر احوال دیا جاتا ہے:

ریاست

ریاست کیسے وجود میں آئی؟ یا ریاست کا جواز کیا ہے؟ کوٹلیا کا کہنا ہے کہ کسی دَور میں جب ریاست نہیں تھی تو وہاں ''مچھلی کا قانون'' رائج تھا۔ یعنی چھوٹی مچھلی کو بڑی مچھلی ہڑپ کر ڈالتی تھی۔ امیروں کے استحصال سے بچنے کے لیے لوگوں نے ریاست کی بنیاد رکھی اور ایک انسان کو بادشاہ بنایا، جس کا کام رعایا کی حفاظت کرنا تھا جس کے عوض رعایا اسے اپنی پیداوار کا چھٹا حصہ بطور محصول ادا کرتی تھی لیکن بادشاہ کا انتخاب برہما کی رضا سے ہوا تھا۔ لہٰذا بادشاہت کا ادارہ الہامی ہے۔ برہما نے بادشاہت اس لیے قائم کی کہ اس کی مخلوق کے حقوق کو تحفظ ملے اور انھیں انصاف میسر

ہو۔لہٰذا کوٹلیہ دلیل دیتا ہے کہ ہر منصف بادشاہ کے پیچھے خدائی طاقت ہوتی ہے اور اگر بادشاہ انصاف کرنا ترک کر دیتا ہے تو برہما اس کی حمایت ختم کر دیتا ہے اور یوں اس کی بادشاہت ختم ہو جاتی ہے۔

نظامِ حکومت

کوٹلیہ کے نزدیک جمہوریت کا کوئی تصور نہیں ہے۔ بادشاہت کا تصور بھی موروثی ہے، لیکن بادشاہ کے لیے یہ بہتر ہے کہ وہ عوام، راجاؤں اور جاگیرداروں کا اعتماد حاصل کرے، اگر عوام کا بادشاہ پر سے اعتماد اُٹھ گیا تو اس کی حکومت شدید خطرے سے دوچار ہو جائے گی۔

بیوروکریسی (Bureaucracy)

کوٹلیہ بیوروکریسی کا زبردست حامی تھا۔ حکومتی معاملات چلانے کے لیے ذہین، مستقل و تربیت یافتہ افسر رکھنے چاہئیں تا کہ وہ بادشاہ کی مرضی اور خواہشات کو عملی روپ دے سکیں اور بادشاہ سہولت سے اپنے ملک کا انتظام سنبھال سکے۔

سیاسی مخالفت

سیاسی مخالفین پر نگاہ رکھنے کے لیے کوٹلیہ جاسوسی نظام کی حمایت کرتا ہے۔ بادشاہ کو ملک کے مخفی حالات جاننے کے لیے اپنے جاسوس ملک کے کونے کونے میں بھیجنے چاہئیں۔ سیاسی مخالفین کو پھلنے پھولنے کا موقع نہیں دینا چاہیے۔ مبادا بغاوت نہ ہو جائے۔ ضرورت پیش آئے تو خبرداری و ہوشیاری سے ان کو قتل کرا دیا جائے مگر ان کا الزام بادشاہ پر نہیں آنا چاہیے۔

سیاسی تنظیم اس طرح ہونی چاہیے: بادشاہ، وزیر، علاقہ، قلعہ، خزانہ، فوج اور اتحادی۔ حالانکہ کوٹلیہ خود برہمن تھا لیکن اس کے باوجود اس نے برہمن مذہبی راہنماؤں کو سیاسی تنظیم سے دُور رکھا ہے۔ وہ برہمن کو صرف بادشاہ کے لیے اتساہ پیدا کرنے والے کا درجہ دیتا ہے۔ کوٹلیہ مذہب کو سیاست سے دُور رکھنے کی تاکید کرتا ہے۔

بادشاہ و قانون

بادشاہ کو کچھ قوانین کی پیروی کرنی چاہیے لیکن جیسا کہ وہ خود قانون نافذ کرتا ہے لہٰذا اس کے فرمان کو قانون پر فوقیت حاصل ہونی چاہیے۔ بادشاہ کو چھ جذبوں سے بچنا چاہیے۔ جنسی بے راہ روی، غصہ، لالچ، تکبر، خود پسندی اور اسراف۔

عوام کی خوشی میں ہی بادشاہ کی خوشی ہے۔عوام کے جان و مال کی حفاظت کا ذمہ دار بادشاہ ہے۔

نظریہ ضرورت

بادشاہ کو اعلیٰ آدرشوں کے لیے کام کرنا چاہیے، لیکن نظریہ ضرورت کے تحت وہ کسی بھی آدرش سے دست بردار ہوسکتا ہے۔ اپنی بادشاہت بچانے یا عوام کی بھلائی کے لیے وہ ہر قسم کی قانون شکنی کر سکتا ہے اور اسے ہر قسم کے حقوق حاصل ہیں۔

خارجی پالیسی

کوٹلیہ نے خارجہ پالیسی کے بھی اصول وضع کیے۔ خارجہ پالیسی چھ قسم کی ہونی چاہئیں۔

i۔ معاہدہ

کم طاقت ور بادشاہ کو امن معاہدے کرنا چاہئیں۔

ii۔ جنگ

طاقت ور بادشاہ کو ریاست کو وسعت دینے کے لیے کمزور سے جنگ کرنا چاہیے۔

iii۔ غیر جانبدار

طاقت برابر ہونے کی صورت میں جنگ سے گریز کرتے ہوئے غیر جانب دار رہنا چاہیے۔

iv۔

پڑوسی بادشاہ اگر زیادہ طاقت ور ہو تو اس کی حمایت حاصل کرنا چاہیے۔

v۔

اپنے ملک کی تعمیر و ترقی کیلیے امداد حاصل کرنے کیلیے دوطرفہ (Dual) پالیسی رکھنی چاہیے۔

vi۔

کمزوروں کو دباؤ میں رکھنے کے لیے جارحانہ انداز اختیار کرنا چاہیے۔

بادشاہی سزائیں

موریہ خاندان کے بادشاہوں نے بڑے بڑے زندان بنوائے، کیوں کہ کوٹلیہ نے کہا تھا، جو بادشاہ کم اور ہلکی سزا دے گا، اس کا تخت اُلٹ جائے گا، جو بادشاہ منصفانہ سزا دے گا، عوام اس

سے محبت کریں گے اور جو بادشاہ ضرورت سے زیادہ سزائیں دے گا، عوام اسے ظالم سمجھتے ہوئے اس سے خوف زدہ رہیں گے۔

کوٹلیہ کو مشرقی ہوبز اور میکاولی بھی کہا جاتا ہے۔ اس کے سیاسی نظریات غیر جذباتیت پر مشتمل ہیں جن کا مقصد یہ ہے کہ بادشاہ کو اپنی بادشاہت کس طرح قائم رکھنی چاہیے۔ کوٹلیہ کی مشاورت سے چندر گپت نے کامیاب طریقے سے موریہ بادشاہت کی بنیاد رکھی، جس نے صدیوں تک ہندوستان پر حکمرانی کی۔

موریہ سلطنت کے زوال کے بعد کوٹلیہ کی کتاب صدیوں تک وقت کی گرد میں دبی رہی اور دنیا اس کی تصنیف سے بے خبر رہی۔ سن 1905ء میں اس کی کتاب دوبارہ بازیافت ہوئی اور دنیا کو موریہ سلطنت کے استحکام کے راز کا پتا چل گیا۔

ہندوستان کا سیاسی فلسفہ بادشاہت پر ہی مبنی رہا اور آخرکار مسلمان حکمرانوں کے ہاتھ میں آ گیا۔ جنھوں نے ہندوستان پر بادشاہت، سلطانیت، شہنشاہیت اور ظلِ الٰہیت کے مزے اس وقت تک لوٹے جب تک انگریز بہادر نے اپنے سَر پر بادشاہت کا تاج سجا کر سن 1857ء میں مکمل طور پر ہندوستان پر قبضہ کر لیا۔ سن 1947 میں ہندوستان نے دنیا کے طویل ترین بادشاہی نظام سے چھٹکارا حاصل کیا۔

○○○

2۔ مہاویرا اور جین مت

مہاویر سن 599 ق۔م میں پیدا ہوا اور سن 527 ق۔م میں وفات پائی۔ جین مت کی روایت کے مطابق ہر دَور میں ایسے بڑے اور عظیم انسان پیدا ہوتے رہے ہیں، جنھوں نے اپنے زہد، تقویٰ و ریاضت کے ذریعے ''نجات'' بھی حاصل کی ہے اور اپنے پیروکاروں کی رُشد و ہدایت بھی کی ہے۔ ان کو ''تیر تھنکر'' کہا جاتا ہے۔ ان کی روایت کے مطابق دنیا میں کل چوبیس تیر تھنکر پیدا ہوئے ہیں اور مہاویر چوبیسواں و آخری تیر تھنکر تھا۔

مہاویر کا جنم بہار کے کھتری راجہ کے گھر میں ہوا۔ مہاویر کے والدین بھی جین روایات کے پیروکار تھے اور یہ دنیا ان کے لیے قید خانہ تھی اور اس قید سے نجات کے لیے انھوں نے مرتے دم تک روزہ رکھا اور یوں اپنی زندگی کا خاتمہ کیا۔ اس وقت مہاویر کی عمر 31 سال تھی۔

مہاویر کو بھی یہ دنیا قید خانہ لگی، جس میں روح سزا کاٹ رہی تھی۔ روح کی رہائی کے لیے اس نے بھی جنگل کا رُخ کیا اور پہاڑوں، بیابانوں میں تیرہ سال تک کسی سامانِ خورد و نوش و کپڑے لتے کے بغیر سخت تپسیائیں کرتا رہا۔ اس کے پاؤں ننگے، بال بڑے اور جسم ننگا تھا۔ آخر کار انھوں نے تن کو تپسیا دے کر جسمانی و دنیاوی لذتوں کو تیاگ کر اپنی روح کو نجات دلائی۔ کئی لوگ اس خاک نشیں درویش و فقیر کے پیروکار بنے، جن کو مہاویر ایک گرو کی طرح باقاعدہ درس دینے لگا اور روح کی نجات کے لیے ان کا رہبر و مرشد بن کر رہنے لگا۔ اس کی وفات کے وقت اس کے پیروکاروں کی تعداد چودہ

ہزار تھی جو آگے چل کر لاکھوں تک پہنچ گئی۔

مہاویرا اپنے شاگردوں کو جو درس دیتا تھا، اسے بعد میں کچھ شاگردوں نے لکھ بھی لیا، جو آگے چل کر جین مت کے لیے صحائف کے طور پر کام آنے لگا۔ مہاویر اور جین مت کے فلسفے کا خلاصہ ذیل میں دیا جاتا ہے:

i۔ مابعد الطبیعات

مہاویر خود کھتری یعنی حکمران و جنگ جو گھرانے کا فرد تھا اور اس کی مابعد الطبیعات کو کسی حد تک برہمن کے ہندو مذہب و ویدوں کے خلاف بغاوت کہا جا سکتا ہے۔ اس نے پہلا حملہ ویدوں پر کیا اور کہا کہ یہ وید ہندو برہمنوں کے خود تیار کردہ ہیں۔ کوئی برہما یا خدا ہے ہی نہیں تو وہ وید کیسے تخلیق کرے گا؟ نیز وہ خدا کے وجود کا انکار کرتا ہے۔ اس کی دلیل یہ ہے کہ اگر اس کائنات کو خدا یا برہما نے تخلیق کیا ہے تو پھر خدا کو کس نے تخلیق کیا؟ اگر خدا، خود غیر تخلیق شدہ خالق ہے تو پھر یہ کیوں نہ سمجھ لیا جائے کہ یہ کائنات ہی غیر تخلیق شدہ وجود ہے یعنی اس کائنات کا خالق کوئی بھی نہیں ہے یہ ہمیشہ سے ہے اور ہمیشہ رہے گی۔ اگر یہ فرض ہی کرنا ہے کہ کوئی نہ کوئی ہستی عدم سے وجود میں آئی ہوگی تو پھر یہ کیوں نہ فرض کیا جائے کہ یہ کائنات ہی عدم سے وجود میں آئی ہوگی۔ خواہ مخواہ کسی خالق کی ضرورت کیوں محسوس کی جائے۔

بالکل ایسا بھی نہیں ہے کہ جین مت ماننے والے نرے دُہریے ہیں۔ وہ روح پر مکمل یقین رکھتے ہیں اور انفرادی روح جب ریاضتیں کر کے، صحیح علم و عمل کے ذریعے اپنے آپ کو مادی کثافتوں سے پاک کرتی ہے تو وہ کامل روح بن جاتی ہے اور پھر وہ روحِ مطلق کے درجے پر پہنچ جاتی ہے۔ دوسرے لفظوں میں انسانی روح ''نجات'' حاصل کرنے کے بعد خدائی صفات کی ہستی بن جاتی ہے، جس کی پوجا بھی کی جا سکتی ہے۔ جین مت ماننے والے مہاویر و دیگر بزرگوں کی باقاعدہ پوجا کرتے ہیں۔

اگر یہ کائنات خدا کے سوا ازلی و ابدی ہے اور ساری روحیں نجات کے بعد کامل ہو جائیں گی تو پھر اس کائنات کو ہی حقیقتِ مطلق سمجھنا چاہیے، مگر حقیقتِ مطلق ہے کیا؟ کیا ان کو سمجھا جا سکتا ہے؟ جین مت کا جواب یہ ہے کہ حقیقت کسی بھی درجے پر ہو، اسے مکمل طور پر سمجھنا ناممکن ہے۔ انسان زیادہ سے زیادہ اس کے کسی ایک یا چند رُخوں کے بابت جانکاری حاصل کر سکتا ہے۔ انسان کی

عقل محدود ہونے کے باعث اس کی رسائی حقیقت کے تمام رُخوں تک ہونا ناممکن ہے۔ مہاویر اس کے لیے ہاتھی اور اندھوں کی مثال دیتا ہے، کچھ اندھوں نے ایک مردہ ہاتھی کو ہاتھ لگایا اور پھر سب اندھوں کی ہاتھی کے متعلق آراء مختلف تھیں۔ ایک نے کہا ہاتھی پائے جیسا ہے، دوسرا بولا چھاج ہے، تیسرے نے کہا ہاتھی رسّے جیسا ہے۔

مہاویر کے مطابق حقیقت سات (7) اقسام پر مشتمل ہے:

1۔ روح

روح اس کائنات میں سب سے زیادہ علم و ادراک رکھنے والی ہستی ہے اور لامحدود قوتوں کی مالک ہے۔ اعمال کا نتیجہ روح کو ہی بھگتنا پڑتا ہے۔

2۔ غیر روح

غیر روح کی پانچ (5) قسمیں ہیں۔ حرکت (Motion) سکون (Rest) آسمان، مادہ اور وقت، روح کی طرح غیر روح بھی ازلی و ابدی حقائق ہیں۔

3۔ استروتو

اس کا مطلب یہ ہے کہ ہر روح جسم کی قید میں آ جاتی ہے۔ یعنی روح و غیر روح کا ملاپ ہوتا ہے۔

4۔ رُوح و غیر رُوح

روح و غیر روح کے ملاپ کی وجہ سے کچھ توانائیاں پیدا ہوتی ہیں۔
روح و غیر روح کے ملاپ کو روکا جا سکتا ہے۔
پیدا شدہ توانائیاں ختم بھی کی جا سکتی ہیں، کیوں کہ یہ دُکھ اور تکلیف کا باعث ہیں۔
نجات یا چھٹکارہ قابلِ حصول ہے۔

ہندو مذہب کی طرح یہاں بھی آواگون یا کرم اور جنم، موت، زندگی میں اوّلین و سب سے زیادہ اہم حیثیت رکھتے ہیں۔ بلکہ سارے فلسفے کی بنیاد ہی ایک شے یعنی نجات یا چھٹکارے پر ہے۔ ایک جنم کے گناہوں کی سزا روح کو دوسرے جنم میں ملتی ہے، لہٰذا جنم کا دوسرا نام سزا ہے۔ اس جنم کو روکا جائے، ختم کیا جائے یا نجات حاصل کی جائے۔ انسانی زندگی کا سب سے بڑا مقصد جنم لینے، مرنے کے چکر سے آزادی حاصل کرنا ہے۔

یہ نجات یا چھٹکارہ کیسے حاصل کیا جائے؟ جین مت کے مطابق تین (3) ''رتنوں'' سے وہ تین رتن ہیں: ایمان، علم اور عمل۔

درج بالا ساتوں حقیقتوں پر بلاشک وشبہ عقیدہ رکھنے کو ایمان کہا جاتا ہے۔ روح جسم کی قید میں لاعلمی کی وجہ سے آتی ہے۔ روح اور کائنات کے متعلق علم حاصل کرنا انتہائی ضروری ہے۔ آخری رتن اہم ہے یعنی عمل، نیک عمل اور یوگ یا تیاگ ہی دراصل نجات کا حتمی ذریعہ ہے۔

جب روح نجات حاصل کر لیتی ہے تو وہ کامل ہو جاتی ہے اور مکمل سکون کی حالت میں آ جاتی ہے۔ وہ نہ تو کبھی جنم، موت کے چکر میں پڑتی ہے اور نہ ہی کوئی دُکھ جھیلتی ہے۔ وہ مکمل خوشی، اطمینان، سرور اور شادمانی کی انتہا پر پہنچ جاتی ہے اور ہر قسم کی خواہشات وجذبات سے بالاتر ہو جاتی ہے۔

ii۔ اخلاقیاتِ جین اور نیکی☆

جین اخلاقیات کی بنیاد بھی ان کی مابعدالطبیعات پر مشتمل ہے۔ نجات کے لیے جس عمل و نیکی کی ضرورت ہے۔ وہی ان کا نظامِ اخلاق بھی ہے۔ یہ عمل پانچ عظیم نیکیوں پر مشتمل ہے۔

i۔ اہنسا یا عدم تشدد

یہ سب سے اعلیٰ نیکی ہے۔ جان دار خواہ کسی بھی درجے کا ہو، اس کا احترام وحفاظت فرض ہے۔ جین مت کے ماننے والے کسی بھی جان دار کو کوئی نقصان نہیں پہنچاتے ہیں۔ وہ ننگے پاؤں چلتے ہیں اور اپنا راستہ خوب دیکھ کر چلتے ہیں کہ کہیں کوئی کیڑا مکوڑہ نہ مارا جائے۔ وہ کسی پر حملہ کرنے اور کسی کی جان لینے کو گناہِ کبیرہ سمجھتے ہیں، جس کا عذاب روح کو بھگتنا پڑے گا۔ وہ ناک اور منہ پر کپڑا ڈال کر سانس لیتے ہیں۔ مبادا کوئی جان دار سانس کے ساتھ اندر نہ چلا جائے اور مر نہ جائے۔ وہ کھیتی باڑی بھی نہیں کرتے تھے۔ کیوں کہ ایسا کرنے سے ہل چلانا پڑے گا، جس سے کئی کیڑے مکوڑے مارے جائیں گے، البتہ وہ اپنی جان لے سکتے ہیں یعنی مرن برت کے ذریعے خودکشی کر سکتے ہیں۔ اہنسا کا مطلب محض عدم تشدد نہیں بلکہ اس سے بڑھ کر ہے۔ یعنی ہر جان دار سے محبت وشفقت سے پیش آنا۔ ہندوستان میں جگہ جگہ جین مت کی طرف سے بیمار اور ناکارہ جانوروں کے لیے شفاخانے قائم ہیں۔

مہاتما گاندھی اہنسا کے نظریے سے بہت زیادہ متاثر تھا، جس کا وہ ہر وقت پرچار کرتا رہتا تھا۔

☆ فلسفۂ مذاہب از امولیہ رنجن مہاپتر

ii۔ ستیا یا حق

اس کا مطلب ہے کہ جھوٹ کا مکمل طور پر خاتمہ کیا جائے اور ہمیشہ خوشگوار اور اچھی بات کرنی چاہیے۔

iii۔ چوری نہ کرنا

پرایا مال، خواہ وہ کتنا ہی کم یا زیادہ ہو، اس کی حفاظت کی جائے اور اس کے مالک تک پہنچایا جائے۔ امانت میں ذراسی بھی خیانت کی جائے گی تو نجات نہیں ملے گی۔

iv۔ برہمچار یا تجرد

اپنی ہر قسم کی خواہشات کو ترک کرنا، نفس مارنا، ہر قسم کے مزے کی قربانی دینا، شادی نہ کرنا وغیرہ کو اعلیٰ برہمچار یہ نیکی کہا جاتا ہے۔

تیاگ

یہ نیکی سب سے مشکل ہے، دیکھنے، سونگھنے، چکھنے، چھونے اور سننے سے حاصل ہونے والے ہر مزے اور ہر تعلق کو منقطع کرنے کا نام تیاگ ہے۔ آنکھیں بند، کان بند، سر جھکائے خاموش زبان، ہونٹ بند، گھر گھاٹ، بیوی بچے، عزیز و اقارب، یار دوست، معاشرہ اور ریاست وغیرہ سب سے لاتعلق ہو کر، اپنے مَن کو نجات حاصل کرنے کے لیے کسی نکتے پر مرکوز کر کے ہی چھٹکارے کی منزل حاصل کی جا سکتی ہے۔

جین مت کی اخلاقیات و نیکی میں رحم کو بنیادی حیثیت حاصل ہے۔ نیکی کریں تو کسی صلے کے لالچ کے بغیر، دوسروں کی مدد کرنے میں خوشی محسوس کریں، مظلوموں سے ہمدردی کریں، مجرموں پر بھی ترس کھائیں، کھانا کھلائیں، پانی پلائیں، ننگوں کی ستر پوشی کریں، سائباں بنائیں، اخلاق سے پیش آئیں، تسلی دیں وغیرہ وغیرہ جینی طرزِ عمل کی مشہور مثالیں ہیں۔

جین مت میں ذات پات کا کوئی فرق نہیں ہے۔ سب برابر ہیں، نہ کوئی برہمن و کھتری ہے اور نہ کوئی ویش و شودر، نہ کوئی چھوت اور نہ کوئی اچھوت سب برابر ہیں، کسی کو کسی پر فوقیت نہیں ہے۔ آج کل ہندوستان میں جین مت کے پیروکار کافی کم ہیں لیکن پھر بھی ہزاروں میں ہیں۔ سندھ میں کسی دور میں تھر کے ریگستان میں کافی جین تھے اور ان کی یادگاریں آج بھی محفوظ ہیں، جن میں ''گوڑی کا مندر'' کافی مشہور ہے۔

3۔ مادہ پرستی

ہندو فلسفہ زیادہ تر ویدوں اور اپنشدوں پر مشتمل ہے۔ مادہ پرستی کے نشانات بھی رگ وید تک جا پہنچتے ہیں۔ ''مادہ ہی سب سے بڑی حقیقت ہے۔'' اس خیال کا اظہار رگ وید میں برہما ناسپتی نے کیا، اور پھر اس خیال کو بہت سوں نے ترقی دی۔ برہما ناسپتی کے پیروکاروں کو ''چارواک'' کہا جاتا ہے اور مادہ پرستی و چارواک تقریباً ایک ہی مفہوم میں لیے جاتے ہیں، چارواک فلسفے کا خلاصہ پیشِ خدمت ہے۔

i۔ نظریۂ علم

چارواک فلسفے کی بنیاد نظریہ علم پر ہے۔ علم کس طرح حاصل ہوتا ہے؟ اس کا جواب وہ دیتے ہیں کہ ''ادراک سے'' علم کسی بھی الہامی ہستی سے نہیں ملتا۔ یہ تجربہ ہے اور اس سلسلے میں استدلال بھی کچھ نہیں کرتا۔ علم انسان کو صرف حواس کے ذریعے حاصل ہوتا ہے، جب کہ وید یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ وہ الہامی ہیں اور کسی بھی انسان کے تحریر کردہ نہیں ہیں۔ چارواک کہتے ہیں کہ وید بالکل بھی الہامی نہیں ہیں اور وہ ایک نہیں بلکہ کئی لوگوں نے مختلف اوقات میں لکھے ہیں۔ اس کا بڑا ثبوت بھی خود وید ہی ہیں۔ کیوں کہ ''وہ خود ابہام، نامعقولیت و تضادات کا پلندا ہیں۔ ایک وید میں ایک بات ہے تو دوسرے وید میں اس کے بالکل برعکس بات کہی گئی ہے۔ ویدوں کی ایک کتاب کا سچ، دوسری کتاب میں سراسر جھوٹ ہے اور اس کی مذمت کی گئی ہے۔''(1)

1-History of Philosophy Eastern & Western Page:134.

مادہ

اس کائنات کی ہر شے چار بنیادی عناصر سے بنی ہے۔ یعنی ہوا، پانی، مٹی اور آگ۔ یہ چاروں عناصر ازلی وابدی ہیں اور ہر کسی کے حسی ادراک میں آ سکتے ہیں اور یہی اصلی حقیقت ہیں، جو کچھ ہے، وہ صرف مادہ ہے، مادے کے علاوہ کچھ بھی نہیں ہے۔ آتما یا روح ایک فرضی شے ہے جس کا کوئی وجود نہیں ہے۔ آج تک کسی نے آتما کو دیکھا ہے نہ ہی دلائل سے ثابت کیا جا سکتا ہے، جب آتما نہیں ہے تو مرنے کے بعد دوبارہ پیدا ہونا بھی بالکل غلط ہے۔ آواگون کا فلسفہ مذہبی پیداگیروں کا تخلیق کردہ ہے، جس میں کوئی بھی صداقت نہیں ہے۔

شعور

مادہ پرستوں کے نزدیک ایک بڑا مسئلہ یہ رہا ہے کہ مادے سے شعور کس طرح جنم لیتا ہے؟ اس کا جواب بھی چارواک والوں نے دیا ہے۔ نشہ کیا ہے؟ نشہ آور شے مثلاً شراب کا مسئلہ لے لیں۔ شراب پینے سے نشہ ہو جاتا ہے مگر جو اجزاء شراب بنانے میں کام آتے ہیں، ان کو پینے سے کوئی نشہ نہیں ہوتا۔ اسی طرح ذہن کے اندر مادے کے چند اجزاء جب مخصوص تناسب میں یکجا ہوتے ہیں تو شعور پیدا ہوتا ہے، حالاں کہ یہی مادی اجزاء الگ الگ کوئی شعور پیدا نہیں کر سکتے۔ شعور چیسے مادے کی پیداوار ہے اس لیے مادی جسم کی موت سے شعور کی بھی موت واقع ہو جاتی ہے۔ موت کے بعد یہ شعور کسی بھی حالت میں باقی نہیں بچ سکتا۔

خدا

چارواک کہتے ہیں کہ اگر خدا موجود ہوتا اور وہ بھی ہر شے پر قادر اور ہر جگہ پر موجود تو پھر وہ خود ہمارے شکوک وشبہات کو ختم کرتا۔ وہ اس دنیا سے ظلم و بربریت کو ختم کرنے کے ساتھ ساتھ کائنات میں تنظیم پیدا کرتا، مگر ایسا نہیں ہے۔ یہ کائنات نہ تو مکمل طور پر ''کامل'' (Perfect) ہے اور نہ ہی انصاف پر مبنی ہے۔ اگر خدا خود کامل ہے تو وہ ناقص کائنات نہیں بنا سکتا اور اگر خدا کامل نہیں ہے تو وہ خدا نہیں ہے۔ یہ کائنات اور مادہ ہی خدا ہے مادہ ازل سے ہے اور ابد تک رہے گا۔ روح، تناسخ، بار بار جنم لینا اور دوزخ بہشت، ان لوگوں کے تخلیق کردہ ہیں، جن کا روزگار ان سے وابستہ ہے، کوئی مکتی یا چھٹکارہ نہیں ملتا ہے۔

مقصدِ حیات

جب دوزخ محض خوف اور بہشت محض اُمید ہے۔ نجات رکھتی کوئی شے نہیں ہے، عبادتیں خودساختہ ہیں وغیرہ وغیرہ تو پھر مقصدِ حیات کیا ہے؟ اس کا جواب بھی چارواک والوں کے پاس ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ زندگی، زندہ رہنے اور مزے سے زندہ رہنے کے لیے ہے۔ ہندو مذہب اسے ایک لعنت سمجھتا ہے، اس جہان کو دُکھوں کا جہاں سمجھ کر، دوبار جنم لینے سے بچنا چاہتا ہے، لیکن چار واک نہ تو اس دنیا کو بُرا سمجھتے ہیں اور نہ ہی زندگی کے متعلق ان کا رویہ قنوطی ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ کھاؤ، پیو، خوش رہو، زندگی کے مزے لوٹو، تیاگ یا بنواس لینا فضول ہے۔ اس دنیا کی ہر نعمت کو اپنے لیے استعمال کریں۔

اس دنیا کے دُکھ بُرے نہیں ہیں، خراب نہیں ہیں، بلکہ یہ ضروری ہیں تاکہ سکھوں سے لطف اندوز ہوا جا سکے۔ اچھے کھانے کی لذت لینے کے لیے ضروری ہے کہ بھوک جیسی تکلیف، ہو بھوک کے بغیر کھانا لذت نہ دے گا، پیاس کے بغیر پانی فضول ہے۔ دُکھ کے بغیر خوشی بے معنی ہے اور موت کے سوا زندگی کی کوئی قدر نہ ہوتی۔ منفی اشیاء اس لیے ہیں کہ مثبت اشیاء سے پوری طرح لطف اندوز ہوا جا سکے۔ موت کا خوف نہ ہوتا تو کوئی بھی زندگی کی حفاظت نہ کرتا اور زندگی ایک عذاب، ایک بوجھ بن جاتی۔ موت سے ڈر کر زندگی تیاگ نہ کریں، رات کے خوف سے دن کی روشنی کو ضائع نہ کریں۔

چارواک والے برہمن اور اُونچی ذاتوں کے بڑے لتے لیتے ہیں اور ہر انسان کو برابر سمجھتے ہیں اور ہر انسان کی برابر تعظیم کرتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ برہمن کی رگوں کا لہو اور شودر، وِیش وکھتری کا خون سب ایک جیسے ہیں۔

مادہ پرست چارواک قریباً ہر دَور میں رہے ہیں لیکن یہ مذہب کی طرح منظم نہ ہونے کی وجہ سے اکثر گمنامی میں رہتے ہیں یا پھر وہ اپنے خیالات ظاہر نہیں کرتے، کیوں کہ کوئی بھی اپنے مذہب پر تنقید برداشت کرنے کے لیے تیار نہیں ہوتا۔ ہر مذہب اپنے مذہب کو نہ صرف الہامی سمجھتا ہے بلکہ اسے ''خدا کا پسندیدہ ترین دین'' کا لقب بھی دے ڈالتا ہے۔

4۔ گوتم بدھ

کبھی کبھار وقت بڑے کرشمے دِکھاتا ہے۔ کبھی تو صدیوں بلکہ ہزاروں سالوں تک کوئی بڑا آدمی پیدا نہیں ہوتا ہے اور کبھی تو تاریخ کے کسی ایک ہی دَور میں بہت سارے عظیم (Genius) پیدا ہوجاتے ہیں۔ حضرت عیسیٰؑ سے پانچ چھ صدیاں پہلے تاریخ کے آسمان پر کتنے ہی روشن ستارے چمکے، جن کی جوت ابھی تک ماند نہیں پڑی۔ ہندوستان میں مہاویر اور گوتم بدھ، چین میں لاؤزے اور کنفیوشس، یونان میں قبل سقراطی فلسفی، فلسطین میں یہودی دانش ور اور ایران میں زرتشت قریباً ایک ہی دَور کی پیداوار ہیں۔

سن 563ء ق۔م میں ہمالیہ کے دامن میں کپل وستو کے راجہ شدھودانا کے گھر میں ایک شہزادہ پیدا ہوا جس کا نام سدھارتھ رکھا گیا۔ مہاویر کی طرح سدھارتھ کا گھرانہ بھی کھتری جنگ جو تھا، لہٰذا ننھے شہزادے کو شروع سے ہی تلوار بازی اور جنگی فنون سکھائے گئے۔ اس کے علاوہ اپنے وقت کے دانا استادوں نے اسے مذہب و فلسفے کی خصوصی تعلیم دی۔ سدھارتھ کا خاندانی نام گوتم تھا، جو آگے چل کر گوتم بدھ بنا۔ گوتم کی شادی ایک خوب صورت لڑکی سے ہوئی، جس سے اس کے ہاں ایک خوب صورت بیٹا راہول بھی پیدا ہوا۔

نیپال کی حسین وادی کپل وستو کا یہ شہزادہ بڑی پُرسکون اور خوش باش زندگی گزار رہا تھا۔ اس کی طبیعت میں سنجیدگی، فکر اور حساسیت کی کثرت تھی۔

وہ ایک دن اپنے محل کے باہر سیر کر رہا تھا کہ اس کی نظر ایک انتہائی بوڑھے آدمی پر پڑی جو رینگ رینگ کر چل رہا تھا۔ بوڑھے کے چہرے پر دُکھ و تکلیف کے آثار بہت گہرے تھے۔ دوسرے دن پھر اس نے ایک بیمار کو دیکھا جو سوکھ کر ہڈیوں کا ڈھانچہ بن چکا تھا۔ بیمار نہایت اذیت، تکلیف اور دُکھ کی کیفیت سے گزر رہا تھا۔ ان دونوں تکلیف دہ مناظر کا درد دل میں لیے جب تیسرے دن گوتم باہر نکلا تو اس نے ایک میت دیکھی۔ مردے کو قبرستان لے جاتے ہوئے اس کے ورثاء آہ وزاری کرتے ہوئے اپنا سر پیٹ رہے تھے۔

گوتم کے پُرسکون دل میں طوفان برپا ہو چکا تھا۔ اس کے دل میں بڑے بڑے سوالات بچھو کی طرح ڈنک مارنے لگے۔ ''اِن دُکھوں، عذابوں، بیماریوں، بڑھاپے اور موت کا سبب کیا ہے؟ انسان ان عذابوں سے کیوں گزرتا ہے؟ ان عذابوں اور اذیتوں سے انسان کی جان کس طرح نجات پا سکتی ہے۔

زندگی کی رنگینیوں سے اس کا دل اچاٹ ہو گیا اور اس نے فیصلہ کیا کہ سب کچھ چھوڑ کر جنگلوں کا رُخ کرے گا اور بالا سوالات کے جوابات تلاش کرے گا۔ رات کے پچھلے پہر وہ اُٹھا اور اپنی حسین بیوی و بیٹے پر الوداعی نظر ڈال کر بیابانوں کا رُخ کیا۔

گوتم شہزادے سے جوگی بن گیا۔ اس کے کپڑے پھٹ گئے۔ پاؤں ننگے ہو گئے اور بال بڑھ گئے۔ اس نے ریاضتوں کی انتہا کر دی، وہ درختوں کے پتوں اور بیجوں پر گزارا کرنے لگا۔ اس کا جسم مٹی میں بھبھوت ہو گیا۔ نفس کو قابو کرنے کے لیے تن کو تپسیا دینے لگا اور جسمانی تکالیف سے گزرنے لگا۔ پہروں کے پہر ایک ٹانگ پر کھڑا رہتا۔ خوراک گھٹاتے گھٹاتے آخر میں چاول کا ایک دانہ کھانے لگا۔ وہ جسم کو تکلیف دینے کے لیے اپنے بال نوچتا اور انا کو ختم کرنے کے لیے مرگھٹ میں جا کر مردوں کے درمیان سو جاتا تھا، جہاں مردار خور جانور اور گدھیں مردوں کا گوشت کھاتی تھیں۔ اس دوران اس کے ذہن میں انسانی دُکھ و اذیت نمایاں اور اُجاگر ہو جاتے تھے۔ اس کی حالت ایک رینگنے والے کیڑے جیسی ہو گئی۔ جسم ہڈیوں کا ڈھانچہ بن گیا اور خوراک نہ کھانے کی وجہ سے اس کے سارے بال جھڑ گئے۔ ایک دفعہ کئی دِنوں کی بھوک میں جب کھانے کو کچھ اور نہ ملا تو چوپائے کا گوبر بھی کھایا۔ اس حالت میں چھ سال گزارے۔

ایک دن اپنی حالت پر غور کرتے ہوئے گوتم اس نتیجے پر پہنچا کہ حقیقت کو سمجھنے کے لیے یہ

طریقہ درست نہیں تھا۔ خود کو مسلسل عذاب دینے سے بھی انسان میں ایک قسم کا تکبر و فخر پیدا ہو جاتا ہے۔

گوتم نے تیاگ ختم کیا اور پیپل کے درخت کے نیچے یوگا کا ایک آسن جما کر بیٹھ رہا اور تہیہ کر لیا کہ جب تک اسے نروان نہیں ملے گا، تب تک وہ اس درخت کے نیچے ہی بیٹھا رہے گا۔ آخر انسانی دُکھوں، عذابوں، بیماریوں، بڑھاپے اور موت کا سبب کیا ہے؟ یہ سوال مسلسل اس کے ذہن میں گردش کرتا رہا تو اچانک اسے اس سوال کا جواب مل گیا اور اسے نروان حاصل ہو گیا۔☆

میں نے اپنا ذہن ایک نکتے پر مرکوز رکھا اور مجھے خالص، گہری و مافوق الانسانی بصیرت حاصل ہو گئی، جس سے میں نے خود کو مرتے اور پھر جنم لیتے ہوئے دیکھا اور یہ سلسلہ جاری رہا۔ ہر جنم میں دُکھ، اذیتیں، عذاب اور تکلیفیں وغیرہ پہلے جنم سے بھی زیادہ تھیں۔ ایک جنم کے گناہوں کی سزا، انسان دوسرے جنم میں بھگت رہا تھا۔ بس میں بات سمجھ گیا اور مجھے میرے سوالات کا جواب یہ ملا کہ انسانی دُکھوں کی بڑی وجہ انسانی جنم ہے۔(1)

نروان حاصل کرنے کے بعد گوتم، جو اب گوتم بدھ بن چکا تھا، وہ شاگردوں کو باقاعدہ درس دینے لگا۔

گوتم کی تعلیم

اس وقت کے دستور کے مطابق گوتم بدھ ایک درخت کے نیچے بیٹھ کر درس دیتا تھا اور پھر ایک گاؤں سے دوسرے گاؤں اور ایک شہر سے دوسرے شہر کا سفر جاری رکھتا تھا۔ اس کے پیروکاروں کی تعداد بڑھنے لگی۔ آخر کار جب وہ سفر کرتا تھا تو بارہ سو پیروکار یا بھکشو بھی ہمراہ ہوتے۔

مہاویر کی طرح گوتم نے بھی ویدوں کی الوہیت سے انکار کیا اور کہا کہ یہ برہمنوں کے تخلیق کردہ ہیں۔ وہ ہندو نظام میں مروج پروہتی نظام کے سخت خلاف تھا، جس میں بابے، مہاراج، برہمن اور دوسرے مذہبی پیشوا اپنے پیٹ بھرنے کے لیے سادہ و جاہل لوگوں کو بے وقوف بنا کر چالاکی سے ٹھاٹ باٹ کی زندگی گزار رہے تھے۔

گوتم بدھ مہاویر کی طرح اہنسا کا بڑا پچاری تھا۔ ہر جان دار کو جینے کا حق ہے اور ہر بھکشو کا فرض ہے کہ ہر جان دار کی خبر گیری کرے اور ان کو کوئی تکلیف نہ دے۔ جنگ جو قبیلے کے شہزادے کو

☆ اس درخت کا تنا اور وہ جگہ ابھی تک محفوظ ہے اور اسے دانائی کا درخت کہا جاتا ہے۔

1-Our Oriental Heritage By: Will Durrant, Page:427.

جنگ، لڑائی و خون ریزی سے نفرت تھی۔ اس کا پیغام، محبت کا پیغام تھا۔ حضرت عیسیٰؑ سے پانچ صدیاں پہلے گوتم نے حضرت عیسیٰؑ کی ہی بات کی یعنی نفرت کا جواب محبت سے دیں۔ تشدد کا جواب اہنسا سے دیں کسی بحث یا تکراری معاملے میں صبر سے کام لیں۔ نہ صرف محبت کریں بلکہ ہر انسان اور دوسرے جانداروں سے ہمدردی و رحم کا برتاؤ کریں، ان کی مدد کریں، ان کے کام آئیں۔ ایک دفعہ کسی آدمی نے گوتم بدھ سے گالی گلوچ کی۔ گوتم سکون سے سنتا رہا اور آخر میں کہنے لگا ''بیٹا! اگر کوئی کسی کو تحفہ دے، لیکن وہ آدمی تحفہ لینے سے انکار کر دے تو یہ تحفہ کس کا ہوا؟''

''یہ تحفہ دینے والے کا ہی ہوگا۔'' اس آدمی نے جواب دیا۔

بیٹا پھر میں تمہارا دیا ہوا تحفہ قبول کرنے سے انکار کرتا ہوں۔ گوتم نے سکون سے کہا۔

گوتم کے چار سچ

گوتم نے اپنی تعلیمات کو موثر بنانے کے لیے ان کو مختلف تشریحات یعنی خلاصوں میں تقسیم کیا۔ گوتم بدھ کی پسندیدہ تشریح چار سچ تھی۔ وہ جہاں بھی جاتا تھا، اپنے پیروکاروں کو یہ چار سچ ضرور بتاتا تھا۔

i۔ ''او بھکشو! یہ عظیم سچ ہے دُکھ اور عذاب کی پیدائش عذاب ہے، بڑھاپا عذاب ہے، بیماری عذاب ہے، موت عذاب ہے، دُکھ ہے۔''

ii۔ ''او بھکشو! دوسرا عظیم سچ ہے دُکھ کے سبب کا اور عذابوں اور دُکھوں کا باعث ہے، خواہش اور تمنا۔ خواہش دُکھوں کا بڑا سبب ہے۔ مزے اور مسرت کی خواہش، نفسانی و جنسی خواہش، زندگی سے لطف اندوز ہونے کی خواہش، دولت و طاقت کی خواہش، وجود بچانے کی خواہش، اُمر ہونے کی خواہش، جنسی خواہش کے نتیجے میں پیدائش ہوتی ہے اور جنم، موت کے چکر میں انسان عذاب بھگتتا ہے۔''

iii۔ ''او بھکشو! تیسرا عظیم سچ ہے، ان دُکھوں کے خاتمے کا، دُکھ کے محرک اور وجوہات ختم کریں تو دُکھ ختم ہو جائیں گے۔ یعنی خواہش کا خاتمہ دُکھوں کا خاتمہ ہے۔''

iv۔ ''او بھکشو! چوتھا عظیم سچ ہے۔ دُکھوں کے خاتمے کا راستہ، بھکشو یہ عظیم راستہ آٹھ منازل پر مشتمل ہے جو یہ ہیں: درست نظر، درست ارادہ، درست گفتگو، درست رویہ، درست کمائی، درست کوشش، درست سوچ اور درست مراقبہ۔''

بدھ اخلاقیات

بدھ کی بالا چاروں عظیم صداقتوں کی چھان بین کرنے سے پتا چلتا ہے کہ بدھ مت ایک اعلیٰ اخلاقی اور نیکی پر مشتمل نظام ہے۔

دُکھ کو ختم کرنے کے آٹھ نکاتی منصوبے کا پہلا نکتہ ہے درست نظر یعنی کسی بات کو سمجھنے کے لیے درست علم، لاعلمی کا خاتمہ پہلا اور اہم نکتہ ہے۔ دوسرا نکتہ قوتِ ارادی کو مضبوط کرنے کا درس دیتا ہے اور تیسرا نکتہ یعنی درست گفتگو کا مطلب ہے سچ بولنا، جھوٹ بولنے سے پرہیز، اچھی ودھیمی گفتگو، فضول و دل آزار گفتگو سے پرہیز۔ چوتھا نکتہ ہے درست رویہ یعنی ہر کسی سے اچھا برتاؤ، ہمدردی کرنا، دوسروں کے کام آنا، کسی کو نقصان نہ پہنچانا وغیرہ۔ پانچواں نکتہ ایمان داری کا درس دیتا ہے۔ کاروبار روزگار جائزہ ہو۔ دھوکے، بدعنوانی، رشوت، چوری، ڈاکے سے مکمل طور پر گریز کیا جائے۔ چھٹا نکتہ درست کوشش یعنی ایمان دارانہ و جائز کوشش پر زور دیتا ہے اور ساتواں نکتہ عقل وضمیر سے کام لینے کی تلقین کرتا ہے۔ بُرے خیالات دماغ سے نکال دیئے جائیں اور درست سوچ کے ذریعے خواہشوں کے جال سے چھٹکارا حاصل کیا جائے، جب انسان ان ساتوں نکات پر عمل کرے تو وہ آٹھویں نکتے یعنی مراقبے پر عمل کرنے کے قابل بن جاتا ہے۔

بدھ نے پانچ اخلاقی فرمان جاری کیے، جو کہ دریا کو کوزے میں بند کرنے کے مترادف ہیں، ان فرمانوں کا بیٹھ کر تجزیہ کیا جائے تو ایک الگ کتاب تیار ہو جائے گی۔ وہ پانچ فرمان یہ ہیں:

۱۔ کسی جان دار کو ہلاک نہ کریں۔

۲۔ جو آپ کو دیا نہیں گیا وہ ہرگز نہ اُٹھائیں۔

۳۔ جھوٹ نہ بولیں۔

۴۔ کوئی بھی نشہ آور چیز استعمال نہ کریں۔

۵۔ بدکاری نہ کریں۔ پاکبازی اختیار کریں۔

بدھ کی لاادریت

بدھ نہ صرف ویدوں کی الوہیت سے انکار کرتا ہے بلکہ کسی خدا کی عبادت کرنا بھی ضروری نہیں سمجھتا۔ خدا کے وجود کو ثابت کرنے کے لیے دی گئی دلیلوں کو خود ساختہ و بچگانہ قرار دیتے ہوئے، ان کو رد کرتا ہے۔ خدا کے بابت اس کا رویہ خاموشی کا ہے۔ وہ نہ تو کھلے لفظوں میں مکمل انکار کرتا ہے

اور نہ ہی واضح طور پر انکار کرتا ہے۔

وہ خدا کے حضور پیش کی جانے والی جانوروں اور دوسری قربانیوں کی سخت الفاظ میں مذمت ومخالفت کرتا ہے۔اس کے فلسفے کی بنیاد خیالی مابعدالطبیعات کے بجائے عملی اخلاقیات پر ہے اوراس کا انداز کسی بھی طرح کے عقیدے کے بجائے عقلی واستدلالی ہے، جوکہ آج کل کی نتائجیت (Pragmatism) کےقریب تر ہے۔

گوتم بدھ کا نروان

گوتم کی ساری تپسیا اوراس کے اخلاقی نظام کا حاصل مطلب یہ ہے کہ نروان حاصل کیا جائے، مگر یہ نروان ہے کیا؟ اسے کوئی حتمی لفظی معنی دینا تو کچھ مشکل ہے مگراس کا مفہوم واضح ہے۔ سنسکرت میں نروان کا طلب ہے''بجھانا اور ختم کرنا'' اوراس کا مفہوم بنتا ہے خواہشات کی آگ کو بجھانا۔ دیگر معانی یہ ہیں، آواگون یعنی دوبارہ پیدائش سے نجات،انفرادی شعور کا خاتمہ،مرنے کے بعد خوشی وسکون حاصل کرنا،اگران تمام مفاہیم کوبدھ کے تناظر میں رکھ کرنروان کا کوئی ایک مفہوم واضح کیا جائےتو وہ ہوگا''ہرقسم کی خواہشات کے خاتمے کے ذریعے،ازلی دُکھوں سے نجات۔''

گوتم کے آخری ایام

گوتم بدھ کے خیالات تیزی سے پھیلنے لگےاور یہ ہرجگہ مقبول ہونے لگے جوں جوں اس کی عمر بڑھتی گئی اس کے اندرونی سکون میں اضافہ ہوتا چلا گیا، جوکہ اس کے چہرے سے ہی ظاہر تھا۔ آگے چل کر جب اس کے پیروکاروں نے اس کے مجسمے بنائے تو ان میں بدھ کوکسی درخت تلے چوکڑی مارے،آنکھیں بند کیے مراقبے میں بیٹھادِکھایا گیا،جس میں اس کے چہرے پرلافانی ولازوال سکون جھلک رہا ہوتا ہے۔

وہ سفر اور سیر کرتے ہوئے ایک دن کپل وستو کی وادی میں جانکلا۔اس کا باپ راجہ شدھودھانہ بہت خوش ہوااوراس کے اعزاز میں بڑی دعوت کی۔گوتم کا بیٹا راہول جوان ہوچکا تھا جو گوتم کے یوگی ہونے کی وجہ سے ولی عہد تھا۔اپنے باپ کی باتیں سن کر راہول بھی اپنے دادا کے تاج وتخت کوٹھکرا کر، گیروی کپڑے پہن کر بھکشو بن گیا۔راجا شدھودھانہ کودُکھ تو بہت ہوالیکن اس نے اپنی دوسری بیوی کے بطن سے پیدا ہونے والے بیٹے نندا کوولی عہد قرار دے دیالیکن گوتم بدھ کا سحر، کسی ریاست کی نوابی سے کئی گنا زیادہ تھا۔نندا بھی کچے دھاگے میں بندھا، ننگے پاؤں آ کر بدھ کا

بھکشو بن گیا۔ راجا شدھو بہت دُکھی ہوا اور گوتم بدھ سے کہنے لگا: اولاد کی محبت اور جدائی، جسم کو چیرتی ہوئی، خون کو جلاتی ہوئی، ہڈیوں کو پگھلاتی ہوئی، دل کو چھلنی کر رہی ہے۔ اے درویش گوتم! مہربانی کر کے یہ فرمان جاری کر دو کہ آج کے بعد کوئی بھی بیٹا تمہارا بھکشو بننے کے لیے اپنے والدین سے اجازت ضرور لے۔'' گوتم بدھ نے والد کی بات کو مان دیتے ہوئے ایسا فرمان جاری کر دیا۔

سن 483ق۔م میں چہرے پر بے پناہ سکون اور دھیمی مسکراہٹ سجائے تاج و تخت کو ٹھکرانے والا کپل وستو کا شہزادہ اپنے لاکھوں بھکشوؤں کو سوگوار چھوڑ کر 80 سال کی عمر میں اس دنیا کو خاموشی سے الوداع کہہ گیا۔

گوتم بدھ کا اثر

گوتم نے ساری زندگی ہر قسم کی قربانی و عبادت کی مخالفت کی مگر اس کے انتقال کے بعد اس کی ہی پوجا شروع ہو گئی۔ جگہ جگہ اس کے مجسمے نصب ہو گئے اور بھکشو اسے ایک عظیم نروان یافتہ اور نجات یافتہ روح سمجھ کر پوجنے لگے۔ حالاں کہ گوتم نے کئی دفعہ یہاں تک کہا تھا کہ ''بھکشو! مجھ پر اعتماد کرنے کے بجائے اپنی عقل استعمال کریں۔ مَیں غلط بھی ہو سکتا ہوں۔''

بدھ کے فلسفے کا مرکز انسان ہے۔ انسان کے دُکھ اور ان کا خاتمہ، بدھ کے نزدیک بہت اہم ہے۔ اس کا پیغام محبت کا پیغام ہے۔ اہنسا اور عدم تشدد کا پیغام ہے، مساوات کا پیغام ہے اور پورے عالم انسانیت کی بھلائی کے لیے سچائی، دیانت داری اور راست گوئی کا پیغام ہے۔

یہ پیغام تیزی سے ہر طرف پھیلا۔ نیپال و ہندوستان سے ہوتا ہوا موجودہ پاکستان، افغانستان، وسطی ایشیا اور روس تک پہنچا۔ دوسری طرف مشرقِ بعید سے ہوتا ہوا، خصوصاً جاپان و چین میں انتہائی مقبول ہوا۔ پورے ایشیا میں جگہ جگہ بدھ کے آثار موجود ہیں۔

بدھ مت میں کئی فرقے پیدا ہوئے لیکن نروان ان کا مرکزی نکتہ ہے، جس پر سب متفق ہیں۔ ہندوستان کا عظیم فلسفی شہنشاہ اشوکا بھی بدھ مت کا پیروکار ہو گیا تھا اور بے شمار مقامات پر بدھ کے مجسمے نصب کروائے۔

زمانے کی گرد ہر نظریے کو دُھندلا دیتی ہے مگر آج بھی گوتم کے فلسفۂ انسانیت، محبت، ہمدردی اور اہنسا کے کروڑوں پرستار موجود ہیں۔

مسلمان فیلسوف

عالمِ اسلام میں فلسفے کی باقاعدہ ابتداء تو عباسی دَورِ خلافت میں ہوئی، لیکن اس کی بنیادیں یقیناً ماضی کی مٹی میں کافی گہری ہیں۔

سکندرِ اعظم کے تعمیر کرائے گئے شہر الیگزینڈریا (اسکندریہ) کو سکندر کی وفات کے بعد اس کے جرنیل بطلیموس نے اپنا دارالحکومت بنایا اور اس میں یونانی علوم، ادب، سائنس، طب اور فلسفے کی ہزاروں کتب منگوا کر ایک عالی شان میوزیم میں رکھوائیں۔ اس کے ساتھ ساتھ بے شمار عالم بلوا کر وہاں درس وتدریس کا کام بھی شروع کرایا۔

وقت کی ظالم تلوار رومیوں کا ہتھیار بن کر یونانیوں پر گری اور یونان کا وہ حشر ہوا جو بعد میں منگولوں کے ہاتھوں بغداد کا ہوا تھا۔ یونان کے بعد الیگزینڈریا یونانی علوم، فنون اور سائنس کا بڑا مرکز بن گیا۔

سکندر جب ہندوستان سے واپس لوٹا تو بظاہر تو سیاسی طور پر فاتح بن گیا تھا لیکن ذہنی طور پر وہ ہندوستان اور مشرقی تصوف کا مفتوح بن کر گیا تھا۔

اسکندریہ میں یونانی عقل پرستی اور مشرقی تصوف مِل کر ایک ہو گئے اور نوافلاطونیت (Neo-Platonism) کا نظریہ وجود میں آیا۔

نوافلاطونیت کے بانی پلاٹینوس کی وفات کے بعد اس کے شاگرد فرفوریس (Prophyrus)

نے افلاطون اور ارسطو پر شرحیں لکھیں اور یہ ثابت کرنے کی کوشش کی کہ افلاطون وارسطو کے فلسفے میں کوئی بنیادی فرق نہیں ہے۔ (حالاں کہ بڑا فرق ہے)

اسکندریہ میں افلاطون، ارسطو، پلاٹینوس، فرفوریس سمیت کئی عالموں اور فلسفیوں کی کتابیں عربی زبان میں ترجمہ ہوئیں۔ یوں یونانی فلسفہ اور یونانی عقل پرستی اسلام میں داخل ہوئی۔

لوگ اسلام کی اندھی تقلید کے بجائے اسلامی عقائد کو عقل کی روشنی میں دیکھنے لگے اور اسلامی عقائد کی تاویلیں عقل کے مطابق کرنے لگے۔ دوسرے لفظوں میں یوں کہا جائے کہ فلسفے و مذہب میں اختلاف ختم کر کے ان کو ایک دوسرے سے ہم آہنگ بنانے کی کوشش کی گئی، کسی دانش ور کے بقول ایک نئے مذہبی فلسفے یا فلسفیانہ مذہب کی ابتدا کی گئی۔

مسلمانوں میں فلسفیانہ سوچ و عقل پرستی بنو اُمیہ کی ظالمانہ پالیسیوں کی وجہ سے بھی پیدا ہوئی۔

امویوں نے خلافت کو ملوکیت میں تبدیل کر کے حکومت کو صرف اپنے خاندان تک محدود کر کے رکھ دیا۔ سوائے عمر بن عبدالعزیز کے باقی سارے امیر حکمران بڑی حد تک عیاش اور ظالم تھے۔ عیاشیوں کے لیے پیسہ بیت المال کا استعمال ہونے لگا۔ آہستہ آہستہ امیر حکمران عوام سے دُور ہوتے گئے اور حکومت کرنے کے لیے سیاست کے بجائے تلوار استعمال کرنے لگے۔ سیاسی مخالفین کا جس قدر خون اس دور میں بہا شاید ہی کہیں اور بہا ہو۔ اس کے علاوہ امویوں نے مسلمان علماء کی ایک بڑی تعداد اپنے پاس تنخواہ پر رکھ لی، جس کا کام یہ تھا کہ وہ مخالفین کے خلاف کفر اور واجب القتل کے فتوے جاری کرنے کے علاوہ امویوں کے ہر فعل کے لیے کوئی نہ کوئی مذہبی جواز تلاش کریں۔ ان علماء نے امویوں کے مظالم کا جواز یہ پیش کیا کہ جو کچھ ہوتا ہے، خدا کی رضا سے ہوتا ہے، لہٰذا بنو امیہ کے مظالم کو صبر سے برداشت کرنا چاہیے۔ کیوں کہ بنو اُمیہ کے خلاف احتجاج کا مطلب خدا کی منشاء کے خلاف احتجاج ہے، جو کہ سراسر کفر ہے۔ انھوں نے حکمرانوں کی عیاشیوں کا یہ جواز پیش کیا کہ ''ایمان کا تعلق بنیادی طور پر عقیدے سے ہے عمل سے نہیں۔ لہٰذا اگر اُموی خاندان کا ایمان مضبوط ہے تو یہ کچھ بھی کر سکتے ہیں اور ان پر نماز پڑھنے یا دیگر فرائض ادا کرنے کی کوئی پابندی نہیں ہے۔''(۱)

یہ وہی علماء کرام تھے جنھوں نے حضرت امام حسینؑ کو واجب القتل قرار دیا تھا۔ ان علماء کرام اور ایسی سوچ رکھنے والوں کو بعد میں ''مرجیہ'' کے نام سے پکارا گیا۔

(۱)۔ اقبال کا علم الکلام۔ از علی عباس جلالپوری، صفحہ ۱۳۔

مرجیہ کے خلاف جو سوچ پیدا ہوئی وہ یہ تھی کہ خدا عادل ہے، وہ نہ تو خود ظلم کرتا ہے اور نہ ہی ظالم کی سرپرستی کرتا ہے۔ انسان کو اپنے اعمال پر قدرت و اختیار ہے لہٰذا انسان ہی اپنے اعمال کا ذمہ دار ہے۔ بالفاظِ دیگر بنواُمیہ کے مظالم کا ذمہ دار خدا نہیں بلکہ خود بنواُمیہ ہیں اور ان کے خلاف احتجاج ہرگز بھی خدا کے خلاف احتجاج نہیں ہے۔ ایسی سوچ رکھنے والوں کو ''دریہ'' کہا گیا جو بعد میں ''معتزلہ'' کہلائے۔

معتزلہ

بصرہ کی جامع مسجد میں حسن بصری کا درس ہوتا تھا۔ ایک دن اس کا ایک شاگرد اُٹھ کھڑا ہوا اور کہنے لگا ''آج کل ایک ایسا فرقہ پیدا ہو چکا ہے جو کہتا ہے کہ گناہِ کبیرہ کا مرتکب شخص کافر ہے اور دوسرا فرقہ کہتا ہے کہ گناہِ کبیرہ ایمان کا حصہ نہیں ہے۔ وہ کہتے ہیں، جس طرح ایمان نہ رکھنے والے شخص کے لیے عبادت بے فائدہ ہے۔ اسی طرح ایمان رکھنے والے شخص کو گناہ کوئی نقصان نہیں پہنچا سکتے۔ آپ کے خیال میں سچ کیا ہے؟''

حسن بصری کے جواب دینے سے قبل، اس کا ایک دوسرا شاگرد واثق بن عطا کھڑا ہو گیا اور جواب دیا ''گناہِ کبیرہ کا مرتکب شخص نہ تو مکمل کافر ہے اور نہ ہی کامل ایمان والا، یہ دونوں کے بیچ میں ہے، جسے ''منزل بین المنزلتین'' کہنا چاہیے۔ یہ کہہ کر واثق بن عطا جامع مسجد کے دوسرے کونے تک گیا اور وہاں بیٹھے لوگوں کو اپنا موقف بتانے لگا۔ حسن بصری نے یہ صورتِ حال دیکھ کر کہا ''اعتزلہ انا'' یعنی یہ ہم سے علاحدہ ہو گئے۔ اس کے بعد واثق بن عطا جیسے خیالات رکھنے والے اکٹھے ہو گئے، جن کو معتزلہ کہا گیا، جس کا مطلب ہے ''وہ جو علاحدہ ہو گئے'' واثق بن عطا کا سن 748ء میں انتقال ہوا۔

معتزلہ کے خیالات کو عباسی خلیفوں، منصور، ہارون اور مامون الرشید کے دور میں بڑی ترقی ملی۔ مامون الرشید خود بھی ایک بڑا معتزلہ مفکر تھا اور اس کے دربار میں بڑے بڑے مذاکرے ہوا کرتے تھے۔

معتزلہ فکر کا اختصار ذیل میں دیا جاتا ہے:

۱۔ خدا عادل ہے اور اس کے عدل و انصاف کا تقاضا یہی ہے کہ انسان کو اس کے گناہوں کی سزا دی جائے جو اس نے اپنی مرضی و اختیار سے کیے ہیں۔ اگر یہ تسلیم کر لیا جائے کہ سب کچھ خدا کی مرضی سے ہوتا ہے یا انسان وہ کچھ کرتا ہے جو خدا نے اس کی تقدیر میں لکھ دیا ہے تو پھر انسان بے قصور

ثابت ہو جاتا ہے۔ اگر انسان کے بُرے اعمال بھی خدا کی منشاء سے ہوتے ہیں اور انسان کا ان پر کوئی اختیار نہیں ہے تو پھر انسان کو سزا دینے کا مطلب یہ ہے کہ خدا (نعوذ باللہ) عادل نہیں ہے۔ انسان اپنے اعمال کے سلسلے میں خود مختار اور با اختیار ہے۔ لہٰذا تقدیر کا کوئی وجود نہیں ہے۔

۲۔ خدا ظالم نہیں ہے۔ خدا انسان پر کبھی بھی اتنا وزن نہیں ڈالتا کہ وہ اُٹھا نہ سکے یا کبھی بھی انسان کو اتنی سزا نہیں دیتا کہ وہ برداشت نہ کر سکے۔ معتزلہ نے مولویوں کی اس بات کو رد کیا کہ ''اشیاء اس لیے خراب اور اچھی ہیں کہ خدا نے ان کو خراب اور اچھا قرار دیا ہے۔''

معتزلہ کا موقف ہے، خدا نے خراب اشیاء کو خراب اور اچھی اشیاء کو اچھا قرار دیا ہے۔ اشیاء کی خرابی اور اچھائی ان اشیاء کے جوہر میں موجود ہے۔''

۳۔ خدا کو اس دنیا یا اگلے جہان میں انسانی آنکھوں سے دیکھا نہیں جا سکتا۔

۴۔ قرآن، خدا کا تخلیق کردہ ہے۔ قرآن خدا جتنا قدیم نہیں ہے۔ قرآن کو اس وقت تخلیق کیا گیا جب نبوتِ اسلام کو تخلیق کیا گیا۔

۵۔ خدا کا غصہ اور خوشی خدا کی صفات نہیں ہیں کیوں کہ غصہ اور خوشی کیفیتیں ہیں اور کیفیتیں تبدیل ہوتی رہتی ہیں۔ اگر یہ خدا کی صفات مان لی جائیں تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ خدا بھی تبدیل ہوتا رہتا ہے، جو کہ معتزلہ کے مطابق درست نہیں ہے اور شرک ہے۔

۶۔ قبر کے عذاب اور منکر نکیر کا کوئی وجود نہیں ہے۔

۷۔ قیامت کی کوئی بھی نشانیاں نہیں ہیں یا جوج ماجوج اور دجال وغیرہ غیر حقیقی ہیں۔

۸۔ خدا علیم ہے۔ اسے کراماً کاتبین جیسے فرشتوں کی کوئی ضرورت نہیں ہے، جو اعمال لکھیں گے اور پھر قیامت کے دن پیش کریں گے۔

۹۔ حوضِ کوثر اور پُل صراط کا کوئی وجود نہیں ہے۔ یہ محض استعاراتی طور پر استعمال ہوئے ہیں۔ دوزخ اور جنت بھی قیامت کے دن تخلیق کیے جائیں گے۔

۱۰۔ معتزلہ وعدہ میثاق کا بھی انکار کرتے ہیں۔

۱۱۔ معتزلہ معراج کو بھی استعاراتی طور پر لیتے ہیں اور صرف یہ تسلیم کرتے ہیں کہ حضرت محمد (ﷺ) نے صرف یروشلم کا سفر کیا تھا۔

۱۲۔ عبادت کا فائدہ صرف عبادت کرنے والے کو ہوتا ہے۔ اس کا ثواب کسی دوسرے کی طرف منتقل

نہیں کیا جا سکتا۔

۱۳۔ سچا مجتہد کبھی بھی غلطی نہیں کر سکتا، لہٰذا اجتہاد کا دروازہ ہمیشہ کھلا رکھنا چاہیے۔ اس کے علاوہ بھی دیگر کئی باتیں ایسی تھیں جن کے بابت معتزلہ اور راسخ العقیدہ علماء میں واضح تضاد تھا۔

مامون الرشید کے دربار میں معتزلہ کو بڑی اہمیت و مقام ملا، لیکن تاریخ نے یہ ثابت کیا ہے کہ کوئی بھی مذہب، فلسفہ یا نظریہ، اگر حکمرانوں کے ہاتھ آجاتا ہے تو وہ اسے سیاسی ہتھیار کے طور پر استعمال کرتے ہیں۔ معتزلہ کا بھی یہی حشر ہوا۔ مامون الرشید نے معتزلہ فکر کو سرکاری حیثیت دے کر یہ فرمان جاری کیا کہ ''سلطنتِ عباسیہ کے ہر مسلمان پر یہ فرض ہے کہ وہ قرآن کو مخلوق سمجھیں اور معتزلہ فکر کو صحیح مانیں، دوسری صورت میں ان کی گواہی بھی قبول نہیں کی جائے گی اور معتزلہ فکر کے منکرین کو سزا دی جائے گی۔''

معتزلہ فکر کی مخالفت حنبلی فقہ اور اشعریوں نے کی۔ امام حنبل کو تو معتزلہ کی مخالفت کی وجہ سے جیل میں بھی ڈالا گیا۔ حنبلی اور اشعری، معتزلہ فکر کے سخت مخالف ثابت ہوئے، جنھوں نے آگے چل کر خلیفہ متوکل کے دَور میں معتزلہ سے مفکرین کا بہت برا حال کیا اور انھیں ہر قسم کا عذاب دیا، حنبلیوں اور اشعریوں کے خیالات یہ تھے:

''خدا کا جسم ہے، انسان اسے اپنی ظاہری آنکھوں سے دیکھ سکتا ہے۔ خدا کی مرضی ہے کہ وہ عدل کرے یا ظلم، انسان تقدیر کے سامنے بے بس ہے اور اس کا ہر عمل پہلے سے متعین شدہ ہے۔ انھوں نے سبب و نتیجے یا علت و معلوم کی مخالفت کی۔ یعنی کوئی بھی تبدیلی کسی سبب یا علت کے بجائے نہیں ہوتی ہے۔ مثال کے طور پر معتزلہ کہتے ہیں کہ بیماری ایک نتیجہ ہے اور اس کا سبب دریافت کر کے اس کا علاج کرنا چاہیے۔ اشعری کہتے ہیں کہ بیماری کوئی سبب نہیں ہے اور یہ خدا کی طرف سے ہے۔ لہٰذا وجہ ڈھونڈنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ مسلمانوں کو جتنا نقصان اشعریوں کے اس نظریے نے پہنچایا ہے، اتنا نقصان شاید کسی اور نظریے نے نہیں پہنچایا ہے۔ کیوں کہ سائنس کی بنیاد ہی (Cause and Effect) علت اور معلول پر ہے۔ علت و معلول کی مخالفت نے مسلمانوں کو سائنسی تحقیق سے بہت زیادہ دُور کر ڈالا۔''

اگر بیماری کا کوئی سبب نہیں ہے تو پھر سبب تلاش کرنے کی تحقیق بھی بند ہوگئی یا مولویوں کے خوف سے بند کر دی گئی۔ نتیجے کے طور پر علمِ طب، کیمیا، حیاتیات اور نباتات کی تحقیق جہاں تھی

وہاں رُک گئی، جب زلزلوں، طوفانوں، برساتوں، گرمیوں اور سردیوں کا کوئی سبب نہیں ہے تو پھر کسے ضرورت پڑی ہے کہ وہ علم ارضیات، موسمیات، فلکیات یا حرکت کے قوانین کو سمجھنے کی کوشش کرے۔ علی عباس جلال پوری ڈاکٹر سخاؤ کا حوالہ دیتے ہوئے لکھتے ہیں "اگر عالمِ اسلام میں اشعری اور غزالی نہ ہوتے تو مسلمانوں میں آج جانے کتنے گلیلو اور نیوٹن پیدا ہو چکے ہوتے۔"(۱)

الکندی

مسلمانوں میں پہلا اور غالباً آخری عرب باقاعدہ فلسفی ابو یوسف یعقوب بن اسحاق الکندی سن 801ء میں کوفے کے گورنر کے گھر میں پیدا ہوا۔ عربی گرائمر، ادب، فقہ اور علمِ کلام کی تعلیم حاصل کرنے کے بعد یونانی سائنس اور فلسفے میں گہری دلچسپی لی اور یونانی شاہکار کتابوں کے تراجم اور تشریحات کیں، جو 270 کے قریب ہیں، جن میں فلسفہ، نفسیات، فلکیات، جامیٹری، طب، موسیقی اور دیگر کئی موضوعات شامل ہیں۔

کندی عباسی حکومت کے قریب تھا اور اسے خلیفے معتصم کا استاد بھی مقرر کیا گیا۔ اس کی لائبریری میں بے شمار کتب تھیں۔ اس کے فلسفے کا اختصار پیش کیا جاتا ہے۔

ا۔ مذہب اور فلسفے میں مصالحت

مذہب و فلسفے کا جھگڑا پُرانا ہے لیکن کندی نے دونوں میں مصالحت کرانے کی کوشش کرتے ہوئے مندرجہ ذیل نکات بیان کیے:

i۔ الاہیات فلسفے کی شاخ ہے۔

ii۔ فلسفیانہ سچ اور وحی کے ذریعے ملنے والا سچ دونوں ایک ہی ہیں اور ان میں کوئی اختلاف نہیں ہے۔

iii۔ سائنسی علوم کا حصول مذہب کے عین مطابق ہے۔

کندی معتزلہ دَور میں رہ رہا تھا اور وہ خود بھی بڑا معتزلہ مفکر تھا۔ لہٰذا اس نے اس بات پر زور دیا کہ قرآن کی تشریح عقل و منطق کے مطابق ہونی چاہیے اور لفظوں و استعاروں کے عقب میں مخفی اور اصل معانی سمجھنے چاہئیں۔

---

(۱)۔ اقبال کا علم الکلام۔ از علی عباس جلالپوری، صفحہ ۳۹۔

۲۔ خدا تعالیٰ

فلسفے کا سب سے بڑا مقصد کون سا ہے؟ حقیقت کو سمجھنا اور اس سے بھی بڑھ کر حقیقتِ کبریٰ یعنی خدا کو پہچاننا اور اس کے قریب ہونا۔ یہی مقصد مذہب کا بھی ہے۔ کندی کو یونانی فلسفہ خصوصاً ارسطو کا فلسفہ اسلام کے قریب لگا۔ دراصل اس نے پلاٹینوس کی کتاب پڑھ لی تھی جس کو وہ ارسطو کی کتاب سمجھتا رہا۔ نوافلاطونیت کا تصورِ حقیقت اور مذہب کا خدا کا تصور تقریباً ایک ہی بات ہے۔ لہٰذا کندی کو فلسفے اور خدا میں کوئی فرق دکھائی نہیں دیا۔ اس نے یونانی فلسفے کو مذہب کی تائید سمجھتے ہوئے یونان کے بے شمار شاہکار عربی میں ترجمہ کیے۔

کندی نے خدا کو بیان کرنے کا ایک نیا طریقہ اختیار کیا، جس کو ''نفی والا طریقہ'' بھی کہتے ہیں، یعنی خدا مادہ نہیں ہے۔ اس کی کوئی شکل اس کی کوئی مقدار نہیں ہے، اس کا کوئی معیار نہیں ہے۔ اس کا کوئی رشتہ نہیں ہے۔ اس میں کوئی تبدیلی نہیں آتی ہے وغیرہ وغیرہ۔

خدا کے وجود کو ثابت کرنے کے لیے وہ ارسطو کا طریقہ یعنی علت و معلوم استعمال کرتا ہے اور خدا کو علت اولیٰ سمجھتے ہوئے اس کو'' کارآمد علت'' کہتا ہے۔ اس کے علاوہ کائنات میں ''نظم'' (Discipline) بھی خدا کے وجود کو ثابت کرتا ہے۔

۳۔ رُوح

جیسا کہ کندی نے پلاٹینوس کی کتاب، ارسطو کی کتاب سمجھ کر پڑھ رکھی تھی اس لیے اس کا روح کا نظریہ بھی وہی پلاٹینوس والا ہے۔ یعنی خدا، کائناتی روح اور انسانی روح۔ انسانی روح دراصل کائناتی روح کی ایک کرن ہے۔ انسان اپنی روح کو پاک صاف کر لے تو روح کائنات سے ایکا کر سکتی ہے اور امر ہو سکتی ہے۔

جب معتزلہ پر خلیفہ متوکل اور مولویوں کی آفت ٹوٹ پڑی تو کندی کو بھی معزول کر دیا گیا اور اس کی لائبریری بھی ضبط کر لی گئی، لیکن کندی خوش نصیب تھا کہ اس کی جان بچ گئی اور آخر کار اسے لائبریری بھی واپس مل گئی۔

الرازی

ابوبکر عمر ابنِ زکریا الرازی رے شہر میں پیدا ہوا جہاں سے بعد میں بغداد آیا۔ اس نے طب و فلسفے کے علاوہ علم کی تقریباً تمام شاخوں پر کتابیں لکھیں، جن کی تعداد 150 کے قریب ہے۔

الرازی سو فیصد عقل پرست (Rationalist) ہے اور اس نے کندی کے برعکس مذہب و فلسفے میں کسی بھی قسم کی مفاہمت کرنے کی کوشش ہی نہیں کی۔

اس کا فلسفہ "پانچ ابدی حقیقتیں" کی وجہ سے مشہور ہے، جو کہ یہ ہیں "خدا، آفاقی روح، پہلا مادہ، مقامِ مطلق اور زمانِ مطلق، یہ پانچوں حقیقتیں ازلی و ابدی ہیں۔

خدا کامل ذات ہے اور اس سے زندگی اسی طرح پھوٹتی ہے جیسے روشنی سورج سے پھوٹتی ہے۔ وہ ہر شے پر قادر ہے اور کوئی بھی بات اس کی منشاء کے برخلاف نہیں ہوسکتی۔

الرازی خدا کی وحدانیت کا مکمل طور پر قائل ہے لیکن اسے وحی و پیغمبری پر یقین نہیں تھا۔ اس سلسلے میں اس کے نظریات مندرجہ ذیل تھے:

i۔ نیکی اور برائی کی تمیز کرنے کے لیے انسان کے پاس عقل کافی ہے۔ عقل کے ذریعے ہم خدا کو صحیح طور پر پہچان سکتے ہیں اور بہتر زندگی گزار سکتے ہیں۔

ii۔ یہ کہاں کا انصاف ہے کہ کچھ لوگوں کو تمام انسانوں کی راہنمائی کے لیے مقرر کیا جائے۔ تمام انسانوں میں عقل مساوی ہے۔ فرق صرف ماحول، تعلیم اور حالات کا ہے۔

iii۔ پیغمبر ایک دوسرے سے اختلاف رکھتے ہیں۔ اگر سب کو خدا نے بھیجا ہے تو ان میں تضاد کیوں ہے؟''(1)

الرازی قرآن کے معجزے کو نہیں مانتا اور کہتا ہے کہ اس سے بہتر کتاب وہ خود لکھ سکتا ہے۔ علاوہ ازیں وہ سائنسی کتابوں کو تمام مذہبی کتابوں پر ترجیح دیتا ہے۔

اس کے علاوہ الرازی نے زندگی گزارنے کے لیے اخلاقی نکات بتائے ہیں جو کہ ارسطو سے متاثر لگتے ہیں۔

(کچھ حلقوں کی طرف سے یہ اعتراض اُٹھایا گیا ہے کہ الرازی کو اُس کے فلسفے کی بناء پر ''مسلمان فلسفی'' کے طور پر نہ پیش کیا جائے۔ لیکن اس سلسلے میں راقم خود کو فتویٰ جاری کرنے کا مجاز نہیں سمجھتا۔ الرازی کو مسلمان محققین نے ہی ''مسلمان فلسفی'' کے طور پر پیش کیا ہے۔ مثال کے طور پر ایم ایم شریف کا نام دیا جا سکتا ہے۔)

1-A History of Muslim Philosophy Edited by:M.M . Sharif, Page:446.

الفارابی

ابونصر الفارابی سن 870ء میں فاراب میں پیدا ہوا اور قیاس یہ ہے کہ وہ نسلاً ترک تھا۔ اس کا والد فوجی جرنیل تھا۔ فارابی کچھ عرصہ جج رہا اور پھر بغداد آ کر بڑے شوق سے منطق و فلسفہ پڑھنے لگا اور اپنے وقت کے بڑے دانش وروں کی صحبت میں رہنے لگا۔

وہ 20 سال بغداد میں رہنے کے بعد الیپو چلا گیا، جہاں سیف الدولہ کے دربار سے وابستہ ہو گیا، جہاں علم، ادب و فلسفے کی بڑی قدر و منزلت تھی۔

فارابی کو درباری دبدبے اور عیش و عشرت سے زیادہ علم کی پیاس تھی، جس کی تلاش میں اس نے ساری عمر گزار دی۔ فقیر منش و صوفیانہ مزاج رکھنے والے فارابی نے خود کو فلسفے اور درس و تدریس کے لیے وقف کر ڈالا جس کی وجہ سے اس کا فلسفہ زیادہ منظم اور جامع ہے۔ اس نے اپنی زندگی میں تقریباً 70 کتابیں لکھیں؛ جس طرح کندی نے مذہب و فلسفے میں یک جہتی پیدا کرنے کی کوشش کی تھی، فارابی نے نئے سرے سے فلسفے کے مختلف مکاتیب میں ہم آہنگی پیدا کرنے کی کوشش کی۔ فلسفے کے ابتدائی دور سے لے کر افلاطون و ارسطو کو ایک دوسرے کا مخالف فلسفی سمجھا جاتا رہا ہے لیکن فارابی نے کہا کہ فلسفہ مجموعی طور پر علم کی ایک اکائی ہے اور اس کا مقصد سچ کی تلاش ہے۔ فلسفی کوئی بھی نظریہ رکھتا ہو لیکن اس کا مقصد ایک ہی ہے یعنی سچ کی تلاش ہوگا۔ سچ کو بیان کرنے کے طریقے تو مختلف ہو سکتے ہیں مگر وہ ایسے ہے جیسے مختلف راستوں سے گزرتے ہوئے مسافر ایک ہی منزل پر پہنچتے ہیں۔

اس کے بعد کندی کی مانند فارابی نے بھی مذہب وفلسفے میں ہم آہنگی پیدا کرنے کی کوشش کی۔

دس عقلی نظریہ

فارابی مذہب، فلسفے، سائنس حتیٰ کہ موسیقی کو بھی ساتھ لے کر چلنا چاہتا ہے۔ اس کی فطرت میں تصوف تھا۔ لہٰذا اسے ہر جگہ وحدت دِکھائی دیتی تھی۔ وہ کہتا ہے ''خدا اپنے آپ میں خودکفیل ہے۔ اسے کسی کی بھی ضرورت نہیں ہے۔ وہ عقلِ کُل ہے۔ اپنا مکمل ادراک رکھتا ہے۔ نہ اس جیسا کوئی ہے نہ ہی کوئی اس کے برابر ہے۔''

واحد خدا کی روشنی سے ایک عقل پیدا ہوتی ہے جسے فارابی پہلی عقل قرار دیتا ہے۔ پہلی عقل سے دوسری عقل پیدا ہوتی ہے جو کہ مادی ہے اور ساخت رکھتی ہے، جس سے پہلا آسمان یا عرش پیدا ہوا جس کی اپنی روح ہے۔ یوں دوسری عقل سے تیسری عقل اور دوسرا عرش پیدا ہوتے ہوئے معاملہ دسویں عقل تک جا پہنچتا ہے۔ دسویں عقل سے انسانی روح اور چار عناصر پیدا ہوتے ہیں، یعنی ہوا، آگ، پانی اور مٹی۔

فارابی اپنے اس نظریے سے زمین، آسمان، تاروں اور سیاروں کے وجود کا جواز فراہم کرنے کی کوشش کرتا ہے، جس کے لیے پلاٹینوس کے نظریہ انتشار (Emanation) سے کام لیتا ہے اور اس کو تصوف سے ہم آہنگ بناتے ہوئے کہتا ہے کہ یہ عقل مرحلہ وار ایک دوسرے سے بہتر ہیں۔ یعنی دسویں عقل سے نویں عقل اور اس سے آٹھویں عقل عظیم ہے اور پہلی عقل عظیم مطلق ہے۔ اسی طرح انسان کی روح اپنی اصل یعنی دسویں عقل کے لیے تڑپتی رہتی ہے اور اس سے ایک ہونے کی شدید خواہش رکھتی ہے۔ دسویں عقل جس کی اپنی روح ہے یہ نویں عقل اور اس کی روح کے لیے تڑپ رکھتی ہے اور یہ سلسلہ پہلی عقل تک جا پہنچتا ہے، جس کے عشق اور تمنا میں سب تڑپ رہی ہیں۔ عقل عظیم کو کسی کی بھی ضرورت نہیں ہے۔ لہٰذا وہ اپنی ذات کے اندر سکون واطمینان میں ہے۔

فارابی، پیغمبری اور معجزوں پر یقین رکھنے کے ساتھ ساتھ سائنس کی اہمیت پر بھی زور دیتا ہے۔ علت ومعلول کے قانون کے ساتھ ساتھ سائنسی تجربات کرنے اور ان کے ذریعے قدرت کی پوشیدہ ومخفی حقیقتوں اور قانون کو سمجھنے کے لیے خاص ہدایات دیتا ہے۔

ابنِ سینا

ابوعلی الحسین ابن سینا سن 980ء میں بخارا میں پیدا ہوا۔ اس نے بنیادی تعلیم اپنے گھر میں اور پھر طب و فلسفے کی تعلیم بخارا میں ہی حاصل کی۔ بلند پایہ طبیب ہونے کی وجہ سے اس کی شاہی دربار تک رسائی ہوگئی، جہاں اسے شاہی کتب خانہ استعمال کرنے کی اجازت مل گئی۔ یہاں اس نے جی بھر کر پڑھا اور قریباً ہر موضوع میں دلچسپی لی لیکن اس کی خصوصی دلچسپی یونانی فلسفے اور ارسطو سے تھی۔

فارابی کی طرح ابن سینا نے بھی اپنا زورِ قلم مذہب و فلسفے میں ہم آہنگی پیدا کرنے پر صرف کیا اور شاید اس میں زیادہ کامیاب رہا۔ اس نے نہ تو لیوکرٹس کی طرح فلسفے کے کارن مذاہب کو تباہ کرنے کی کوشش کی نہ کہ اس کے بعد آنے والے غزالی کی طرح، مذہب کے کارن فلسفے کا بیڑا ڈبونے کی کوشش کی۔

ابن سینا ارسطو سے بہت زیادہ متاثر تھا۔ وہ خود کہتا ہے کہ وہ ارسطو کی مابعدالطبیعات چالیس (۴۰) دفعہ پڑھنے کے باوجود بھی پوری طرح سے سمجھ نہیں سکا۔ آخر کار جب فارابی کی کھلی تشریح کی مدد سے ارسطو کو سمجھ لیا تو خوشی سے بے قابو ہو گیا اور گھر سے باہر آ کر مٹھائی بانٹی۔ اس سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ اس کا فلسفہ ارسطو سے کس حد تک متاثر ہو گا۔

ابن سینا کا دور ایسا دور تھا جس میں دو تہذیبیں ایک دوسرے سے گلے مل رہی تھیں۔

یعنی یونانی اور اسلامی۔ ابنِ سینا کے لیے یہ مشکل تھا کہ وہ کسی ایک کو چھوڑ کر دوسری تہذیب کو مکمل طور پر قبول کرے۔ نتیجے کے طور پر یونانی فلسفے، منطق اور مابعدالطبیعات کو اسلامی الٰہیات، قرآن اور پیغمبری کو ملا کر اپنے فلسفے کی دیوار کھڑی کی اور مشہور کتاب الشفا لکھی۔

اس دَور کے فلسفیوں یا نوافلاطونیوں یا عیسائی متکلمین وغیرہ کے لیے بڑا مسئلہ یہ رہا تھا کہ ایک خدا جو کہ ہر حال میں واحد ہے، مفرد ہے، سادہ ہے، اس سے کس طرح یہ مرکب، یہ کسرت، یہ پیچیدہ وآلودہ دنیا وجود میں آئی؟

فارابی کی طرح ابن سینا بھی نظریہ انتشار (Emanation) سے کام لیتے ہوئے عقلِ اوّل اور عشقِ اوّل کا نظریہ قائم کرتا ہے اور ذہین عقل کو جبریئل کہتا ہے، جو مادے کی انسانی شکل کو علم اور مادے کو ہیئت عطا کرتا ہے، لیکن یہ مادہ، یہ پیچیدہ اور آلودہ مادہ کیا خدا کا حصہ ہے یا عدم سے پیدا کیا گیا ہے؟ یا خود قدیم اور ابدی ہے؟ ارسطو کی طرح ابن سینا اس مادی دنیا کو بھی ابدی ماننے کو تیار ہے مگر اس کے دور کے متکلمین کو نظر میں رکھتے ہوئے یہ نظریہ دیا کہ خدا اس دنیا سے زمان نہیں بلکہ منطقی اعتبار سے اوّلین ہے۔ یعنی حیثیت میں، جوہر میں اور علت میں ''دنیا کا وجود ہر گھڑی، ہر لمحے میں خدا کی قدرت اور قوت کا محتاج ہے۔ خدا کی قوت کے بغیر یہ دنیا ایک لمحے کے لیے بھی اپنا وجود برقرار نہیں رکھ سکتی لیکن خدا کسی کا بھی محتاج نہیں ہے۔ اس کی کوئی ابتدا' کوئی انتہا نہیں ہے۔''(۱)

اس کے علاوہ ایک دوسرا سوال بھی ہے جو مذہبی مفکرین اور فلسفیوں کو پریشان کرتا رہتا ہے۔ وہ یہ کہ ''اگر سب کچھ خدا کی طرف سے ہے تو پھر کیا یہ برائی بھی خدا کی طرف سے ہے؟ دوسرے لفظوں میں برائی کا منبع یا سرچشمہ کیا ہے؟''

ابنِ سینا اس مسئلے کو اس طرح حل کرتا ہے کہ ''برائی خدا کی طرف سے نہیں ہے، یہ وہ قیمت ہے جو انسان کو آزاد ارادہ (Free Will) رکھنے پر ادا کرنا پڑتی ہے۔ دوسرا یہ کہ جز کی برائی کل کی برائی نہیں ہو سکتی۔ نیکی کے وجود کے لیے ایک حد تک برائی ضروری ہے، لیکن اگر خدا ناگزیر برائی کی وجہ سے، یہ دنیا پیدا نہ کرتا تو یہ سب سے بڑی برائی ہوتی۔ دنیا جیسی ہے، اس سے بہتر دوسری نہیں ہو سکتی۔''(۲)

1-Will Durrant.

2-The History of Philosophy in Islam by:Dr. T.J. De boer, Page:129.

ابن سینا روح اور جسم کی ثنویت کا قائل ہے لیکن وہ جسم کو فانی اور روح کو لافانی قرار دیتا ہے، جو ہر وقت اپنے اصل سرچشمے کی طرف جانے کے لیے بے تاب ہے۔ یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اگر جسم لافانی ہے تو قیامت کے روز خدا زندہ کیسے کرے گا؟ روح تو پہلے ہی زندہ ہے۔ یہاں ابنِ سینا عام مسلمان کی سوچ سے اختلاف رکھتا ہے اور کہتا ہے کہ "اگر حضرت محمد ﷺ خالص روحانی جنت و جہنم کا نظریہ دیتے تو عام لوگ ان کی بات پر کان ہی نہ دھرتے۔"(1)

ابنِ سینا عام و معمولی ذہن رکھنے والے انسان کے لیے ایک مذہب اور فلسفیوں اور دانش وروں کے لیے دوسرے مذہب کا نظریہ دیتا ہے۔ یعنی عام آدمی، جسمانی راحت کے لیے جنت کی تمنا اور جسمانی عذاب سے بچنے کے لیے دوزخ سے ڈرتا ہے اور عبادت کرتا ہے لیکن فلسفے اور روح کی خوشی اور بلندی میں یقین رکھنے والا انسان، جنت کے لالچ اور دوزخ کے خوف کے بغیر روحِ مطلق کی محبت میں سرشار ہو کر صرف اسی کی تمنا کرتے ہیں، لیکن اس حقیقت کا پتا عام آدمی کو نہیں دینا چاہیے اور فلسفی و سالک صرف اپنے خاص اور ذہنی طور پر بالغ شاگردوں کو یہ راز دے سکتے ہیں۔ (یہاں ابن سینا اسی اپنشد والی بات کرتا ہے) اس منزل پر پہنچ کر ابن سینا صوفی بن جاتا ہے یعنی ظاہری طور پر مذہبی انسان لیکن اندرونی طور پر روح کی آزادی اور عقل سے محبت رکھنے والا صوفی (حالاں کہ دوسرے صوفی عقل کے بجائے وجدان پر یقین رکھتے ہیں۔

1-Will Durrant.

اخوان الصفا

سن 970ء میں بصرہ میں کچھ لوگ خفیہ طور پر جمع ہوئے تاکہ فلسفے اور سائنس کے متعلق بحث مباحثہ کیا جائے اور آگاہی حاصل کی جائے۔ اس گروہ میں شمولیت کے لیے دو شرطیں تھیں، ایک راز داری اور دوسرا علم کی پیاس رکھنا۔ کسی بھی مذہب، فرقے یا قومیت وغیرہ کی کوئی قید نہیں تھی۔ اس گروہ میں شامل ہونے والے اپنی تحقیق اور اپنے خیالات کا آپس میں تبادلہ کرتے رہتے تھے۔ بعد ازاں یہ کتابی صورت میں لکھ لیا کرتے تھے لیکن کتاب پر اسی کے نام کے بجائے ''اخوان الصفا'' یعنی ''مخلص بھائیوں کی جماعت'' لکھا کرتے۔

اخوان الصفا کے لوگ مسلمانوں کے زوال پذیر اخلاقی، سیاسی، مذہبی اور روحانی حالات پر فکر مند تھے۔ لہٰذا انھوں نے ''تجدید'' کا عہد کیا۔

اخوان الصفا والے یونانی فکر خصوصاً فیثاغورث سے متاثر تھے لیکن ساتھ ہی فارابی اور ابنِ سینا کی کوششوں یعنی مذہب و فلسفے میں ہم آہنگی پیدا کرنے کی جدوجہد کو بھی آگے بڑھانا چاہتے تھے۔ اس غرض سے ان سب نے مل کر تقریباً 50 کتابیں اور رسالے لکھے، جن میں انھوں نے مذہب، فلسفے، الٰہیات، سائنس اور نو افلاطونیت پر بحث کی۔ ان کا الٰہیاتی فلسفہ ابن سینا، فارابی اور نو افلاطونیت کا تھا، سوائے تھوڑی بہت تبدیلی کے راسخ العقیدہ مولویوں نے بھی اپنا فرض نبھایا یعنی اخوان الصفا کی کتابیں جلانے کا، ہر جگہ مولویوں نے اخوان الصفا کے فلسفے کو رد کرتے ہوئے اس کی سخت مخالفت کی لیکن غزالی جیسے فلسفے کے مخالف اور عیسائی و یہودی عالم اس گروہ کی تحریروں سے نہایت متاثر ہوئے اور ان کے خیالات میں تراجم کر کے اور ان کو توڑ مروڑ کر اپنے مقصد کے لیے استعمال کرنے لگے۔

مغربی مسلمان فیلسوف

آٹھویں صدی عیسوی میں بنواُمیہ کے دَور میں جب سندھ پر حملہ کر کے اس کو سلطنت بنواُمیہ کا حصہ بنایا گیا تو اسی دَور مین طارق بن زیاد نے اسپین کی سرزمین پر اُموی حکومت قائم کی۔ اس کے بعد یہاں تقریباً 800 سال مسلمانوں کی حکومت رہی۔

مسلمانوں کو پہلے تو پیر جمانے میں کافی وقت لگا کیوں کہ یورپ میں ہر طرف سے ان کی مخالفت تھی، لیکن جب وہ عیسائی دنیا کے مقابلے میں پیر جما چکے تو مسلمان ایک دوسرے کے پیر اُکھاڑنے لگے۔ اس کشمکش میں ان کا فلسفے کی طرف دھیان بہت دیر سے گیا۔ اس کے علاوہ اس کی دوسری اہم وجہ غزالیوں، حنبلیوں، اشعریوں اور انتہا پسند مولویوں کی خرد دشمنی تھی۔

بہر حال گیارہویں عیسوی صدی سے اسپین میں فلسفی پیدا ہونا شروع ہوئے، جن میں تین فلسفی اہم ہیں: ابنِ ماجا، ابنِ طفیل اور ابنِ رشد۔

ابنِ ماجا

ابوبکر محمد ابنِ ماجا سارا گوسا میں سن 1138ء میں پیدا ہوا (یورپ میں ابنِ ماجا کو (Avempace) کے نام سے پہچانا جاتا ہے) اُس دَور کے تقاضوں کے مطابق ابن ماجا نے کئی علوم میں مہارت حاصل کی، جن میں سائنسی و فقہی علم کے علاوہ فلسفے میں بھی خصوصی دلچسپی لی۔ وہ کچھ عرصہ سارا گوسا کے گورنر کا وزیر رہا، مگر سارا گوسا پر عیسائیوں کے قبضے کے بعد شمالی افریقہ چلا گیا۔

مغربی مسلمانوں میں یہ پہلا بڑا فلسفی ہے لیکن اسپین میں فلسفہ مشرقی مسلمانوں کے ذریعے ہی پہنچا تھا۔ ابنِ ماجا فارابی کا بہت معتقد تھا اور اس کی فلسفیانہ تحریروں میں فارابی کا فلسفہ ہی چھایا ہوا ہے۔ ایک بات میں ابنِ ماجا کی اہمیت زیادہ ہے۔ وہ یہ کہ اس نے ارسطو کی اصل کتابیں بڑی باریک بینی سے پڑھیں اور ان کی تشریحات لکھیں، جن سے یورپ کافی متاثر ہوا لیکن غالباً سب سے زیادہ سینٹ تھامس اکیناس متاثر ہوا۔

انسانی عقل کے متعلق ابنِ ماجا کہتا ہے ''انسانی عقل کے دو حصے ہیں، ایک عقل فعال اور دوسرا مادی عقل، مادی عقل انسانی جسم سے مشروط ہے، جو جسم کے فنا ہو جانے سے خود بھی فنا ہو جاتا ہے لیکن عقلِ فعال غیر مادی، غیر جسمی اور لافانی ہے فعال عقل انسان میں سب سے زیادہ ہے اور اس کا کام یعنی ''فکر کرنا'' انسان کا سب سے عظیم کام ہے اور فکر کے ذریعے ہی انسان خدا کو پہچان سکتا ہے، اس سے یکجا ہو سکتا ہے۔''(1)

ابنِ ماجا فکری عمل کو ریاضت وتصوف پر فوقیت دیتے ہوئے، اسے حقیقتِ کبریٰ تک پہنچنے کا ذریعہ سمجھتا ہے، مگر یہ فکری عمل خاموشی اور تنہائی کے بغیر مشکل ہے۔ اس کے لیے مفکر کو انسانوں کے ہجوم سے پرے جا کر کچھ سوچنا چاہیے یا ایسی بستی آباد کرنی چاہیے جہاں صرف مفکر ہوں۔

بالواسطہ طور پر وہ سقراط والی بات کرتا ہے کہ جب لوگ اجتماعی شکل میں جمع ہوتے ہیں تو ان کی سوچ سطحی اور بیوقوفانہ ہو جاتی ہے۔

ابنِ ماجا حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کے غارِ حرا کے زمانے میں، تنہائی میں سوچنے کے عمل سے بھی بہت زیادہ متاثر ہے۔

1-Willdurrant.

ابنِ طفیل

ابنِ طفیل سن 1107ء میں صوبہ گریناڈا میں پیدا ہوا۔ وہ طب اور فلسفے میں خصوصی مہارت کے باعث صوبے کے گورنر کا مشیر مقرر ہوا۔ اُس وقت حکومت مواحدیوں کے پاس تھی۔ ابنِ طفیل کی شہرت نے اسے مواحدی خلیفہ ابو یعقوب یوسف کا طبیب خاص اور مشیر بنا دیا۔

مواحدی خلیفے کو علم، ادب و فلسفہ سے خصوصی لگاؤ تھا، جس کی وجہ سے اس کے دربار میں اپنے عہد کے بڑے بڑے عالم اور فلسفی ہر وقت موجود رہتے تھے۔

ابنِ طفیل کو بھی خلیفہ نے اس کام کے لیے کہا جو کہ ابنِ ماجا کے انتقال کی وجہ سے ادھورا رہ گیا تھا، یعنی یونانی فلسفے اور خصوصاً ارسطو کے کاموں کا ترجمہ اور تشریح۔ ابنِ طفیل اپنے خیالات کے معاملے میں ابنِ ماجا سے موافقت رکھتا ہے اور فکر کو بڑی شے قرار دیتا ہے۔ ابنِ طفیل نے ایک عجیب و غریب ناول لکھا، جس کا نام ہے ''حی بن یقظان'' حی ایک ایسے جزیرے پر پرورش پاتا ہے جہاں کوئی بھی انسان نہیں ہے، صرف جانور ہیں۔ اسے ایک بکری پالتی ہے۔ وہ جب بڑا ہوتا ہے تو اپنی عقل استعمال کرتے ہوئے اپنے لیے چمڑے کے جوتے اور کپڑے تیار کر لیتا ہے۔ تاروں کا مشاہدہ کرتے کرتے فلکیات کا علم سیکھ لیتا ہے اور جانوروں کا مشاہدہ اور ان پر تجربات کر کے حیاتیات کا علم سیکھ لیتا ہے، جس کے بعد وہ نباتات وغیرہ پر دسترس حاصل کرنے کے بعد اس دنیا کی تخلیق کے متعلق سوچتے ہوئے، ایک خدا کے نظریے پر پہنچتا ہے اور اس کی روح، اس کی فکری بلندی کے ذریعے

حقیقتِ کبریٰ کا عرفان حاصل کر لیتی ہے، جب حی کی عمر 49 برس ہوتی ہے تو جزیرے پر ایک ''اصل'' نامی صوفی تنہائی کی تلاش میں پہنچ جاتا ہے اور حی کو زبان سکھاتا ہے۔ حی کو بھی پہلی دفعہ پتا چلتا ہے کہ دنیا میں اور بھی انسان ہیں۔ زبان سیکھنے کے بعد اصل کو یہ دیکھ کر نہایت حیرت و خوشی ہوتی ہے کہ حی کسی کی مدد کے بغیر حقیقتِ کبریٰ کو پہچان چکا تھا۔ اس کے بعد اصل حی کو اپنے معاشرے اور مذہب کے متعلق سب کچھ بتاتے ہوئے دُکھ کے ساتھ یہ بتاتا ہے کہ یہاں لوگوں کی اخلاقیات کی بنیاد جنت کے لالچ اور دوزخ کے خوف پر مشتمل ہے۔ حی شہر جانے کا ارادہ کرتا ہے تاکہ لوگوں کو فلسفیانہ مذہب کی تعلیم دے اور انھیں خدا کی پہچان کا طریقہ بتائے۔ شہر پہنچ کر وہ ایک چوک پر کھڑا ہو کر تقریر کرتا ہے لیکن نہ تو کوئی اس کی بات سنتا ہے اور نہ ہی کوئی سمجھنے کی کوشش کرتا ہے۔ ''پھر حی اس نتیجے پر پہنچتا ہے کہ: حضرت محمد ﷺ واقعی حق بجانب تھے کہ عام آدمی کو سماج کا اچھا شہری صرف جنت کے لالچ، دوزخ کے خوف، معجزوں کرامتوں، روایتوں، رسموں اور مافوق الفطرت ہستیوں کے افسانوں سے ہی بنایا جا سکتا ہے۔ حی اپنی مداخلت پر معذرت کر کے واپس جزیرے پر آ جاتا ہے اور اصل کی دوستی میں جانوروں کی صحبت میں اور خدا کی محبت میں وقت گزارتا ہے۔''[1]

اس فلسفیانہ ناول کے ذریعے ابنِ طفیل ابنِ ماجا والی بات سمجھانا چاہتا ہے کہ حقیقت کا عرفان تنہائی میں، غور و فکر کے ذریعے ہی ہو سکتا ہے۔ اس کے علاوہ وہ یہ بات بھی ثابت کرنے کی کوشش کرتا ہے کہ عام آدمی کے لیے عوامی مذہب ہی بہتر ہے اور صرف فلسفی کو ہی فکر کے ذریعے خدا تک پہنچنا چاہیے۔

''ابنِ طفیل مواحدیوں کے دربار میں وزیر تھا۔ مواحدیوں کی سرکاری فقہ ''الظاہری'' تھی اور یہ سب غزالی سے متاثر تھے اور مذہب کے ظاہری روپ کو زیادہ اہمیت دیتے تھے۔ ابنِ ماجا کے فلسفے کے بعد وہ اس نتیجے پر پہنچے کہ عام لوگوں کے لیے عوامی مذہب ہی بہتر ہے۔ فلسفیانہ حقیقتیں صرف فلسفیوں اور چند مخصوص لوگوں پر ہی منکشف ہونی چاہئیں۔ ابنِ طفیل کا ''حی بن یقظان'' لکھنے کا مقصد بھی مواحدیوں کے نقطۂ نظر کا دفاع تھا۔''

1-History of Muslim Philosophy, Edited by: M.M Sharif, Page:528.

ابنِ رُشد

ابو ولید محمد ابن رشد سن 1126ء میں قرطبہ میں پیدا ہوا۔ اس کا گھرانہ فقہ کا بہت علم رکھتا تھا اور ابن رشد کے باپ دادا اندلس کے چیف جسٹس رہ چکے تھے۔

قرآن، حدیث و فقہ کے علاوہ ابنِ رُشد نے فلسفہ اور سائنس کی تعلیم بھی حاصل کی۔

27 سال کی عمر میں اسے ابن طفیل نے مواحدی خلیفہ کے دربار میں پیش کیا، جو خود بھی بڑا عالم اور فلسفے کا جاننے والا تھا، اس نے ابن رشد کو سیول کا قاضی مقرر کیا، جہاں سے وہ ترقی کر کے اپنے والد کے عہدے یعنی قرطبہ کا قاضی القضاۃ مقرر ہوا جب ابو یعقوب یوسف خلیفہ بنا تو وہ اسے مراکش لے گیا، جہاں ابنِ رشد شاہی طبیب کی حیثیت سے کام کرنے لگا۔

یہاں مواحدی خلیفہ نے ابن رشد سے یہ فرمائش کی کہ وہ ارسطو پر ایسی شرح لکھے جو اس سے پہلے کسی نے بھی نہ لکھی ہو۔ اس کے بعد ابن رشد ارسطو کے مطالعے، اس پر شرحیں لکھنے اور دوسری کتابیں لکھنے میں مصروف ہو گیا۔ اس نے اپنی زندگی کے 24 سال اس کام کو دے کر اس قدر بڑا کام کیا کہ اس کی کتابوں نے مستقبل میں پورے یورپ کو جہالت کی تاریکی سے نکال کر نشاطِ ثانیہ کے ذریعے علم کی روشنی سے منور کر ڈالا۔

ابن رشد کا دور سیاسی کشمکش کا دَور بھی تھا۔ مواحدیوں نے مرابطین کے اقتدار پر قبضہ کر لیا تھا اور ان کی حکومت کے بانی ابن تمرات نے خود کو امام مہدی کہلوا کر راسخ العقیدہ مولویوں کی مدد

حاصل کی تھی۔ مولویوں نے جب ابن رشد کا فلسفہ پڑھا تو سخت مشتعل ہو گئے اور اسے کافر ولادین کہنے لگے۔ مواحدی خلیفہ نے مولویوں کی حمایت حاصل کرنے اور اپنا اقتدار بچانے کی خاطر ابن رشد کو معطل کر دیا۔

ارسطو کی کتابوں کے گہرے مطالعے اور اس وقت موجود تمام نسخوں کو پڑھ کر ان کے تقابلی مطالعے جیسا کام ابن رشد سے پہلے کسی نے بھی نہیں کیا تھا۔ وہ ارسطو سے بے حد متاثر ہوا اور اسے انسانوں میں سب سے دانا انسان کہا۔ اس کا خیال تھا کہ ارسطو عقل کی انتہا پر پہنچ چکا تھا۔ اللہ تعالیٰ نے ارسطو کو تخلیق کر کے انسانوں کو یہ پیغام دیا تھا کہ کس طرح عقل اپنی انتہا پر پہنچ کر خدا سے ملاپ حاصل کر لیتی ہے۔

ابن رشد نے ارسطو کی کتابوں پر تین قسم کی شرحیں لکھیں۔ مختصر، متوسط اور جامع یا طویل، جامع شرحوں میں ابن رشد نے دل کھول کر لکھا اور شرحوں کی شکل میں اپنا فلسفہ بھی دے دیا۔ یہ طویل شرحیں صرف فلسفیوں کے لیے ہی تھیں۔ باقی عام پڑھنے والوں کے لیے مختصر شرحیں ہی بہتر قرار دیں۔

شرحوں کے علاوہ ابنِ رشد نے کئی کتابیں بھی لکھیں، جن میں غزالی کو دیئے گئے جوابات ''تہافت التہافت'' اور ''فصل'' بہت اہم ہیں۔

غزالی نے جو کتاب ''تہافت الفلاسفہ'' لکھی تھی۔ اس میں غزالی نے فلسفیوں کو لادین کہا تھا۔ اسلام میں جب کوئی مسلمان لادین ہو جائے تو اسے سزائے موت دی جائے یا پھر وہ تائب ہو جائے۔ توبہ کرنے کا مطلب فلسفی یہ بتاتے تھے کہ وہ اپنی ہی لکھی ہوئی کتابوں پر یقین نہیں رکھتے۔ یہ صورتِ حال ابن رشد کے لیے بہت دشوار تھی۔ لہٰذا اس نے غزالی کی کتاب کا جواب لکھ کر یہ ثابت کیا کہ فلسفہ اور اسلام ایک دوسرے کے دشمن نہیں ہیں۔

ابن رشد نے یہ دلیل دی کہ اسلام اور فلسفہ، دونوں کا مقصد اللہ تعالیٰ کو پہچاننا اور اس کی اطاعت کرنا یا اس کے قوانین پر عمل کرنا ہے۔ اس کے علاوہ قرآن مجید کی کتنی ہی آئتیں ہیں جو غور و فکر کر کے بصیرت حاصل کرنے کا حکم دیتی ہیں۔ قرآن مجید کی کتنی آئتیں ایسی ہیں جن کے ظاہری معانی ایک اور باطنی معانی دوسرے ہیں۔ ظاہری معانی تو کم تعلیم یافتہ و کم عقل مسلمانوں کے لیے ہیں لیکن باطنی معانی جو کہ اصل معانی ہیں وہ عقل مندوں کے لیے ہیں۔ عقل مندی فلسفے کا دوسرا

نام ہے۔ قرآن کے باطنی معانی صرف فلسفی اور عقل مند لوگ ہی سمجھ سکتے ہیں، کیوں کہ باطنی معانی یا تلاوت کو سمجھنے کے لیے استدلال سے کام لینا پڑتا ہے۔

ابن رشد یہ بھی لکھتا ہے کہ غزالی کو کوئی حق نہیں پہنچتا ہے کہ وہ فلسفیوں کو کافر قرار دے کیوں کہ ایسا فیصلہ رفتویٰ دینے کا حق صرف ''اجماع'' کے ذریعے استعمال کیا جا سکتا ہے اور اس قسم کا اجماع ہوا ہی نہیں اور ہونا ممکن بھی نہیں ہے۔

فلسفیوں پر غزالی کے حملے کا دفاع کرنے کے بعد ابن رشد غزالی کے دوسرے حملے کا بھی جواب دیتا ہے۔ غزالی نے علت و معلول کے قانون کو رد کیا تھا اور بالواسطہ طور پر سائنس و تحقیق کی مخالفت کی تھی۔ سورج کا طلوع ہونا علت ہے اور روشنی پھیلنا یا دن چڑھنا معلول ہے۔ سورج نکلے بغیر دن ہونا ناممکن ہے، لیکن غزالی نہیں مانتا، وہ کہتا ہے کہ علت و معلول کا کوئی وجود ہے ہی نہیں۔ سورج کا طلوع ہونا اور دن کا چڑھنا، یہ اللہ تعالیٰ کی حکمت کی وجہ سے ہوتا ہے۔ یعنی اللہ تعالیٰ نے حالات و واقعات کا پہلے سے ہی ایسا تسلسل مقرر کر رکھا ہے کہ وہ ہمیں علت و معلول لگتے ہیں۔ سورج کا مقصد روشنی پھیلانا ہرگز نہیں ہے۔ روشنی خدا بھیجتا ہے اور دن چڑھنے یا رات ہونے کا سورج سے کوئی تعلق نہیں ہے مگر دیکھنے میں یہی محسوس ہوتا ہے۔

ابن رشد نے علت و معلول پر خوب لکھا اور اسے ثابت کیا۔ اس نے کہا کہ کوئی بھی علم تجربے و مشاہدے کے بغیر حاصل نہیں ہو سکتا اور تجربہ ہوتا ہی علت و معلوم کے قانون کے مطابق ہے۔ کسی بیماری کا علاج کرنے کے لیے اس بیماری کی وجہ کا پتا چلایا جاتا ہے، لیکن غزالی وجہ کو مانتا ہی نہیں، نتیجے کے طور پر بیماری کا کوئی سبب تلاش کرنے کی ضرورت ہے نہ ہی علاج کی۔ کیوں کہ علاج خود سبب ہے جس کا نتیجہ شفا ہے۔

غزالی کے فلسفے کا منطقی نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ دنیا میں کوئی علم حاصل کرنا ممکن ہی نہیں ہے۔ اس کا جواب غزالی پہلے ہی یہ دے چکا تھا کہ ''ہمیں اس دنیا کا علم حاصل کرنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ ہمارے لیے آخرت کا علم ہی کافی ہے۔''

ابن رشد نے ارسطو کے علاوہ افلاطون کی ''ریاست'' کی شرح بھی لکھی اور افلاطون کی ''مثالی ریاست'' اس نے اسلامی ریاست میں دیکھی اور کہا کہ اسلام میں امام کا تصور افلاطون کے ''فلسفی بادشاہ'' والا تصور ہے۔ افلاطون سے اتفاق کرتے ہوئے ابن رشد کہتا ہے کہ خواتین کو بھی

ریاست کی خدمت کرنے کے مواقع ملنا چاہئیں اور ان کو گھروں میں غلام بنا کر رکھنے کے بجائے انھیں اپنی صلاحیتیں آزادی سے استعمال کرنے کی اجازت دی جائے۔

ابن رشد سے قبل نوافلاطونیت وارسطو کے فلسفے آپس میں غلط ملط تھے، جس کے نتیجے میں خالص فلسفہ اور تصوف آپس میں پیوست ہو چکے تھے، جیسا کہ ابن رشد نے ارسطو کی کتابوں کا براہِ راست مطالعہ کیا تھا۔ لہٰذا وہ تصوف سے پرے ایک عقل پرست فلسفی تھا۔

خدا اس کائنات کی توانائی اور کائنات کا ذہن ہے۔ انسانی ذہن کے دو حصے ہیں۔ ایک حصہ جسم کے ساتھ فنا ہو جاتا ہے اور دوسرا حصہ لافانی ہے، جو آخر کار خالق کائنات سے جاملتا ہے۔

آگے چل کر سارے یورپ کی عقل پرست دنیا کا محبوب مسلمانوں کی دنیا میں لعنت و ملامت کا نشانہ بنایا گیا۔ اس کی معزولی وجلاوطنی تو کچھ بھی نہیں ہیں بلکہ جو اندھیر مسلمان حکمرانوں اور مولویوں نے کیا۔ وہ یہ تھا کہ ابنِ رشد کی پوری زندگی کی محنت، یعنی اس کی تحریر کردہ کتابیں اور شرحیں سرعام جلائی گئیں اور کچھ عرصے کے بعد مسلمانوں کی دنیا میں کسی کو یہ یاد بھی نہیں تھا کہ ان میں ایک عظیم المرتبت فلسفی بھی تھا۔

چند یہودیوں نے ابنِ رشد کی کتابوں کا عبرانی میں ترجمہ کیا تھا، جو مسلمانوں کے جوش و تنگ نظری سے محفوظ رہا۔ یوں یہ خزانہ ان یہودیوں کے ذریعے یورپ پہنچ گیا، جس کا پھل وہ آج تک کھا رہے ہیں۔

تصوف (Mysticism)

(نوافلاطونی، ویدانتی، اسلامی)

تصوف کے بارے میں گفتگو کرنے سے قبل ایک سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا تصوف فلسفہ ہے؟ اس کا جواب نہیں بھی ہے اور ہاں بھی ہے۔ تصوف فلسفہ اس لیے نہیں ہے کہ فلسفے کا دارومدار عقلی استدلال پر ہے اور تصوف عقل کو ناقص کہتا ہے۔ یعنی فلسفے کا تعلق دماغ سے ہے اور تصوف کا تعلق دل یا ایمان سے ہے۔ فلسفے کا کئی باتوں میں بلکہ اکثر مذہب سے اختلاف ہے، جب کہ تصوف پیداوار ہی مذہب کی ہے لیکن جزوی طور پر تصوف فلسفہ بھی ہے کیوں کہ فلسفہ و تصوف دونوں صداقت تلاش کرنے کے ذریعے ہیں۔ فلسفہ سچائی اور دانش کے ساتھ محبت اور اس کی جستجو کرنے کا نام ہے اور تصوف حق و حقیقت سے محبت کرنے کا درس دیتا ہے۔

تصوف بنیادی طور پر مذہب کا حصہ ہے، خواہ کوئی بھی مذہب ہو۔ اصل میں مذہب پر جب مذہبی مفاد پرستوں کا قبضہ ہو جاتا ہے تو اور خدا تک پہنچنے کی راہ پر مولویوں، برہمنوں اور پادریوں وغیرہ کی اجارہ داری ہو جاتی ہے تو پھر تصوف وجود میں آتا ہے۔ تصوف کسی حد تک بغاوت بھی ہے لیکن یہ بغاوت مذہب کے خلاف ہرگز نہیں ہے بلکہ یہ مذہبی ٹھیکے داروں اور ٹھگوں کے خلاف ہے۔

دنیا بھر کے قریباً تمام صوفیاء کا خیال ہے کہ مذہب کے دو روپ ہوتے ہیں، ایک بیرونی دوسرا اندرونی، بیرونی روپ وہ ہے جو عام فہم اور رسمی عبادات و روایات وغیرہ پر مشتمل ہے لیکن اس کا

اندرونی روپ زیادہ اہم ہے۔اس بات کو سمجھانے کیلئے تین لفظوں کا مفہوم سمجھنا انتہائی ضروری ہے۔

عابد

عابد وہ انسان ہے جو کہ مذہب کے بتائے ہوئے طریقے کے مطابق عبادت کرتا ہے اور اس کے صلے میں جزا کا حق دار یعنی جنت یا بہشت کا حق دار ہے اور اسے دوزخ کا خوف بھی ہے۔

زاہد

زاہد بھی عابد ہے لیکن اس کا رتبہ عابد سے بڑھ کر ہے کیوں کہ عابد عبادت کے علاوہ دنیاداری کے ڈھیر سارے کام بھی کرتا ہے جب کہ زاہد عام عبادتوں کے علاوہ بھی عبادتیں کرتا ہے۔ وہ متعدد جائز وحلال خوشیوں اور لذتوں سے بھی پرہیز کرتا ہے۔اپنے تن کو تپیا دیتا ہے اور نفس پر قابو پانے کے لیے اس کو کئی تکلیفیں دیتا ہے۔

عارف

عارف وہ شخص ہے جسے جنت کا لالچ ہے نہ دوزخ کا خوف۔وہ حقیقتِ مطلق کو سمجھنا یعنی اس کا عرفان حاصل کرنا چاہتا ہے اور اس سے محبت کرتا ہے۔اس سلسلے میں وہ عبادت وزہد بھی کرتا ہے بلکہ اس سے بہت آگے بڑھ کر اپنی خودی وہستی کی نفی کرتا ہے اور اپنے آپ کو حقیقتِ مطلق میں یوں گم کر لیتا ہے جس طرح قطرہ سمندر کا حصہ بن کر اپنا وجود گم کر ڈالتا ہے یہ عارف صوفی ہوتے ہیں اور مذہب کے اندرونی روپ پر یقین وعمل کرتے ہیں۔بالالفاظِ دیگر عبادت وزہد مذاہب کے ابتدائی روپ اور عرفان مذاہب کا اندرونی واصلی روپ ہے۔یہ دونوں ایک دوسرے کے لیے لازم وملزوم ہیں کیوں کہ ظاہر کے بغیر باطن کا کوئی وجود نہیں ہے اور باطن کے بغیر ظاہر ایک خالی برتن ہے۔ظاہر و باطن کی ہم آہنگی ہی اصل مذہب ہے۔

ویدانتی،نوافلاطونی اور اسلامی تصوف میں بے شمار مماثلتیں ہیں اور ان مماثلتوں کو دیکھتے ہوئے کئی اکابر انسانوں نے تصوف کو ایک بین الاقوامی مذہب بھی کہا ہے۔مختصر جائزہ پیش خدمت ہے:

ویدانت

ویدانت کا مطلب ہے جہاں وید یا عقل کا انت آجائے۔یعنی اس بات یا حقیقت کو سمجھنے کے لیے جہاں عقل کی سرحد ختم ہو جائے۔ویدانت کی بنیاد ویدوں پر مشتمل ہے،جن کے بارے میں ہندو مذہب کا دعویٰ ہے کہ یہ الہامی ہیں۔

ہندو رشیوں اور داناؤں نے ویدوں کو سمجھ کر، ان کی چھان بین کرنے کے بعد کچھ نتائج اخذ کیے اور وہ صرف اپنے خاص شاگردوں کو بتائے۔ ان کی تعلیمات کو اپنشد بھی کہا جاتا ہے۔

ویدانتی فلسفے کے مطابق برہما یعنی روحِ مطلق یا حقیقتِ مطلق ہر شے پر محیط ہے۔ وہ ازلی، ابدی، لامحدود اور قادر وغیرہ ہے۔ ہر جاندار بشمول انسان دو چیزوں پر مشتمل ہے یعنی روح اور جسم۔ جسم مادہ ہے، برائی ہے، ظلمت ہے، تاریکی ہے، جس میں روح قید ہو گئی ہے۔ جسم کی قید سے نجات پانے کے لیے روح پریشان و سرگرداں ہے، جب بنواس، زہد، ریاضت، توبہ، سچائی اور یوگا کے ذریعے روح کو جسم کے پنجرے سے آزادی یعنی رہائی ملتی ہے تو یہ انفرادی روح ایک اجتماعی یا کائناتی روح کا حصہ بن جاتی ہے، جو کہ دراصل روحِ مطلق کا حصہ ہے۔ برہما سے ایک ہونے کے لیے ہر انفرادی روح کو اپنی خودی کی نفی کر کے عرفان حاصل کرنا پڑے گا جو کہ صرف محبت اور وجدان کے ذریعے ہی ممکن ہے۔[۱]

ویدانتی فکر کے مطابق صرف برہما ہی حقیقی ہے اور وہ واحد ہے۔ اس واحد سے ہی ساری کثرت وجود میں آئی ہے۔

نو افلاطونیت

نو افلاطونیت کے مطابق حقیقتِ مطلق واحد ہے۔ یہ ایک سورج کی مانند ہے جس سے روشنی کی شعاعیں پھوٹتی ہیں۔ یہ روشنی عقلِ کل (Nous) کا روپ دھارتی ہے اور پھر وہاں سے روشنی نکلتی ہے جس سے روح جنم لیتی ہے جو کہ ہر انسانی جسم میں داخل ہے۔ مادہ کیا ہے؟ مادہ کچھ بھی نہیں ہے۔ وہ عدم۔ وجود ہے، جہاں نورِ الٰہی نہیں پہنچتا ہے وہاں اندھیرا ہے، بُرائی ہے، ظلمت ہے اور یہ تاریکی مادہ ہے۔ روح جسم میں پہنچ کر سخت پریشان رہتی ہے اور وہ اپنے اصل کی طرف جانے کے لیے بے تاب اور سخت پریشان رہتی ہے۔ خودی کی نفی سے محبت و عرفان کے ساتھ ہی روح انسان کے جسم سے نجات حاصل کر سکتی ہے۔[۲]

---

(۱)۔ تفصیل کے لیے "ہندو فلسفہ" دیکھیے۔

(۲)۔ تفصیل کے لیے "نو افلاطونیت" کا مغربی فلسفے کا حصہ دیکھیں۔

اسلامی تصوف

اسلامی تصوف کا جائزہ لینے کے لیے ہم اسے دو حصوں میں تقسیم کرتے ہیں ایک نظریاتی اور دوسرا عملی حصہ۔

الف۔ اسلامی تصوف کا نظریہ

میں پہلے ہی عرض کر چکا ہوں کہ تصوف مذہب کا اندرونی اور حقیقی روپ ہوتا ہے۔ اسلامی تصوف کی بنیاد بھی مذہبِ اسلام پر ہے اور اس کے ماخذ قرآن مجید، حدیثِ نبویؐ اور سنت رسول ہیں۔ جہاں تک نظریے کا تعلق ہے تو اسلامی تصوف کا نظریہ قریباً وہی ہے جو مذہب کا ہے۔ چند صوفیاء کرام کے علاوہ سب نے اپنے آپ کو مذہبی حدود کے اندر ہی رکھا ہے۔
''تصوف کے ترکیبی اجزاء تین ہیں: کامل توحید، کامل تقویٰ اور کامل محبت''[1] یہ تینوں اجزاء قرآن مجید سے اخذ کیے گئے ہیں۔

i۔ کامل توحید

قرآنِ مجید کا بنیادی اور سب سے اہم نظریہ توحید ہی ہے۔ قرآنِ پاک میں آتا ہے
''بس وہی ہر شے کا اوّل ہے، وہی ہر شے کا آخر ہے، وہی ہر شے کا ظاہر ہے اور ہر شے کا باطن ہے اور وہ ہر شے کی ماہیت کا علم رکھتا ہے۔'' (قرآن مجید 3:57)
مذہب کے ظاہری روپ پر یقین رکھنے والے توحید کا مطلب یہ لیتے ہیں کہ ''لا الٰہ الا اللہ'' یعنی نہیں ہے کوئی عبادت کے لائق سوائے ایک اللہ کے، مگر بالا آیت اور دیگر کئی آیتیں ہیں جن کی تشریح صوفی اس طرح کرتا ہے کہ ''نہیں ہے کوئی ہستی سوائے ایک خدا کے'' جو ہستی ہر چیز کا ظاہر بھی ہے اور باطن بھی تو باقی شے یعنی اس دنیا میں اور کیا رہ جاتا ہے؟ مثلاً ایک درخت ہے تو اس کی ظاہری خصوصیات یہ ہیں: رنگ، موٹائی، لمبائی، گولائی، پتلا موٹا، سختی، ذائقہ وغیرہ وغیرہ اور اس کی باطنی خصوصیات اس درخت کا وہ جوہر ہے جو اسے دوسرے درختوں سے الگ کرتا ہے۔ اگر درخت کی ظاہری و باطنی خصوصیات نکال دی جائیں تو کیا پھر بھی اس درخت کا وجود باقی رہے گا؟ بالکل نہیں۔ اگر خدا اس کائنات کی ہر شے کا ظاہر بھی ہے اور باطن بھی ہے اور ابتدا بھی ہے اور انتہا بھی ہے

(۱)۔ تاریخِ تصوف از پروفیسر یوسف سلیم چشتی۔

تو پھر اس کائنات میں باقی کون سی شے ہے جو کہ غیر خدا ہے؟ دوسرے لفظوں میں وہ کون سا وجود ہے جس کا ظاہر و باطن تو خدا ہے لیکن پھر بھی اس کا الگ وجود ہے؟ صوفی کہتے ہیں کہ اللہ کے سوا دوسرا کوئی وجود ممکن ہی نہیں ہے۔ یہ وحدت الوجود کا نظریہ ہے لیکن یہ نظریہ بہت بعد میں اسلامی تصوف کا حصہ بنا۔ اوائلی تصوف میں وجود کا ثنوی نظریہ تھا یعنی خالق و مخلوق دو الگ الگ وجود ہیں جن میں سے پہلا حقیقی اور دوسرا غیر حقیقی ہے۔ سورۃ نور میں اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں ''خدا انسان سے مثالوں کے ذریعے گفتگو کرتا ہے۔'' صوفی کہتے ہیں اس آیت سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ ظاہری و لفظی معانی کے بجائے اس کے باطنی معانی کی اہمیت ہے، کیوں کہ ظاہری طور پر تو مثالیں بھی ہیں، جو کہ صرف سمجھانے کے لیے ہیں۔

ii۔ کامل تقویٰ

تقویٰ کے موضوع پر بھی بہت زیادہ آیتیں ہیں۔ مثلاً ''بے شک اللہ ان لوگوں کے ساتھ ہے جو متقی ہیں اور محسن (بھی) ہیں۔'' (قرآن مجید 16:128)

کامل صوفی وہ ہے جو صاحبِ تقویٰ ہے۔ کئی تصوف کے دعویدار متقی نہیں ہیں۔ لہٰذا ان کو صوفی نہیں کہا جا سکتا، جب مذہب کی طرح تصوف بھی ہوس پرستوں اور مفاد پرستوں کے ہتھے چڑھ گیا تو ان سے تقویٰ و پرہیزگاری چھوٹ گئی اور وہ دنیا کے لالچ میں پھنس گئے۔ قرآن مجید میں صاف صاف بتایا گیا ہے کہ ہدایت صرف متقی کو ملے گی۔

iii۔ کامل محبت

سچا صوفی عشقِ حقیقی سے مالا مال ہوتا ہے۔ بلکہ یہ عشقِ حقیقی یا آفاقی محبت ہی ہے جو کہ صوفی کو ظاہری مذہب پرست سے ممتاز کرتی ہے۔ قرآن شریف میں آتا ہے ''اور جو مومن ہیں۔ وہ سب سے زیادہ محبت اللہ تعالیٰ سے ہی کرتے ہیں۔'' (البقرہ:125)

رومی سے لے کر شاہ عبداللطیف بھٹائی تک تمام صوفیاء عشقِ حقیقی کو بہت زیادہ اہمیت دیتے ہیں اور اس عشق یا محبتِ الٰہی کو دنیا کی ہر شے پر ترجیح دیتے ہیں۔ یہ بھی قرآن پاک سے ثابت ہے ''کہو، اگر تمہیں اپنے آباؤ اجداد اور بیٹوں اور بھائیوں اور بیویوں اور عزیزوں اور وہ مال ملکیت جو تم نے کمایا ہے اور وہ کاروبار جس کے مندا ہو جانے کا تمہیں ڈر ہے اور وہ گھر جو تمہیں بہت پیارے

ہیں، ان میں سے کوئی بھی شے تمہیں اللہ اور اس کے رسول ﷺ سے اور اس کی راہ میں جہاد سے زیادہ پیاری یا زیادہ محبوب ہے تو پھر انتظار کرو جب تک خدا کا فیصلہ جاری ہو اور یاد رکھو کہ خدا فاسقوں کو ہدایت نہیں دیتا۔'' (9:24)

ب۔ اسلامی تصوف۔ عملی شکل میں (In Practice)

کامل توحید، کامل تقویٰ اور کامل محبت کی منزل حاصل کرنے کے لیے ایک طویل اور انتہائی دُشوار و پُرخطر راہ پر سفر کرنا پڑتا ہے۔

حقیقتِ کبریٰ سے اس وقت تک محبت نہیں ہو سکتی جب تک کہ اسے پہچانا نہ جائے۔ اس پہچاننے اور محبت کرنے کی منزل کو ''عرفان'' کہتے ہیں۔ اس دُشوار راہ پر سفر کرنے والے مسافر کو ''سالک'' کا نام دیا گیا۔ سالک کو سات منزلیں☆ طے کرنا ہیں، جن کے بعد خدا نے اپنا کرم کرنا ہے اور سالک کو الاہیاتی عرفان سے نوازنا ہے، جس کو ''حال'' کہا جاتا ہے۔ یہاں پہنچنے کے بعد سالک ''عارف'' بن جاتا ہے۔ ان ساتوں منزلوں کو ''مقام'' کہا جاتا ہے، جن کا مختصر احوال ذیل میں دیا جاتا ہے۔

i۔ توبہ (Repentence)

''توبہ کا مطلب ہے روح کو غفلت کی نیند سے جگانا تاکہ گنہگار اپنی بدی کے طریقوں سے واقف ہو اور ماضی کی خطاؤں پر پشیمان ہو۔''(1)

اس کٹھن سفر کی شروعات توبہ سے ہوتی ہے۔ توبہ کا مطلب محض توبہ استغفار کرنا نہیں ہے بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ سالک کو اپنے گناہ یاد کر کے ان کی معافی مانگنا ہے۔ اللہ تعالیٰ سے بھی اور ان لوگوں سے بھی جن سے اس نے زیادتیاں کی ہیں یا جن کو اس نے کبھی کوئی تکلیف دی ہے۔ اس کے بعد سالک کو پکا ارادہ کرنا ہے کہ وہ آئندہ کوئی بھی گناہ نہیں کرے گا۔

جیسا کہ یہ راستہ کٹھن ہے اور سالک کو علم بھی نہیں ہے۔ لہٰذا اسے کامل مرشد (یا شیخ) کے ہاتھ پر بیعت کرنا ہے؛ جو اس کی راہنمائی کرے گا۔ توبہ کا سماجی پہلو یہ ہے کہ توبہ کرنے والا انسان معاشرے کا ایک صاف ستھرا اور اہم فرد بن جاتا ہے۔

☆ منزلیں کم و زیادہ بھی ہو سکتی ہیں لیکن سات منزلوں پر صوفیا کرام کی اکثریت متفق ہے۔

1-The Mystics of Islam By:R.A.Nicholson Page:30.

ii۔ فقیری

توبہ کے بعد سالک کو فقیری اختیار کرنا ہے۔ اپنی ساری دھن دولت سے دست بردار ہو کر اسے غریبوں میں تقسیم کرنا ہے۔ فقیری کا اصل مفہوم ابھی ذرا آگے ہے یعنی ہر قسم کے لالچ سے ہمیشہ کے لیے توبہ کرنا ہے اور دولت کی خواہش کو ترک کرنا ہے۔

iii۔ زہد و تقویٰ

فقیری کے بعد سالک کو مجاہدے کرنا ہیں۔ دنیا کے سبھی جائز و ناجائز مزے اور لطافتوں کو خیر آباد کہنا ہوگا۔ لذتوں کو خدا حافظ کہہ کر بھوک و پیاس کو اپنانا ہے۔

iv۔ نفس کشی

ہر انسان میں برائی کا عنصر موجود ہے۔ لالچ، حسد، جلن، ہوس اور خواہش وغیرہ کا تعلق نفس سے ہے۔ سالک کو نفس پر کاری ضرب لگا کر ان منفی رجحانوں سے جان چھڑانا ہے۔ حدیث ہے "تمہارا بدترین دشمن تمہارا نفس ہے۔" "نفس کشی کا اصول یہ ہے کہ نفس کو ان چیزوں سے دور رکھا جائے جن کا وہ عادی بن چکا ہے۔ اس کا احساسِ فخر و تکبر ختم کرنا ہے۔ اس کے لیے روزے رکھنا، خاموشی اختیار کرنا، ویرانوں میں جا کر بیٹھنا وغیرہ چند مشہور طریقے ہیں۔"[1]

نفس کو جہالت، تکبر، حسد اور خود غرضی جیسے امراض سے پاک کر کے اپنی مرضی کو خدا کی رضا کے سپرد کرنا ہے۔ بالالفاظِ دیگر نفس کو طبعی موت سے پہلے ہی فنا کرنا ہے۔

v۔ توکل

نفس کشی کی منزل کے بعد سالک کو اطمینانِ قلب حاصل ہو جاتا ہے، جس کے بعد اسے خدا پر بھروسہ اور توکل کی منزل عبور کرنی ہے۔ اس کا مطلب ہے کہ سالک کو اپنی ضرورتوں کے لیے فکر کرنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے اور نہ ہی اسے بھوک، بیماری اور تکلیف کے بارے میں کوئی تشویش کرتا ہے۔ متوکل صوفی کے ہاں ماضی کی کوئی اہمیت ہے نہ ہی مستقبل کی۔ اس کے نزدیک سب کچھ حال ہے۔ مستقبل کا فیصلہ وہ خدا پر چھوڑتا ہے اور مستقبل کی فکر میں وہ حال کے ذکر یار سے غافل نہیں رہ سکتا۔ کیوں کہ "جو دم غافل، سو دم کافر" جب صرف خدا کے بارے میں ہی غور و فکر کرنا

1-The Mystics of Islam by:R.A.Nicholson Page:40.

ہے تو کچھ مانگنا اور دینا خدا کی توہین ہوگی۔

vi۔ ذکر و فکر

قرآنِ پاک میں آتا ہے ''بے شک آسمانوں اور زمین کی پیدائش میں اور رات اور دن کے اختلاف میں عقل والوں کے لیے نشانیاں ہیں، جو اللہ کو یاد کرتے ہیں، اُٹھتے اور بیٹھتے اور سوتے ہوئے اور غور کرتے ہیں، زمین اور آسمانوں کی پیدائش پر (اور کہتے ہیں) اے رب! تو نے یہ دنیا بے فائدہ نہیں بنائی ہے۔ (3:190-191)

خدا کو یاد کرنے کا کوئی وقت یا جگہ مقرر نہیں ہے۔ ہر وقت زبان پر دل میں اور رگ رگ میں ذکر جاری ہو۔ اس منزل پر سالک ہر قسم کی فکر، تشویش اور خواہشوں سے پاک ہو چکا ہوتا ہے۔ اس لیے یادِ الٰہی کے سوا وہ اور کچھ یاد کر بھی نہیں سکتا۔ اپنی خودی اور انا کو تو وہ پہلے ہی دفن کر چکا ہے۔

vii۔ مراقبہ

حدیث ہے ''خدا کی عبادت اس طرح کرو گویا تم اسے دیکھ رہے ہو۔'' یہ وہ منزل ہے جہاں سالک اپنے حواس معطل کر ڈالتا ہے، یعنی آنکھیں بند، کان بند اور زبان بند وغیرہ وہ خارجی دنیا سے رابطہ توڑ دیتا ہے اور نہ صرف اس دنیا سے بلکہ اپنے وجود سے بھی غافل ہو جاتا ہے اور اپنے آپ کو مکمل طور پر خدا کی یاد میں غرق کر لیتا ہے۔ اپنے وجود کی مکمل نفی اسے ''فنافی اللہ'' کے درجے تک پہنچا دیتی ہے۔

فنافی اللہ کے مقام پر پہنچ کر انسان کی ساری خواہش، سوچیں اور شعور ختم ہو جاتا ہے۔ اس کے بعد وہ فنا الفنا کے درجے پر پہنچتا ہے یعنی اس کے فنا ہونے کا احساس بھی فنا ہو جاتا ہے۔

فنافی اللہ کے بعد وہ بقاباللہ کی منزل پر پہنچتا ہے جہاں وہ خدا کی ذات میں ہمیشہ کے لیے بقا پا لیتا ہے۔

عرفان

یہ منزلیں طے کرنے کے بعد سالک کی کوشش ختم ہو جاتی ہے۔ اس کے بعد یہ اللہ کی رضا پر ہے کہ وہ سالک کو عرفان کا تحفہ دے یا کہ نہیں۔ قرآنِ پاک میں آتا ہے ''جو بھی ہمارے لیے کوشش کرتا ہے، ہم اس کی راہنمائی کرتے ہیں ہماری طرف۔'' (29:69)

صوفی کہتا ہے ''قلب ردل خدا کو پہچانتا ہے، روح اس سے محبت کرتی ہے اور جوہر روح (سِر) اس کے متعلق سوچتا ہے۔''(۱)

فنافی اللہ کے درجے پر صوفی اپنے حواس کے دریچے بند کر کے دل کا دروازہ کھولتا ہے اور خدا کو پہچان لیتا ہے۔ خدا کو پہچاننے کا یہ عمل خالصتاً خدا کی مہربانی اور اس کے کرم سے ہوتا ہے۔ یعنی یہ کوئی ایسا مقام یا منزل نہیں ہے، جسے کوشش سے حاصل کیا جا سکے۔ معرفت کی روشنی، صوفی کے دل میں تجلیاں بھر دیتی ہے۔ وہ حق کا نظارہ کرتا ہے اور اسے پتا چلتا ہے کہ کثرت کا تو وجود ہی نہیں ہے۔ وحدت ہی وحدت ہے، یہاں عاشق، عشق اور معشوق سب ایک ہی شے ہیں۔ وہ جو کچھ نظارہ کرتا ہے۔ اس کے بارے میں اس کی زبان بتانے سے قاصر ہے لیکن پھر بھی انتہائی خوشی و سرمستی کے عالم میں اس کی زبان سے کچھ جملے نکل جاتے ہیں، جو عام اور ناسمجھ مولویوں کے لیے ''شطحیات'' ہیں۔ اس منزل پر پہنچ کر منصور نے خود کو انا الحق کہا۔ بایزید بسطامی نے کہا ''میری کیسی شان ہے۔ میری کتنی عظمت ہے۔'' سچل سرمست نے کہا ''کیوں اللہ اللہ کرتے ہو، خود کو ہی اللہ سمجھو۔''

''یہاں سالک، سالک نہیں رہتا بلکہ عارف بن جاتا ہے۔ یعنی اس کا دل جیسے ہی خدا کو پہچان لیتا ہے یا اسے عرفان حاصل ہو جاتا ہے تو وہ خدا کے عشق میں غرق ہو جاتا ہے۔ خدا بھی محبت کا جواب محبت سے دیتا ہے۔ حدیث ہے: ''۔۔۔اور جب میں اس سے محبت کرتا ہوں تو میں اس کے کان بن جاتا ہوں اور وہ میرے ذریعے سنتا ہے، مَیں اس کی آنکھ بن جاتا ہوں اور وہ میرے ذریعے دیکھتا ہے، مَیں اس کی زبان بن جاتا ہوں اور وہ میرے ذریعے بولتا ہے، مَیں اس کے ہاتھ بن جاتا ہوں اور وہ میرے ذریعے (کسی شے کو) پکڑتا ہے۔'' یا ''زمین اور آسمان مجھے خود میں سما نہیں سکتے البتہ میرے بندے کا دل مجھے خود میں سمو سکتا ہے۔''(۲)

یہاں عارف جو نظارہ دیکھتا ہے وہ اسے گونگا اور بہرا بنا دیتا ہے۔ وہ توحید کا اصل نظارہ دیکھتا ہے۔ یعنی ہر طرف وہ ہی وہ ہے اور کچھ ہے ہی نہیں۔ یہاں پوشیدہ خزانہ آشکار ہوتا ہے اور پتا چلتا ہے کہ نظر، نظارہ اور ناظر صرف ایک ہے۔ واحد ہے، دوسرا کچھ بھی نہیں ہے، دوسرا کوئی بھی نہیں ہے۔

1-The Mystics of Islam by:R.A.Nicholson Page:68.

2-Sufism by:Arbery Page:27-28.

طریقت

حقیقتِ کبریٰ کو پہچاننے یا معرفت حاصل کرنے کے لیے جو راستہ اختیار کیا جاتا ہے اس کو طریقت کہا جاتا ہے۔ اُوپر بتائی گئی سات منزلیں مختلف صوفیاء کے ہاں سے اخذ کی گئی ہیں۔ ہر بڑے مرشد یا شیخ یا رہبر نے اس طریقے میں اپنے ماحول اور سالک کے حوصلے کو نگاہ میں رکھتے ہوئے کچھ تبدیلیاں بھی کی ہیں۔

اسلامی تصوف ابتدا میں صرف زہد کی منزل پر تھا، لہٰذا کوئی خاص طریقہ وجود میں نہ آیا۔ عاصم علی انطاکی، عثمان بن شارق، ابراہیم بن ادم، شفیق بلخی، حاتم الاسام، عبداللہ بن المبارک مروی، بشر بن حارث حافی اور فضل بن عباس، زاہد و پرہیز گار تھے اور ان کا زمانہ آٹھویں عیسوی صدی کا تھا۔ ان زاہدوں نے تصوف کا سنگِ بنیاد رکھا جس پر الحارث بن اسد محاسبی نے عمارت تعمیر کی، جس کے بعد رابعہ بصری ذوالنون، بایزید بسطامی، جنید بغدادی منصور الحلاج، الحاکم ترمذی، یحییٰ بن معاذ، ابوالحسن نوری، ابوسعید ابن العربی اور ابوبکر الکلاباذی وغیرہ اوائلی بڑے صوفی تھے، جن کا زمانہ گیارہویں عیسوی صدی کا تھا۔ ان صوفیوں کی اکثریت علماء کی تھی، جنھوں نے کئی کتب تحریر کیں، جنید بغدادی جید عالم تھا۔

بارہویں عیسوی صدی میں صاحبِ طریقت مرشدوں نے اپنے اپنے طریقے وضع کر کے باقاعدہ سلسلے شروع کیے۔ عبدالقادر جیلانی (1078-1166) نے قادری سلسلے اور شہاب الدین عمر بن عبداللہ نے سہروردی طریقے کی بنیاد رکھی۔ بہاؤالدین زکریا ملتانی اور سندھ کے بیش تر صوفی اس سلسلے سے تعلق رکھتے تھے۔ مغربی اسلامی ممالک یعنی افریقی ممالک، مصر اور اسپین وغیرہ میں نورالدین احمد بن عبداللہ (1196-1258) کا طریقہ رائج ہوا اور مرشد جلال الدین رومی کا درویشانہ طریقہ ترکی، ایران، افغانستان، وسطی ایشیا وغیرہ میں زیادہ رائج ہوا۔ اس کے علاوہ برصغیر میں چشتی اور نقش بندی سلسلہ بھی کافی مشہور ہو گیا۔

ان سب طریقوں میں کوئی بھی اصولی فرق نہیں ہے کہیں ذکر قلب میں ہوتا ہے تو کہیں زبان سے، کہیں موسیقی کی اہمیت ہے تو کہیں دھمال کی۔ رومی کے پیروکار درویش کہلاتے ہیں وہ بانسری بجاتے ہیں اور دھمال ڈالتے ہیں۔

تصوف نے مسلمانوں کو محبت، رواداری، ایثار، قربانی، ہمدردی اور بے شمار اعلیٰ انسانی اقدار کی پاسداری کرنا سکھایا لیکن پیروکاروں نے تصوف کی بنیادی فکر کو فراموش کر کے درگاہوں کو پیسے کمانے کا ذریعہ بنا لیا اور سجادہ نشینوں نے بزرگوں کی ریاضت کو ووٹ حاصل کرنے کا ذریعہ بنا رکھا ہے۔